لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
WOMEN
اسلام میں حیثیتِ نسواں
ترتیب وتالیف:
موسیٰ خان
رابعہ اختر
www.KitaboSunnat.com
M. YOUNIS MAJEED.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں حیثیتِ نسواں

اِسلام میں حیثیتِ نسواں

ترتیب وتالیف: موسیٰ خان
رابعہ اختر

25 سی لوئر مال لاہور
فون: 0300-9476417-7325418

"اے رب! میرے علم میں اضافہ فرما"

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں، پیاری کتابیں

ناشر: وصی شاہ

2004ء

اہتمام	:	زاہد شیخ
مارکیٹنگ	:	محمد قاسم
سرورق	:	عاطف اقبال
پرنٹنگ	:	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
قیمت	:	180 روپے

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اسلام میں حیثیتِ نسواں'' بہت سی کتابوں کے استفادہ سے لکھی گئی ہے اور ان سب کتابوں میں سب سے مستند کتاب' کتاب مقدس کلام الٰہی ہے۔

تمام محترم صاحبان نے اپنی اپنی آراء کو بہت خوبصورت دلائل کی روشنی میں سمجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

عورت کے سابقہ پست مقام کو بیان کر کے اسلام کی عطا کردہ بلندی کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب کسی شے کو فطرت سے دور کر دیا جائے تو مسئلے مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں۔ پھر یہ مسائل وقت کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں کتاب کو پڑھ کر ہمیں اپنا جائزہ خود لینے کا موقع ملتا ہے کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟

بہت سے اذہان کے لیے یہ کتاب بند دروازے پہ دستک یا گھرے اندھیرے میں دیئے کی مانند ہوگی۔

دیئے کی روشنی میں ہی سہی گھپ غفلت کے اندھیروں میں سیدھی راہ تلاش کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ضرور ہے۔ قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے۔

''جو لوگ ہماری آیت کو الٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔'' (سورۃ السجدہ)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے اور سمجھانے کی توفیق دے اور راہ مستقیم عطا فرمائے۔

(آمین)

رابعہ اختر

پوسٹ بکس 130 لاہور۔

gurya38@yahoo.com

اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام

امین احسن اصلاحی

تمہید

عورتوں کے اجتماعی حقوق و فرائض کا مسئلہ اسلام میں اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اس کے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کسی خاص تحقیق و کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے معاشرتی و اجتماعی مسائل میں سے جو مسائل قرآن و حدیث میں سب سے زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ان میں سے شاید ایک واضح ترین مسئلہ بھی ہے۔ عورت کا درجہ خاندان میں' عورت کا مرتبہ اجتماعی زندگی میں' عورت کا موقف ریاست میں' یہ ساری باتیں تمام اصولی ہدایات کے ساتھ خود قرآن مجید میں بیان ہوگئی ہیں اور پھر ان کی ضروری عملی و قولی تشریحات صحیح احادیث میں آ گئی ہیں۔ نہایت آسانی کے ساتھ صرف تھوڑی سی محنت کر کے' اُن کو جمع اور ناظرین کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں ہمارے ارباب کار کے دورُخ پن نے جس طرح ہر مسئلہ کو اُلجھا رکھا ہے اسی طرح اس مسئلہ میں بھی انہوں نے ایسی اُلجھنیں پیدا کردی ہیں کہ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہمیں بہت سی ناہمواریوں کو ہموار کرنا پڑے گا۔

ایک معقول آدمی کے لیے معقول رویہ تو یہ ہے کہ کفر اور اسلام میں سے جس پر اُس کا دل ٹھک جائے اس کو مسلک زندگی کی حیثیت سے اختیار کر لے اور مشکلات و موانع سے بے پروا ہو کر اس پر چل پڑے۔ حق و باطل سے قطع نظر یہ یکسوئی بجائے خود ایک بڑی

اہم طاقت ہے اور جس راہ میں بھی کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ ایک یکسوئی کی بدولت ہی حاصل ہوتی ہے۔ دنیا میں ہمیشہ کامیابی حاصل کرنے والوں نے اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے اور اپنے اپنے مطمحِ نظر کے لحاظ سے اسی کے بل پر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن ہمارے مُلک کے ارباب کار نے یکسوئی کی یہ اولوالعزمانہ روش اختیار کرنے کے بجائے دوُرخ پن کی بزدلانہ روش اختیار کی ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں ہم "منافقت" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ نفاق انسان کی ایک مہلک بیماری کی حیثیت سے تو ضرور متعارف ہے اور ہر دور اور سوسائٹی میں ایسے افراد و اشخاص پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں' لیکن ہمیں تاریخ میں کسی ایسی قوم کا سراغ نہیں ملتا ہے جس کے لیڈروں نے متفق ہو کر نفاق کو قومی پالیسی کی حیثیت سے اختیار کیا ہو اور اس کو اپنی مشکلات کے حل کی کلید جانا ہو۔ پوری تاریخ انسانی میں اس قسم کی کوئی قوم اگر ملتی ہے تو صرف ایک قوم ملتی ہے اور وہ بدقسمتی سے ہماری قوم ہے۔

ہمارے لیڈر حضرات متفق اللفظ ہو کر زبان سے تو اسلام اسلام پکارتے ہیں' اسلام اور اسلامی نظام ہی کو پاکستان کے قیام کا واحد مقصد قرار دیتے ہیں' اسلامی اصولوں ہی کے اندر دُنیا کے تمام موجودہ مصائب کا علاج بتاتے ہیں' حد یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں قرارداد بھی پاس کر دیتے ہیں کہ اس ملک کا دستور کتاب وسنت کی بنیادوں پر بنے گا' لیکن دوسری طرف عمل کی دنیا میں یہ حال ہے کہ اسلام کے مٹے ہوئے آثار و نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنا تو الگ رہا' اسلامی تہذیب و روایات کے جو آثار انگریزی دور حکومت کی دستبرد سے تھوڑے بہت بچ رہے تھے ان کو بھی مٹانے اور ان کی جگہ مغربیت کو غالب کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس دعویٰ کے ساتھ ہو رہی ہے کہ یہ اسلام قائم ہو رہا ہے۔ اس بات کی شہادت یوں تو ان حضرات کے ہر قول و فعل سے مل رہی ہے' لیکن عورتوں کی اصلاح و ترقی کے معاملہ میں انہوں نے جو روش اختیار کی ہے اس کو دیکھنے کے بعد تو کوئی اندھا ہی ہوگا جو ان کے اصلی عزائم کی طرف سے کسی شبہ میں رہے گا۔

ان حضرات کی یہ روش بھی کچھ کم دردانگیز نہیں تھی کہ انہوں نے مسلمان ہوتے

ہوئے اسلام کے بجائے غیر اسلام کو مسلمانوں پر مسلّط کرنے کی ٹھانی ہے' لیکن اس سے زیادہ دردانگیز ہمارے نزدیک ان کی یہ شتر گربگی ہے کہ وہ بیک وقت کفر اور اسلام دونوں کی کشتیوں پر سوار رہنا چاہتے ہیں۔ عملاً تو یہ ساری جدوجہد مغربی جاہلیت کو مسلّط کرنے کے لیے کررہے ہیں' لیکن بطور ڈپلومیسی کے اسلام کو بھی ساتھ ساتھ لگائے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان ان کی نام نہاد اصلاحات کی طرف سے بدگمان نہ ہوں اور جو زہر یہ پلا رہے ہیں اس کو شہد و شربت سمجھ کر بغیر کسی مزاحمت کے پی جائیں۔ اس منافقت کو ان حضرات نے کمالِ سیاست دانی سمجھ رکھا ہے اور خیال کررہے ہیں کہ اپنی قوم کو "فرنگیانے" کی جو لاجواب سکیم انہوں نے ڈھونڈ نکالی ہے وہ کمال اتاترک اور امان اللہ خاں کو بھی نہ سوجھ سکی' حالانکہ قومی زندگی میں نفاق کی پالیسی ہمیشہ مہلک اور تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ اگر آپ اس طرح قوم کو کفر کی طرف دھکیلتے اور اسلام کی طرف بلاتے رہے تو اس کا نتیجہ صرف یہ نکلے گا کہ یہ قوم ہمیشہ کعبہ و کلیسا کے درمیان ڈانواڈول رہے گی۔ آپ کے دھکیلنے کی وجہ سے دو قدم اگر آگے بڑھائے گی تو آپ کے بلانے کی وجہ سے دو قدم پیچھے بھی ہٹائے گی اور اسی لیفٹ رائٹ کے دوران میں خدانخواستہ اگر کوئی قوی آزمائش پیش آ گئی تو ایسی ڈانواڈول قوم کا اللہ ہی حافظ ہے۔

جس چیز کو یہ حضرات انتشار (Disruption) کہتے ہیں اور جس کے سونگھ لینے کے لیے ان کی قوتِ شامہ اتنی تیز ہے کہ ان گوشوں میں بھی اس کی بُو پا لیتی ہے جن گوشوں میں دُور دُور تک اس کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ 'انتشار' کے مقابل میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا جو انتشار ان کی یہ دورُخی اور شتر گربہ پالیسی پوری قوم کے فکر و عمل میں پھیلا رہی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ایک طرف تو آپ اپنی مذہبی ساکھ قائم رکھنے کے لیے قوم کو اسلام اور قرآن یاد دلاتے رہتے ہیں' قوم کے اندر اپنے دین اور اپنی مذہبی روایات سے جو محبت ہے' اپنی اغراض کی خاطر اس کو جگاتے رہتے ہیں' قوم میں اپنے بزرگ اسلاف کے نقشِ قدم کی پیروی کا جو شوق دبا ہوا ہے' اپنی محبتِ اسلام کی دھونس جمانے کے لیے وقتاً فوقتاً اس رگِ حمیت کو بھی چھیڑتے رہتے ہیں اور حصولِ اقتدار کی مسابقت میں آپ میں سے ہر ایک اس

ٖلام بازی میں ایک دوسرے سے چار قدم آگے ہی رہنا چاہتا ہے اور دوسری طرف آپ ن یہ بھی کوشش ہے کہ قوم کی تمام بیٹیاں اور بہنیں اپنی دیرینہ تہذیب' اپنی پرانی روایات اور اپنی مانوس و معروف معاشرت کو خیر باد کہہ کے مغربی متبرجات کے رنگ میں رنگ جائیں اور بیگم آذری اور ریٹا ہیورتھ کو اپنے لیے نمونہ اور مثال بنائیں۔ کیا کوئی دعوت اس دو طرفہ دعوت سے بھی زیادہ اس قوم میں انتشار پیدا کر سکتی ہے؟ یہ قوم جاہل ضرور ہے' لیکن کیا اتنی جاہل ہے کہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ حضرت فاطمہ زہراؓ اور ان کے پیش کردہ نمونوں میں کیا فرق ہے؟ یہ قوم اپنی روایات سے نا آشنا ضرور ہو گئی ہے' لیکن کیا فی الواقع اتنی نا آشنا ہو گئی ہے کہ مدینۃ الرسولؐ اور ہالی وڈ کی تہذیب میں امتیاز نہ کر سکے؟ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہماری قوم کا مزاج بگڑ چکا ہے' لیکن کیا سچ مچ اتنا بگڑ چکا ہے کہ اب وہ اسلامی تہذیب اور صریح بترج جاہلیت میں بھی فرق نہیں کر سکتی؟ پھر اس مذاق سے کیا فائدہ کہ آپ قوم کو لے تو جانا چاہتے ہیں کفر کی طرف' لیکن بات بات پر اس کو اسلام بھی یاد دلاتے جا رہے ہیں؟ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ یہ قوم پورے شرح صدر کے ساتھ نہ تو کفر کی طرف جائے گی اور نہ اسلام کی طرف' بلکہ اپنی جگہ ہی پر ٹھٹھر کر رہ جائے گی اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر کسی بیرونی آفت کا شکار ہو جائے گی۔

ہمارے نزدیک صحت مند قومی زندگی کے لیے ناگزیر ہے کہ قوم کے اربابِ کار قوم کو جس راستہ پر لے جانا چاہتے ہوں پوری یکسوئی اور پورے عزم کے ساتھ اسی راستہ کی طرف بلائیں اور اسی پر اس کو چلائیں۔ ایک راستہ پر قوم کو چلانا اور دوسرے راستہ کے مناظر کی دلکشیوں کی داستان سرائی کرنا نہایت ہی احمقانہ طریقہ ہے' ں سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

یہ جذبہ ہے جس نے ہمیں مجبور کیا کہ عورتوں کی اصلاح اور آزادی کی جو سکیم یہ حضرات اسلام کے نام سے چلا رہے ہیں' اس کا ذرا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں۔ ان کے اصل عزائم کو خود ان کی تحریروں' تقریروں اور عملی پروگراموں سے معلوم کریں' پھر یہ جس اسلام کا بات بات میں اپنی ''اصلاحات'' کی تائید میں حوالہ دیتے ہیں اس کی روشنی میں تنقید

کر کے دیکھیں کہ اصلاح کا جو نہج انہوں نے اختیار کیا ہے وہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی' نیز اپنے پیشِ نظر مقاصد کی حمایت میں جو عقلی دلائل یہ حضرات دیتے ہیں اُن کے اندر کوئی وزن ہے یا وہ یونہی فریب مغالطے ہی ہیں؟ اس کے بعد ہم عورتوں کے اجتماعی حقوق وفرائض کا وہ نقشہ پیش کریں گے جو قرآن وحدیث میں بیان ہوا ہے تاکہ جو لوگ اپنے دعوائے اسلام میں سچے ہیں اور محض پالیسی کے طور پر اسلام بازی نہیں کر رہے ہیں وہ اس کو اپنی اصلاحی جدوجہد میں پیشِ نظر رکھ سکیں اور جو حضرات کلمہ حق کو باطل کی اقامت کے لیے استعمال کر رہے ہیں ان کے طلسم فریب کی اصل حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔

اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں کا تاریخی جائزہ

مولانا سید عبدالرحمن بخاری

موضوع زیر نظر کے اصل نقطۂ ارتکاز پر بحث سے بیشتر معاشرہ انسانی کی تشکیل و تعمیر کے بنیادی اجزاء وعناصر اور اسلامی معاشرہ کے دیگر سوسائٹیوں سے جوہری امتیازات کی مختصر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ موضوع زیر نظر کی ''عمرانی بنیادیں'' متعین کر کے ان کے حوالے سے آگے بڑھایا جاسکے۔

انسانی معاشرہ کے تشکیلی عناصر:

معاشرہ ایک اعلیٰ ترین طبعی اور قدرتی انسانی ادارہ ہے جس کی ضرورت مدنی الطبع انسان کے لیے فطری اور بدیہی ہے اسی لیے ارسطو نے کہا ہے کہ جو شخص معاشرہ سے الگ تھلگ رہتا ہے وہ یا تو دیوتا ہے یا حیوان۔ یوں فرد اور معاشرہ لازم وملزوم ہیں نہ افراد کے بغیر معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور نہ ہی معاشرہ کے بغیر فرد کی بقا ممکن ہے۔

فرد میکیروز ملت احترام ملت ازافرادمی یا بد نظام

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ایک مغربی مفکر گرے نے معاشرہ کی تعریف یہ کی ہے۔

یعنی معاشرہ ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو کسی مشترکہ مفاد کی خاطر متحد ہو گئے ہوں۔ پس افراد کی محض اجتماعی حالت کو معاشرہ کا نام نہیں دیا جاسکتا بلکہ معاشرہ ایسے افراد کا مجموعہ ہے جن کا مقصود ایک ہو اور ان کے کردار میں یکسانی پائی جائے اور وہ یکسانی انہیں یہ شعور فراہم کرلے کہ عمرانی اعتبار سے ہم ایک ہیں یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ حیات اجتماعی

کی تشکیل و تعمیر کچھ مادی اور معنوی لوازم اور عناصر کی متقضی ہے جن کے بغیر کوئی بھی انسانی معاشرہ متشکل نہیں ہوسکتا۔ یہ اجزائے معاشرہ حسب ذیل ہیں۔

انسانی معاشرہ کے مادی عناصر

ا۔ افراد و طبقات:

معاشرہ ایک انسانی ادارہ ہے۔ جو افراد انسانی ہی سے تشکیل پاتا ہے۔ افراد کے بغیر کسی معاشرہ کا تصور ہی ممکن نہیں کہ:

ملت از افرادمی یابد نظام

تنظیمی اعتبار سے معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام لازمی ہے کہ یہی حیات اجتماعی کی احساس تشکیل اور غایت اولین ہے اور اس کے لیے ہر شعبہ حیات سے وابستہ افراد اور طبقات کا وجود ناگزیر ہے ابن سینا نے نظام معاشرہ کے لیے تین طبقوں کا وجود لازمی گردانا ہے۔ جن میں باقی تمام طبقات بھی سمٹ آتے ہیں ایک المدبرون یعنی تنظیم حیات منزلی اور تدبیر کار ریاست سے متعلق افراد۔ دوسرے الصناع'' یعنی معاشرے کی تمدنی ضروریات کے لیے صنعت' تجارت اور زراعت میں مصروف رہنے والے اور تیسرے یعنی نظام زندگی کا ہر اعتبار سے دفاع کرنے والے۔ اسلامی معاشرہ میں ان تمام طبقات کا وجود باعتبار افراد کے فرض کفایہ اور باعتبار تنظیم کے'' اجتماعی فرض عین ہے۔

۲۔ خاندان۔ معاشرتی اکائی:

حیاتیاتی لحاظ سے انسانی معاشرہ مردوں اور عورتوں کی تین نسلوں (معمر' بالغ اور نوخیز) کا سائیکل ہوتا ہے۔ یہ تینوں نسلیں معاشرہ کی بنیادی اکائی یعنی خاندان میں ایک جگہ موجود ہوتی ہیں اس لحاظ سے خاندان معاشرتی ارتباط اور تعلقات کا نہایت اہم اور ممتاز ادارہ ہونے کے ناطے نہ صرف انسانی معاشرہ کا ایک لازمی عنصر ہے بلکہ تہذیب و تمدن کے

لیے بھی بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور چونکہ معاشرہ اپنی تکوین و تنظیم میں مختلف خاندانی اکائیوں ہی کا مجموعہ ہے اس لیے معاشرہ کی قوت و ضعف اور ارتقاء و انحطاط کا انحصار انہی بنیادی اکائیوں کی مضبوطی اور کمزوری پر ہے۔

۳۔ اداراتی تنظیم:

انسانی معاشرے کو مختلف اداروں کی صورت میں باقاعدہ طور پر منظم کرنا معاشرتی تشکیل کے لیے ناگزیر ہے تاکہ انسان کی معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ کا اپنا عمل اور تمام شعبہ جات کی باہمی سرگرمیاں باہم مربوط اور منضبط ہوسکیں۔ کیونکہ معاشرہ درحقیقت مختلف طبعی اختیاری اداروں اور افراد کی سرگرمیوں ہی سے متشکل ہوتا ہے۔ پس معاشرہ کا ایک لازمی بنیادی عنصر اداراتی تنظیم ہے جس کے بغیر معاشرتی مقاصد اور اعمال کی تکمیل ممکن نہیں۔

معاشرتی تشکیل کے معنوی لوازم

ا۔ عمرانی وحدت کی اساس:

انسانی معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کا اولین معنوی عنصر جس کے بغیر حیات اجتماعی کا تصور بھی ممکن نہیں' افراد کے ایک ہونے کی اساس و بنیاد کا تعین ہے جس کے حوالے سے تمام افراد معاشرہ خود کو ایک وحدت میں منسلک اور قوت واحدہ متصور کرنے لگیں عمرانی وحدت کی یہ اساس مختلف معاشروں میں مختلف ہوا کرتی ہے۔ جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

۲۔ وحدت نصب العین:

کسی معاشرہ کا معرض وجود میں آنا باقی رہنا اور فروغ و استحکام پانا وحدت نصب العین کے بغیر ناممکن ہوتا ہے کیونکہ حقیقی زندگی دراصل نصب العین کے شعور اور اس کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ پس معاشرتی زندگی کا اصل خمیر اجتماعی نصب العین کے تعین سے اٹھتا ہے جس سے تمام افراد معاشرہ کی وفاداریاں' قوتیں اور کوششیں سمٹ کر ایک نقطہ پر مرکوز ہوجاتی ہیں۔

۳۔ عمل اور سعی تکمیل:

افراد معاشرہ کے لیے اجتماعی نصب العین کا تعین اور اجتماعی شعور کی بیداری بھی مقصود بالذات نہیں بلکہ اس نصب العین کی تحصیل اور ترقی تکمیل کی خاطر افراد کی انفرادی اور اجتماعی جدوجہد ہی معاشرتی زندگی کی بقاء اور استحکام کی اصل ضامن ہے اقبال نے سچ کہا ہے کہ ''قوموں کی زندگی کا راز اس جدوجہد میں مضمر ہے کہ اپنا وجود ملی قائم رکھیں اور نہ بھولیں کہ ان کا اپنا ایک نصب العین ہے۔

اور یہ کہ زندگی عبارت ہے۔ اغراض و مقاصد کی تشکیل' ان کی پے در پے تبدیلی اور کارفرمائی (یعنی سعی تکمیل) سے کہ

زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل او در آرزو پوشیدہ است
زندگی جہد است و استحقاق نیست جز بعلم النفس و آفاق نیست

پس معاشرتی زندگی کا ایک لازمی معنوی عنصر اجتماعی نصب العین کی تکمیل کے لیے انفرادی اور اجتماعی' فکری اور عملی جدوجہد اور تگ و تاز ہے جس کے بغیر معاشرتی تنظیم بہر حال اُدھوری ہی رہتی ہے۔ یہ تھے انسانی معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کے مادی اور معنوی لوازمات' لیکن یہ حقیقت بھی واضح اور عیاں ہے کہ انسانیت مختلف معاشروں میں منقسم ہے۔ اور ہر معاشرہ اپنے ان مادی اور معنوی عناصر کی ماہیت' نوعیت اور خصائص کے لحاظ سے دوسرے معاشروں سے مختلف اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے چنانچہ انبیائی معاشرے' غیر انبیائی سوسائٹیوں سے یقیناً مختلف ہوتے ہیں اور آخری آفاقی ہدایت ربانی سے تشکیل پانے والا اسلامی معاشرہ دیگر تمام سوسائٹیوں سے یکسر ممتاز اور منفرد ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام عالم سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

اسلامی معاشرہ کے بنیادی خصائص و امتیازات:

اسلامی معاشرہ حسب ذیل اعتبارات سے دیگر تمام معاشروں سے امتیاز رکھتا ہے۔

اولاً۔ تشکیلی امتیازات

ا۔ایمان اساس وحدت:

مختلف انسانی معاشروں میں عمرانی وحدت کی اساس یعنی وہ قوت جو لوگوں کے درمیان یکتائی اور انفرادیت کا روحانی جذبہ پیدا کر کے انہیں ایک لڑی میں پروتی ہے۔ مختلف تصورات ہوا کرتے ہیں مثلاً اتحاد نسل' اشتراک لسان' جغرافیائی وحدت اور معاشی و سیاسی مقاصد میں اشتراک وغیرہ لیکن یہ امتیاز حقیقی طور پر صرف اسلامی معاشرہ ہی کو حاصل ہے۔

کہ اسکی بنائے وحدت اور اساس تشکیل از اول تا آخر صرف اور صرف ''وحدت ایمان و دین'' ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن' نہ اشتراک اغراض اقتصادی' بلکہ ہم اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی۔ اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم زین جہت با یک دگر پیوستہ ایم

۲۔زمانی ومکانی حدود سے ماورائیت:

اسلام چونکہ ابدی اور آفاقی دین ہے اس لیے اس کی بنیاد پر تشکیل پانے والا معاشرہ بھی دیگر تمام انسانی معاشروں (انبیائی اور غیر انبیائی) کے برعکس زمانی اور مکانی حدود وقیود سے ماوراء ابدی اور عالمگیر معاشرہ ہے کہ مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کا ہر مسلمان اسلامی معاشرہ کا فرد ہے۔ اور یہ معاشرہ جو افراد سے الگ ایک مستقل وجود اور

زندگی رکھتا ہے۔ ابد اور لافانی ہے کہ افراد تو مٹتے رہیں گے لیکن اسلامی معاشرہ کا وجود ختم نہیں ہوگا اقبال کہتے ہیں "قوم ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے۔ یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض مجموعہ ہے اصولاً غلط ہے۔۔۔قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے' اس کی ماہیت پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود اور لاتناہی ہے"۔

۳۔ تنظیم معاشرہ کے ایمانی قواعد اور دینی ادارے:

مادی' محدود اور ناپائیدار بنیادوں پر مشکل ہونے والے انسانی معاشروں کے برعکس حقیقی دینی اساس پر استوار ہونے والے اسلامی معاشرہ کی تنظیم و ترقی کے جملہ اصول و مبادی اور قواعد و ضوابط بھی خود دین ہی کے عطا کردہ ہیں اور معاشرتی تنظیم کے جملہ ادارے مثلاً مسجد' مکتب' خانقاہ' ریاست' بیت المال وغیرہ بھی بنیادی طور پر دینی اور ایمانی ادارے ہیں جن کے مقاصد' اعمال اور سرگرمیاں سب ہی دینی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں کہ ارشاد خداوندی " ادخلوا فی السلمه کافة کا یہی تقاضا ہے۔ یوں دیگر معاشروں کی ہر لحہ تغیر پذیر تنظیم اور ناپائیدار اداروں کے برعکس اسلامی معاشرہ ہر اعتبار سے پختگی' ثبات اور استقلال کا آئینہ دار ہے۔

دوم۔ نصب امتیازات:

جغرافیائی' نسلی اور معاشی و سیاسی وفاداریوں پر مبنی انسانی معاشروں کا نصب العین بھی انہیں محدود وفاداریوں کا آئینہ ہوتا ہے' اس کے برعکس ابدی اور آفاقی دینی تصور پر مبنی اسلامی معاشرہ کا اجتماعی نصب العین بھی ابدی' آفاقی اور لامحدود ہے۔ جو عبارت ہے۔ ایمان کے تقاضوں کی تکمیل' دین کی سیادت و اشاعت اور انسانیت کی خدمت و اصلاح سے ارشاد خداوندی ہے۔

﴿ الذین ان مکنا هم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الذکوٰۃ وامروا بالمعروف و نهوا عن المنکر ﴾

اور ﴿ هوالذی ارسل رسوله بالهدى و دين الحق ليظهره على الدين كله﴾

اور ﴿ كنتم خير امته اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تومنون بالله﴾

دین اسلام کا بنیادی انسانی مقصد مصالح خمسہ یعنی دین، نفس، فعل، عقل اور مال کی ہمہ جہتی حفاظت ہے اور اسلامی معاشرہ کا ہر فرد خلیفۃ اللہ ہونے کے ناطے انفرادی اور اجتماعی طور پر ان مصالح خمسہ کی حفاظت کے لیے سعیٔ مسلسل اور پیہم تگ و دو کا پابند ہے۔
دین اسلامی معاشرہ کا انسانی نصب العین ہر فرد معاشرہ (مرد و عورت) کے ایمان کو جان عزت و آبرو، عقل اور مال، اور اجتماعی طور پر معاشرہ کی مجموعی ایمانی قوت، ملی تشخص و استقلال قومی تقدس و آبرو، اجتماعی فکری و نظریاتی اقدار اور قومی معاشی استقلال کا تحفظ اور استحکام ہے۔

سوم۔ کرداری خصائص و امتیازات

ا۔ یکسانی فکر و عمل:

اسلامی معاشرہ کا خمیر "وحدت ایمان" سے اٹھایا گیا ہے جس کا لازمی نتیجہ فکری و عملی یکسانی اور معاشرتی اتحاد و یگانگت ہے۔ یہ وحدت و تضامن اور یکسانی فکر و عمل تمام افراد، معاشرتی اداروں، سرگرمیوں اور حیات اجتماعی کے جملہ مظاہر و آثار میں نمایاں ہوتی ہے۔
ارشاد خداوندی "ان هذه امتكم امته و احدة

اور " و اعتصموا بجبل الله جميعا و لاتفرقوا

اور " و ان هذا صراطى مستقيما فاتبعوه و لاتتبعو السبل فتفرق
میں اسی اٹل معاشرتی حقیقت کا بیان ہے۔ یہ اجتماعی یکسانی اور اتحاد و تضامن زندگی پر بہت گہرے اور پائیدار اثرات چھوڑتا ہے۔ ان میں سے اہم اور اساسی اثرات کا بیان آگے آ رہا ہے۔

۴۔احترام انسانیت:

اسلامی معاشرہ دو بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔ایک تمام نسل انسانی کی وحدت و اخوت' اور دوسرے اس وحدت کے استحکام کیلئے روحانی حوالے کی ضرورت ۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ"

وحدت انسانی کے اس آفاقی تصور اور اخوت اسلامی کی داخلی روح سے' جو اسلامی معاشرہ کے تمام اعمال ومظاہر میں منعکس ہے' انسانی شرف وتکریم اور احترام آدمیت کا اصول ابھرتا ہے جو بمصداق ارشاد باری "ولقد کرمنا بنی آدم و حملنا ھم فی البر و البحر و ر زقنا ھم من الطیبت و فضلنا ھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا

معاشرہ کے ہر فرد کا مساوی حق بھی ہے اور فرض بھی کہ اسلامی معاشرہ میں ہر ایک شخص کی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت پوری انسانیت کی حفاظت واحترام ہے

برتر از گردوں مقام آدم است　　اصل تہذیب احترام آدم است

۳۔مساوات:

اسلامی معاشرہ کی بنیاد وحدت انسانی اور اخوت اسلامی (انما المو منو ن اخوۃ) کا لازمی نتیجہ وہ روح مساوات ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی چنانچہ اسلامی معاشرہ میں ہر قسم کے' نسلی صنفی اور جغرافیائی امتیازات سے بالاتر ہو کر تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا گیا ہے۔اور بنیادی انسانی ضرورتوں میں سب کے ساتھ برابر کا سلوک لازمی ٹھہرایا گیا ہے۔قبائلی عصبیت' نسلی امتیازات اور گروہی احساسات کے خلاف اسلام نے جس عقیدے کو نافذ کیا اس کا اسلامی تاریخ پر بہت گہرا اثر ہوا اور یہ مساواتی مزاج بعض خاص وجوہ اور استثنائی حالات سے قطع نظر' ناقابل تردید طور پر مسلم معاشرہ میں ہر دور میں غالب رہا ہے۔اقبال کہتے ہیں۔"اسلام ہی نے سب سے پہلے وحدت ومساوات انسانی پر زور دیا اور اسلام ہی نے اخلاقی اور اجتماعی ہر اعتبار سے اس کا کامل اور مکمل تصور قائم کیا لہٰذا اس کی حیثیت

محض ایک خیال کی نہیں رہی بلکہ ایک مؤثر، فعال اور فیصلہ کن عنصر کی ہے تا کہ بطور ایک حقیقت حیات، فرد اور معاشرے کی زندگی میں اس کا اظہار ایک عملی اور واقعی شکل میں ہوتا رہے۔

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

۴۔ حریت:

وحدت انسانی اور احترام آدمیت کے تصور پر مبنی اسلامی معاشرہ کی ایک بنیادی خصوصیت حریت و آزادی ہے۔ ہر فرد اسلامی احکام کا براہ راست مخاطب ہونے کے باعث شخصی مسؤلیت کے حوالے سے اسلامی معاشرہ میں اپنی ایک مستقل شخصیت اور جداگانہ وجود رکھتا ہے جسکا لازمی تقاضا آزادی ضمیر و اعتقاد (لا اکراہ فی الدین) حریت فکر و اظہار رائے اور حریت امتلاک و تصرف ہے۔ یہ آزادی ہر دور میں اسلامی معاشرہ کا وصف غالب رہا ہے۔ مقاصد شریعت کی تکمیل اور معاشرتی توازن کے قیام کی شرط سے مقید ہے۔

۵۔ توازن:

عالمگیر فطری قانون توازن جو نظام تکوین اور نظام تشریع دونوں میں جاری و ساری ہے، اسلامی معاشرہ اور حیات اجتماعی کی بھی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ فرد اور معاشرہ کے باہمی حقوق و فرائض اور تمام افراد معاشرہ اور طبقات کے باہمی حقوق و فرائض اور روابط و تعلقات میں توازن، فرد کے شخص استقلال و حریت ذاتی اور معاشرتی جذبہ و رجحان کے مابین توازن و توافق اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں شعبوں کے تقاضوں اور ضروریات کے درمیان توازن پیدا کرنا ہر فرد معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ امت مسلمہ امت وسط اور اسلامی معاشرہ معتدل معاشرہ ہے بلحوائے ارشاد خداوندی " وجعلنا کم امتہ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس " اس لیے اعتدال و توازن ہر دور میں اسلامی سوسائٹی کی بنیادی خصوصیت رہا ہے۔ یہ تھے اسلامی معاشرہ کے بنیادی خصائص اور جوہری امتیازات جو موضوع زیر نظر یعنی "اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں" کے

نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی وضاحت کے لیے بطور مسلمہ حقائق اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں:

اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں کا تاریخی جائزہ دو پہلو رکھتا ہے۔ نظری اور عملی۔ ان دونوں جہتوں سے حیثیت نسواں کی وضاحت سے بیشتر خود ''حیثیت'' کا حقیقی مفہوم متعین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ بحث کے کسی گوشے میں کوئی ابہام احتمال اور پیچیدگی باقی نہ رہنے پائے۔

حیثیت نسواں کا حقیقی مفہوم:

عصر حاضر میں عورت کی حیثیت اور مرتبہ ومقام کے بارے میں جس قدر ذہنی الجھاؤ، فکری اضطراب اور عملی ہیجان وتصادم پایا جاتا ہے اس سب کی بنیاد یہ المیہ ہے کہ ہر طبقہ حیثیت نسواں کا اپنا ایک مخصوص مفہوم لے کر اس کے پیمانے سے حیات اجتماعی کی اصلاح وتعمیر کا داعی اور علمبردار ہے اور یوں راسخ العقیدہ اور تجدد پسند گروہ اس نظریاتی اختلاف کے باعث مسلسل تصادم کا شکار ہیں اور افہام وتفہیم سے گریزاں۔ ایسے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ''حیثیت'' کا حقیقی فطری اور عملی مفہوم طے کر کے اس کے حوالے سے حیات اجتماعی کی تعمیر وتنظیم کی کوشش کی جائے۔ چونکہ حیثیت نسواں کا وہ مفہوم فطری حقیقی اور عملی ہوگا جو خود انسانی معاشرہ کے تشکیل عوامل اور ہر معاشرہ کے امتیازی خصائص اور واضح عمرانی تصورات سے ابھرے اس لیے ہم نے اوپر کے صفحات میں انسانی معاشرہ کے اجزائے تشکیل اور اسلامی معاشرہ کے جوہری خصائص بیان کیے ہیں کہ جن کی روشنی میں حیثیت نسواں کا حقیقی اسلامی مفہوم کچھ یوں متعین ہوتا ہے۔

ا۔ استقلال شخصیت:

معاشرہ افراد کا مجموعہ ہے جو ان کے باہمی مادی معنوی اور روحانی روابط سے متشکل ہوتا ہے یوں اس معاشرتی اتحاد وارتباط میں ہر فرد کی اپنی جداگانہ شخصیت اور ذات مستقل طور پر قائم وباقی رہتی ہے یہ استقلال شخصیت جو اسلامی معاشرہ میں ہر مرد وعورت و

میسر ہے۔ فرد کے مقومات ذات، طبعی خصائص اور کرداری امتیازات اور فکری رجحانات کی حریت، حفاظت اور ترقی سے عبارت ہے اور اس استقلال ذات کی بنیاد دراصل ہر فرد کی حریت فکر و ارادہ اور آزادی عمل تصرف پر مبنی شخصی مسئولیت اور ذاتی ذمہ دری ہے، ارشادِ خداوندی "من عمل صالحا فلنفسه ومن اساء فعليها اور لاتزر وازرة وزر اخرى:

میں اسی ذاتی مسئولیت پر مبنی استقلال شخص کی ایک جہت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حدیث پاک کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته " میں بھی اسی حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تاہم اس شخصی استقلال کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہر فرد معاشرہ دیگر افراد سے منقطع ہو کر، اپنی ہی ذات میں مگن، نفسانی انانیت کا شکار اور ایثار و مودت کے جذبات سے محروم ہو جائے بلکہ " بمقتضائے والمومنون والمو منات بعضهم اولياء بعض "

ہر فرد معاشرہ میں اجتماعی میلانات اور معاشرتی وحدت و تضامن اور باہمی مشاورت و تعاون سے بڑھ کر قلبی محبت و مودت اور ایثار و ہمدردی کا عملی مظاہرہ لازمی ہے اور در حقیقت شخصی استقلال کی روحانی اور نفسیاتی اساس ہی یہ ہے کہ ہر فرد اپنی داخلی قوتوں اور توانائیوں کو اجتماعی بھلائی کے لیے صرف کر کے دوسروں کو سکون و طمانیت اور راحت و سعادت بہم پہنچائے جیسا کہ علاقہ زوجیت کی نفسیاتی اساس کے بارے میں فرمایا گیا۔ " ومن آياته ان خلق لكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا اليها وجعل بينكم مودة ورحمته .

پس اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں کا اساسی جز وہ استقلال شخصیت ہے جو زندگی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو سے اسے حاصل ہے اور جو اسے شخصی مسئولیت کے حوالے سے ہر عمل میں ذاتی اعتماد اور خودداری عطا کرتا ہے۔ اور جو اسے معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو سے اسے حاصل ہے اور جو اسے شخصی مسئولیت کے حوالے سے ہر عمل میں ذاتی اعتماد اور خودداری عطا کرتا ہے۔ اور جو اسے معاشرتی زندگی میں شفقت ہمدردی، ایثار اور خدمت کی علامت بھی بنا دیتا ہے۔

۲۔ادائے فرائض اور استعمال حقوق سے ابھرنے والی متوازن کیفیت:

معاشرتی حیثیت کا دوسرا بنیادی رخ ہر فرد اور طبقہ کی طرف سے اپنے جملہ انفرادی واجتماعی فرائض وواجبات کی کماحقہ ادائیگی اور اپنے حقوق کے جائز اور ایثار شعارانہ استعمال سے ابھرنے والی وہ مجموعی نفسی کیفیت ہے۔ جو توازن و اعتدال' مصلحیت و مقصدیت اور ارتقاء پذیری وکمال طلب کی آئینہ دار ہو۔پس اسلامی معاشرہ میں خواتین کی حیثیت متعین کرنے میں ان کی ادائیگی فرائض اور استعمال حقوق سے ابھرنے والی مجموعی نفسی کیفیت کا کردار بھی بنیادی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے فرائض اور حقوق کا بیان بھی ناگزیر ہے تاہم یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ معاشرتی حقوق و فرائض میں اضافیت اور نسبیت پائی جاتی ہے یعنی ہر فرد اور ہر طبقہ کے فرائض بھی دوسرے طبقہ سے مختلف ہیں اور حقوق بھی ماسوا بنیادی انسانی ضرورتوں اور کفالتوں کے' کیونکہ ہر فرد اور طبقہ کے حقوق وفرائض اس کی شخصی استقلال یعنی خصائص' تخلیقی امتیازات اور معاشرتی کرداری دائرہ کے حوالے سے ہی متعین ہوتے ہیں۔مثلاً ایک بچے کے حقوق وفرائض ایک بالغ سے مختلف ہیں اور عورت کے مرد سے' اس طرح صنعت پیشہ زراعت پیشہ اور تجارت پیشہ طبقات کے معاشرتی حقوق وفرائض ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور طبقہ اہل علم وفکر کے ان سب سے مختلف اور یہیں سے مساوات فی الحقوق والفرائض کا حقیقی مفہوم بھی عیاں ہو جاتا ہے جو عبارت ہے اس سے کہ معاشرہ کے ہر فرد وطبقہ کو اس کے مخصوص اور جداگانہ حقوق کے استعمال اور فرائض کی تکمیل کی مساوی آزادی اور برابر مواقع میسر ہوں اور یوں مساوات کا یہ عصری مفہوم کہ ہر فرد اور طبقہ کو ہر حال میں' از اوّل تا آخر ایک ہی جیسے حقوق حاصل ہوں اور ایک سے فرائض سب پر عائد ہوں' غلط (ماسوا بنیادی انسانی ضرورتوں کے) ہو کر رہ جاتا ہے۔اور ساتھ ہی یہ شوروغوغا بھی بے بنیاد ہے کہ مرد وعورت کو ہر شعبہ زندگی میں یکساں اور ایک سے حقوق ملنے چاہئیں۔

۳۔ صنفی اور گروہی استحقاقات:

اور یہیں سے معاشرتی حیثیت کے تعین کا تیسرا پہلو بھی سامنے آ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ہر طبقہ افراد کو اس کے طبعی، کرداری اور جذباتی امتیازات کے حوالے سے کچھ خصوصی معاشرتی عنایات اور استحقاقات ملنے چاہئیں مثلاً اہل علم و فضل کو شرف و تکریم کا اعلیٰ اعزاز، محنت کش طبقہ کو خصوصی قدر روا جو کا استحقاق، طبقہ نسواں کو لطیف جذباتی عنایت و التفات اور بچوں کو شفقت و رعایت اور حسن تربیت اور طبقہ اشرار پر شدت و تنبیہ اور مسلسل نگرانی وغیرہ ایسے استحقاقات ہیں جو طبقاتی اور صنفی امتیازات پر مبنی ہیں اور ہر طبقہ کی معاشرتی حیثیت کے تعین میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

۴۔ عمل و تکمیل کے مساوی مواقع:

اوپر معنوی اجزائے معاشرہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اجتماعی نصب العین کی تحصیل اور و تکمیل کی خاطر افراد کی انفرادی اور اجتماعی جدوجہد ہی معاشرتی زندگی کی بقاء اور استحکام کی ضامن ہے۔ یوں افراد کی معاشرتی حیثیت کے "تعین کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ طبعی اور ہلیتی امتیازات کے مطابق ہر فرد اور طبقہ کو اس کے مخصوص دائرہ کار میں عمل اور ترقی و تکمیل کے مساوی مواقع اور سہولتیں مہیا ہوں یعنی اہل علم و فکر کو جس قدر سہولتیں علم و فضل میں ترقی کے لیے میسر ہوں اس قدر سہولتیں اہل صنعت و حرفت کو فنی ترقی کے لیے ارزاں ہوں، اس طرح مردوں کو ان کے مخصوص دائرہ کارہ میں ترقی و کمال کے جتنے مواقع مہیا ہوں اتنے ہی مواقع عورتوں کو ان کے اپنے مخصوص دائرہ عمل میں میسر ہوں۔ اور یہی ہے مساوات کا حقیقی مفہوم جو نوعیتی تفریق و امتیاز کے باوصف کمیت و کیفیت میں برابری سے عبارت ہے۔

یہ تھے معاشرتی حیثیت کے حقیقی اسلامی مفہوم کے بعض بنیادی اجزاء اور پہلو جن کی رو سے حیثیت نسواں کا مجموعی مفہوم یہ ابھرتا ہے کہ انہیں معاشرہ میں دیگر تمام افراد کی طرح شخصی استقلال جو ذاتی مسئولیت اور خودداری پر مبنی ہے حاصل ہو، اپنے مخصوص دائرہ عمل میں ترقی و تکمیل کے اتنے ہی مواقع اور سہولتیں میسر ہوں جتنی مردوں کو ان کے اپنے

دائرہ کار میں میسر ہیں ان کے معاشرتی حقوق و فرائض' ان کے طبعی امتیازات اور صنفی اختصاصات سے متناسب ہوں' ادائیگی فرائض اور جائز استعمال حقوق سے ابھرنے والی مجموعی نفسی کیفیت (قریب بہ تقویٰ) ان کے شرف و تکریم کی اساس ٹھہر اور انہیں دیگر معاشرتی طبقات کی طرح تمام صنفی رعایات اور خصوصی استحقاقات بھی حاصل ہوں۔ اب ہم حیثیت کے مذکورہ مفہوم کی روشنی میں اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں کا نظری اور عملی ہر دو پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔

اولاً۔ اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں کا نظری پہلو:

اسلامی معاشرہ میں عورت کی چہار گانہ حیثیت (مذکورہ مفہوم کی روشنی میں) کے بیان سے پہلے معاشرہ کی تعمیر و تہذیب' تنظیم و تکمیل اور اجتماعی نصب العین کی تحصیل میں عورت کے بنیادی کردار کی مختصر وضاحت ضروری ہے تاکہ سابقہ بحث کی روشنی میں حیات اجتماعی میں عورت کا اصل مقام و کردار متعین کرنے کے بعد اسلامی معاشرہ میں اس کی چہار جہتی حیثیت کی حقیقی اہمیت واضح کی جا سکے۔

الف۔ معاشرہ میں عورت کا تعمیری تنظیمی اور غایتی کردار:

انسانی معاشرہ میں بالعموم اور اسلامی معاشرہ میں بالخصوص عورت کے تعمیری و تہذیبی' تنظیمی و تکمیلی اور نصب العین کردار کی وضاحت' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے' تین پہلو رکھتی ہے۔

ا۔ معاشرہ کی تعمیر و ترقی اور تہذیبی ارتقاء میں عورت کا مقام:

شروع میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ معاشرہ افراد سے تشکیل پاتا ہے اور افراد کے بغیر کوئی معاشرہ کوئی تہذیب و تمدن وجود میں نہیں آ سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ طبقہ نسواں نہ صرف معاشرہ کو افرادی قوت مہیا کرتا ہے بلکہ نسل انسانی کی بقاء و استمرار کے لیے عورت ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ معاشرہ خاندان سے تشکیل پاتا ہے اور خاندان کے ذریعہ بڑھتا' پھولتا اور پھلتا ہے۔ کیونکہ معاشرہ خاندان کا وجود مرد و عورت دونوں کا یکساں رہین منت

ہے۔

عائلی زندگی کے بارِ گراں کو سنبھالنے اور اس کے نشیب و فراز میں مرد و عورت' ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوتے ہیں اور حیات عائلی کی صحت و استحکام ہی اجتماعی زندگی اور نظام معاشرہ بلکہ نظامِ عالمِ انسان کے جڑ ہے' یوں مرد و عورت کی صنفی وابستگی اور سماجی و نفسیاتی تعلق ہی تہذیب و تمدّن کی اساس و بنیاد ہے اور اسی تعلق کی قوت و ضعف پر تمدّن کی صلاح و فساد اور استحکام و اختلال کا انحصار ہے۔

مرد و زن وابستہ یک دیگر اند　　کائنات شوق را صورت گر اند

(اقبالؒ)

سید قطبؒ کہتے ہیں: ''صنفی تعلق تمدّن' اقتصاد اور تقسیم دولت کی بنیاد ہے اور اس تعلق پر انسانیت کے وسیع اور گوناگوں پہلوؤں میں اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے۔

اس حقیقت کی توضیح مولانا مودودیؒ کے اس قول سے ممکن ہے کہ: خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدّن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے نہایت محبت ایثار دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے' اس بنا پر یہ ایک حقیقت ہے کہ خاندان انسانی تمدّن کی جڑ ہے اور اس جڑ کی صحت و طاقت پر خود تمدّن کی صحت و طاقت کا مدار ہے۔

معاشرہ دراصل انسان کی زندگی کا تشکیلی عمل ہے جس میں افراد' طبقات اور گروہ اپنی انفرادی اور اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لیے ضروری مفید اور سازگار حالات اور مواقع پیدا کرتے ہیں' معاشرہ کے اس تشکیلی اور تکمیلی عمل میں مردوں اور عورتوں کے فطری' سماجی اور نفسیاتی تعلقات کے علاوہ ان ہر دو صنفوں کے رجحانات' صلاحیتیں اور اعمال فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ پس ہر معاشرہ کی تکوین و تشکیل اس کے تکمیلی افراد و طبقات کی پیہم جدوجہد' مسلسل ترقیات اور تکمیلات کا نتیجہ ہوتی ہے۔

تمدّن ان تکمیلات کی مادی تنظیم اور اجتماعی زندگی کی ترقی یافتہ صورت کا نام ہے اور تہذیب اس تکمیلاتی ترقی کی روحانی یا نفسیاتی صورت ہے جو عموماً کسی خاص قوم کی

معاشرت سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور سوسائٹی کے مجموعی فکر و عمل سے نمودار ہونے والے آثار و مظاہر کی صورت تمدن کی ذہنی اور داخلی وحدت فکر و میلان کو اُجاگر کرتی ہے۔

بہر صورت اس سارے تہذیبی اور تمدنی عمل و تکمیل میں مرد و عورت کی صنفی اور روحانی وابستگی پر مبنی ادارے خاندان کی حیثیت خشت اوّل کی سی ہے' یوں مرد و عورت دونوں تہذیب کے معمار ہیں بلکہ حیات سائلی کی نشونما ارتقاء نسل نو کی اٹھان اور تکمیل افراد کی تیاری میں عورت کا ''مادرانہ کردار'' تہذیب و تمدن کے قیام و تکمیل میں اس کی اہمیت فزوں تر کر دیتا ہے۔ اسی لیے فارابی کے مطابق ''جس گھر میں نیک اور تعلیمیافتہ ماں ہوتی ہے وہ گھر انسانیت اور تہذیب کی یونیورسٹی ہے'' اور بقول اقبالؒ ''وہ قوم اور معاشرے کی خالق ہے۔''

زن نگہ دارندۂ نارِ حیات — فطرتِ اُولوح اسرارِ حیات
در ضمیرش ممکنات زندگی — از تب و تابش ثباتِ زندگی
جہاں را محکمی از امہات است — نہادشاں امین ممکنات است

پس یہ حقیقت ہے کہ عورت انسانیت کا نصف اور معاشرے کا وہ ناگزیر عنصر ہے جس کی حیثیت' کردار و عمل اور حیات بخش صلاحیتوں کی تعمیر و ترقی اور تہذیب و تمدن کے قیام و تکمیل کا سامان ہیں' قومیں اس کی گود میں پھولتی' پھلتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ زندگی کی بقاء و استحکام اور کائنات عالم کی رعنائی و زیبائش اس کے وجود ذات سے ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کر ثریا سے مشت خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اس درج کا در مکنوں

ب: معاشرتی تنظیمی ادارے اور عورت:

ہم شروع میں یہ طے کر چکے ہیں کہ معاشرتی تشکیل کے لیے ادارتی تنظیم ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر اجتماعی مقاصد و اعمال کی تکمیل ممکن نہیں' اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ معاشرہ کی تکوین و تنظیم کی بنیادی اکائی اور خشتِ اوّل خاندان ہے جو حیاتِ اجتماعی کا اوّلین ادارہ ہے۔ اس کی بناء مرد و عورت کے ملاپ سے پڑتی ہے۔ یہی صنفی وابستگی ان کی انفرادیت کو اجتماعیت میں تبدیل کرتی ہے اور انتشار و انحراف کے میلانات کو دبا کر انہیں

تمدن کا خادم بناتی ہے۔ عائلی زندگی کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔ ایک محدود دائرے میں جسمانی اور نفسیاتی ثبات و استقرار کی فضا پیدا کرنا جس میں نئی نسلیں پاکیزہ اخلاق' اعلیٰ تربیت اور صحیح تعمیر سیرت کے ساتھ پروان چڑھ سکیں' اور دوسرے انحراف و اضطراب کے محرکات و عوامل کا قلع قمع کر کے حسن تنظیم اور پختگی ارتباط کے ساتھ معاشرہ کی تہذیبی عمارت استوار کرنے میں بنیادی کردار کرنا۔

ان دونوں بنیادی مقاصد کی تکمیل میں عورت کے عائلی اور تہذیبی کردار کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے' حقیقت یہ ہے کہ نسلِ نو کی نشو نما اور تربیت و تعمیر سیرت کا انحصار اور تہذیبی اُٹھان اور تمدنی ارتقاء کا مدار عورت ہی پر ہے۔

سیرت فرزندھا از امہات — جوہر صدق و صفا از امہات

از اموت پختہ تر تعمیرِ ما — در خط سیمائے او تقدیرِ ما

یہی وجہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہر معاشرہ میں عورت کی بنیادی وابستگی خاندان سے رہی اور ہر دور میں اس کے وظائف' مقاصد اور سرگرمیوں کا محور حیاتِ عائلی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن جب کوئی معاشرہ فرد کو کسی اجتماعی شعبہ سے وابستہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے تمام اداروں سے اپنا ناطہ توڑ لے کیونکہ تعلیمی' فنی اور سماجی سبھی ادارے بظاہر جدا جدا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ ایک ہی ہیئت اجتماعیہ کے مختلف اجزاء ہیں اور باہم مربوط و متناسق ہیں اور ہیئت اجتماعیہ ان سب کی محتاج' کیونکہ ان میں کوئی بھی ادارہ معاشرتی زندگی کے تمام تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتا بلکہ ان کی تکمیل سبھی اداروں کے اشتراک عمل سے ہوتی ہے' چونکہ ہر فرد کی تمدنی ضروریات پورے معاشرے میں پھیلی ہوتی ہیں اس لیے اپنی متنوع ضروریات کی تکمیل کی خاطر اُسے تمام معاشرتی اداروں سے وابستہ ہونا پڑتا ہے یہی حال عورت کا ہے کہ وہ بنیادی طور سے خاندانی زندگی کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز بنانے کے باوجود دیگر سماجی اور تمدنی اداروں سے منقطع ہو کر نہیں رہ سکتی بلکہ مختلف سماجی' اقتصادی' سیاسی اور مذہبی اداروں میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتی ہے۔

ج۔ اجتماعی نصب العین کی تحصیل و تکمیل میں عورت کا حصہ:

شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ معاشرتی زندگی کا خمیر اجتماعی نصب العین کے تعین سے اٹھتا ہے اس کے بغیر معاشرہ کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اور اس اجتماعی نصب العین کی تحصیل و تکمیل کے لیے تمام افراد و طبقات معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی تگ و تاز ہی درحقیقت معاشرتی زندگی کی بقاء واستحکام کی ضامن ہے۔ معاشرہ کا بنیادی اور ناگزیر عنصر ہونے کی حیثیت سے اجتماعی نصب العین کی تحصیل میں عورت کا حصہ مرد سے کسی طرح کمتر نہیں بلکہ تاریخ کی واقعاتی اور حیاتیاتی شہادت کی رو سے ہر معاشرہ کی تکمیل غایت میں عورت کا حصہ مرد سے فزوں تر رہا ہے۔ معاشرہ کا نصب العین اگر حق کا فروغ اور ایمانی تقاضوں کی تکمیل ہو تو عورت اس میں مرد کے شانہ بشانہ ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: " **والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلوٰة ويوتون الزكوة ويطعمون الله ورسوله(الایته)** اور اگر معاشرہ کا مقصد باطل کی ترقی واستحکام اور دین حق کی مخالفت ہو تو بھی عورت مرد کے ساتھ برابر کی شریک' فرمایا: **المنافقون والمنافقت بعضهم من بعض يامرون بالمنكر وينهون عن المعروف ويقبضون ايديهم .(الایته)** جملہ انبیائی معاشروں کا بلکہ غیر انبیائی معاشروں کا بھی انسانی نصب العین مصالح خمسہ یعنی نفس' مذہب (دین) نسل عقل اور مال کی حفاظت کر رہا ہے۔

علامہ شاطبی وغزالی وغیرہ نے تصریح کی ہے: " **انها اى المصالح الخسة . مراعاة فى كلّ مِلّة .**

یعنی ان مصالح خمسہ کی حفاظت ہر قوم وملت کا مقصد رہی ہے' ان مصالح خمسہ کی حفاظت میں عورت کا کردار بڑا بنیادی ہے۔ نفس انسانی کی حفاظت تو درکنار تخلیق ہی عورت کی رہین منت ہے۔

مولانا رومؒ کہتے ہیں کہ انسان نائب الٰہی ہونے کی وجہ سے صفاتِ کمالیہ الٰہیہ کا مظہر ہے لیکن ان صفات میں سے تخلیق کا مظہر مرد سے کہیں زیادہ عورت ہے' تمام انسان

عورت کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں، اس کا رحم ربوبیت کا محل ہے اور یہ عمل کائنات میں خدا کی خلاقی کے بعد سب سے بڑا اخلاقی کا عمل ہے۔

پرتو حق است آں معشوق نیست خالق است آں گویا مخلوق نیست

(مولانا رومؒ)

مولانا اشرف علی تھانویؒ "کلید مثنوی" میں اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں کہ عورت کی تشبیہ بالخالق اور مظہریت صفات الٰہیہ چند اعتبارات سے ہے۔ اوّل یہ کہ وہ مرد کی جاذبِ قلب ہے۔ دوم بچے کی مولد و مصور ہے۔ سوم بچے کی مربی ہے، مصلح امور معیشت ہے۔ ان میں سے ہر صفت کسی نہ کسی صفت الٰہیہ کا پرتو ہے۔ ہم اس سلسلہ میں اقبال کا یہ قول بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "کسی معاشرے میں مذہب کا سب سے بڑا امین و محافظ کون ہوتا ہے؟ عورت ہوتی ہے باقی رہی ماں کی حفاظت، تو حیاتِ عائلی میں مدت کا کفایت شعارانہ صرف دولت اور مرد کی غیر حاضری میں اثاث بیت کی حفاظت عورت ہی پر موقوف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صالح اور وفا شعار بیوی کے اوصاف میں گھر اور مال کی حفاظت کا ذکر بھی فرمایا ہے یوں معاشرتی مقاصد و غایات کی تکمیل میں عورت کا کردار بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

جافظ رمز اخوت مادراں قوتِ قرآن ملّت مادراں

اسلام میں عورت کی چہار جہتی حیثیت:

اوپر حیثیت نسواں کے حقیقی اسلامی مفہوم کے چار بنیادی پہلو بیان کیے گئے ہیں، اسلامی معاشرہ کے مختلف ادوار میں ان چاروں زاویوں سے حیثیت نسواں کا جائزہ لینے سے پیشتر اسلامی تعلیمات کی رو سے اس چہار جہتی حیثیت کا نظری طور سے اجمالی بیان ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس معیار کی وضاحت کیے بغیر مختلف ادوار میں حیثیت نسواں کو عملی رخ سے جانچنا ممکن نہیں۔

(ا) حقوق نسواں اور ان کی حدود واستعمال:

حقوق نسواں کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: عائلی حقوق اور اجتماعی حقوق۔

ا۔ حیاتِ عائلی میں حقوقِ نسواں:

عائلی زندگی میں عورت چار حیثیتوں سے گذرتی ہے بیٹی' بیوی' بہن اور ماں۔ اور ان چاروں حیثیتوں میں اسلام نے عورت کے حسب ذیل حقوق مقرر فرمائے ہیں:۔

حقوقِ مادر:

والدین اور بالخصوص ماں کے حقوق کی اہمیت کا اعتراف سبھی مذاہب واقوام نے کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نطق وکلام کا آغاز ہی اس قول سے ہوتا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی بنایا ہے اور نماز وزکوٰۃ اور والدہ سے حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔

اسلام نے تو ماں کی حیثیت سے عورت کا مقام ناقابل فہم حد تک بلند کر دیا ہے کہ بموجب ارشاد نبویؐ: ''جنت ماں کے قدموں تلے ہے''۔ دراصل عورت بحیثیت ماں' جیسا کہ مولانا رومؒ کا قول اوپر بیان ہوا خالقِ کائنات کی صفتِ خلاقی کا سب سے بڑا مظہر ہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حُسن سلوک کی تاکید فرماتے ہوئے ماں کی صفت تخلیق کو نمایاں تصریح کے ساتھ بیان کرتے ہوئے والد کے مقابلہ میں اس کا مرتبہ بلند کر دیا ہے ارشاد ہے: ووصینا الا نسان بوالدیہ حملتہ امہ وھناً علیٰ وھنٍ وفصالہ فی عامین ان اشکر لی و لوالدیک '' (الایتہ)

پھر یہی نہیں بلکہ رحم مادر میں بچہ کی تدریجی تخلیق وتصویر کے مراحل میں' قدرت نے ماں کو یہ روحانی اہلیت وتاثیر بخشی ہے کہ وہ بچہ کے لاشعور میں' اس کی ضمیر وقلب میں والدین کی محبت' ولاء اور خدمت واطاعت کا جذبہ واحساس بھر دے بایں طور کہ بچہ پیدا ہوتے ہی غیر شعوری طور پر اپنے والدین سے پیار اور محبت واطاعت کا عملی اظہار شروع کر دے' یہ اہلیت وتاثیر جسے ''اُمومت'' کہا جا سکتا ہے' صرف ماں کو عطا ہوئی' ارشادِ

خداوندی: ''وجعل لکم من ازواجکم بنین و حقدة ''۔(الایۃ)'' میں حفدہ'' کا معنی محبت اور اطاعت شعار ہے اور یہ وصف اولاد میں ماں کی طرف سے منتقل ہونے کا اشارہ بلکہ تصریح اسی آیت میں موجود ہے' اور ان وجوہ کی بناء پر باپ کے مقابلہ میں ماں کا مرتبہ سہ چند ہو جاتا ہے' جیسا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے سوال پر اسے باپ کے مقابلہ میں ماں کی حیثیت و مرتبہ اور استحقاق خدمت تین گنا زیادہ بتایا تھا۔ بالاختصار ماں کے اہم حقوق حسب ذیل ہیں:۔

محبت واحترام:

سورۂ اسراء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے والدین کے سامنے رحمت آمیز عجز اختیار کرو۔ ان سے مؤدبانہ گفتگو کرو حتی کہ حرفِ افسوس (اُف) تک نہ کہو '': **فلا تقل لھما اُف ولا تنھر ھما و قل لھما قولا کریما و اخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ و قل رب ارحمھا کما ربیانی صیغیرا**

حدیث پاک میں ہے' جو شخص اپنے ماں باپ پر شفقت بھری نظر ڈالتا ہے اُس کے لیے حج مبرور کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ والدین کا احترام اس قدر ملحوظ ہے کہ ان کے احترام کی حفاظت کی خاطر دوسروں کی تکریم بھی ضروری ہے۔ فرمایا والدین کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا' حضور ﷺ! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ فرمایا جب وہ کسی کی ماں باپ کو گالی دے تو دوسرا جواب میں اس کی ماں یا باپ کو گالی دے گا۔

تعمیل حکم:

تمام جائز و مشروع امور میں ماں باپ کی فرمانبرداری اور اطاعت لازمی ہے' کہ ان کی نافرمانی گناہ کبیرہ شمار ہوتی ہے' ماں کی بچے کے ساتھ بے لوث محبت اور زندگی بھر کے جانی و مالی ایثار اور احسانات کا بدلہ تو کجا اندازہ لگانا بھی انسانی قدرت سے باہر ہے' اس لیے ایک شخص کے سوال پر کہ ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا

کہ ''تیری جنت اور دوزخ وہی ہیں۔

اور **الجنة تحت اقدام الامّهات**''

کے بعد تو کسی تصریح کی ضرورت ہی نہیں۔

خدمت گذاری:

والدین کے ساتھ حسن سلوک سے ارشاد خداوندی '' **وبالوالدين احسانا**'' ۔ کا بنیادی تقاضا ان کی خدمت گذاری ہے' اور بعض حالات میں ماں باپ کی خدمت تو جہاد سے بھی بالاتر اور زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکت جہاد کی اجازت طلب کی آپ ﷺ نے پوچھا کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟ اثبات میں جواب پا کر فرمایا' واپس جاؤ اور اُن کی خدمت میں جدوجہد کرو۔

ایک صحابیؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی علیہ وسلم! صحرائے عرب میں ایک گرم دوپہر جبکہ پتھر اور ریت آگ کی مانند جل رہے تھے' میں اور میری ماں ننگے پاؤں چل رہی تھی میں نے اپنی والدہ کو کندھوں پر اٹھالیا' کیا میں نے اپنی پرورش کے دوران اُن کی تکالیف کا بدلہ چکا دیا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' نہیں' حتیٰ کہ تمہاری پیدائش کے وقت اُس نے جو تکلیف اُٹھائی اُس کے ایک جزو کا بھی بدلہ ادا نہ ہوا۔

والدہ کے عزیزوں اور سہیلیوں سے حسن سلوک:

اسلام والدین کی اطاعت و خدمت کا ایک لازمی تقاضا ان کے قرابتداروں اور دوستوں و سہیلیوں کی خدمت سلوک کو قرار دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ و والدہ کے بعد خالہ کے ساتھ ماں کے برابر حسن سلوک کی تاکید فرمائی اور جس طرح والد کے احباب کو چچا کے برابر سمجھنا چاہیے' اسی طرح والدہ کی سہیلیوں کو خالہ کے برابر سمجھنا چاہیے۔

یہ تھے ماں کے چند بنیادی حقوق ورنہ ماں کی زندگی اور وفات کے بعد کے حقوق کا استقصا تو ممکن نہیں۔

حقوقِ زوجہ:

شادی اسلام میں کوئی تجارتی یا تعاملی شرکت یعنی کمپنی نہیں بلکہ یہ ایک حیاتی اور انسانی میثاق ہے جس کی دو خصوصی جہتیں ہیں ایک انتظامی جہت جس کا تعلق حیاتِ عائلی کے نظم و انضباط کی خاطر تنظیمی ذمہ داری کسی ایک فریق کو سونپ کر اسے "قوامیت" یعنی سیادت انتظامی بخشنے سے ہے یہ قوامیت جو عائلی زندگی کی ترتیب و انصرام ضروریاتِ زندگی کی فراہمی عورت کی نگہبانی و محافظت اور گھر کا انتظام و اصلاح سے عبارت ہے دو خوبیوں کی بناء پر مرد کو سونپی گئی ہے ایک وہبی اور دوسری کسبی۔ وہبی امتیاز یہ ہے کہ مرد اپنی جسمانی قوت میں بلاشبہ عورت سے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: "بما فضل الله بعضهم علیٰ بعض." اور کسبی امتیاز یہ ہے کہ بیوی بچوں کے جملہ اخراجات اور ان کے آرام و آسائش اور حفاظت و رعایت کی تمامتر ذمہ داری مرد پر عائد ہے فرمایا "وبما فضل انفقوا من اموالهم"۔ یہ تو تھی انتظامی جہت حیات عائلی کی جس میں مرد کو اپنی فطری اور کسبی برتری کے باعث قوام بنایا گیا ہے اس عہد و پیمان کی دوسری جہت عاطفی اور جذباتی ہے جسے اس ارشاد پاک میں بیان فرمایا گیا ہے کہ: "ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة و رحمته (الآیته)

ارشاد باری: لتسکنوا الیها." کا منشاء یہ ہے کہ بیوی کی ذات میں خاوند کے لیے سکون و طمانیت اور راحت قلبی کا سامان ودیعت ہے گویا مرد کی ذات میں قلق و اضطراب کے دواعی موجود ہیں جن کے ازالہ اور سکون قلبی کے حصول کے لیے وہ عورت کا محتاج ہے اور عورت کی فطرت میں خاوند کی تسکین اور راحت کا جذبہ و سامان بھر دیا گیا ہے۔

پس حیات عائلی کی انتظامی جہت میں اگر مرد کو قوام اور عورت کو اس کے تابع و زیر انتظام رکھا گیا ہے تو عاطفی رُخ میں عورت کو منبع سکون و راحت اور مرد کو اس کا محتاج ٹھہرا کر حقیقی مساوات کا اہتمام فرما دیا گیا ہے۔ بہر آئینہ عورت کو بحیثیت رفیقہ حیات کے حسب ذیل انواع کے حقوق سے نوازا گیا ہے:۔

دینی و اخلاقی حقوق

(۱) حسن تعلیم و تربیت:

ارشادِ خداوندی: " یآ یّھا الّذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارًا
کی رُو سے خاوند پر لازم ہے کہ بیوی کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ " مرد پر لازم ہے کہ علم دین عورتوں کو سکھادے اگر نہ سکھائے گا تو باہر جا کر عالم سے پوچھنا عورت پر فرض ہے اگر امور دین سکھانے میں قصور کرے گا تو مرد خود گنہگار ہوگا۔"

علامہ ابن الحاج رقمطراز ہیں : " فلو طلبت المراء ة حقھا فی امر دینھا من زوجھا و رفعته الی الحاکم و طالبتهٗ بالتعلیم لا مر دینھا لا ن ذٰلک لھا اِما بنفسه او بواسطة اذنه لھا فی الخروج الیٰ ذٰلک لو جب علی الحاکم جبرہ علیٰ ذٰلک کما بجبرہ علیٰ حقو قھا الدنیو یة' اذان حقوق الدین آکدوأ ولیٰ

یعنی اگر عورت اپنے خاوند سے اپنی دینی تعلیم و تربیت کے حق کا تقاضا کرے اور قاضی کے پاس دعویٰ دائر کردے تو قاضی کے لیے لازم ہے کہ جس طرح وہ اس کے دنیوی حقوق کی پاسبانی کرتا ہے اسی طرح دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے پر مجبور کرے۔

(۲) رازوں کی حفاظت:

خاوند بیوی ایک دوسرے کے مونس و ہمدرد اور شریک راز ہیں عورت کا اخلاقی حق ہے کہ خاوند اس کے راز فشاء نہ کرے، عیوب کی پردہ پوشی کرے، حتیٰ کہ اگر طلاق دے دے ارشادِ نبوتؐ ہے۔ قیامت کے دن بدترین شخص وہ ہوگا جو بیوی کا شریک راز ہوا اور اس کا راز کھول دیا۔

معاشرتی حقوق

(۱) حُسنِ معاشرت:

ارشادِ باری تعالیٰ: " وعاشروهن بالمعروف." سے بیوی کا حق حسنِ معاشرت ظاہر ہوتا ہے جو صرف مادی مظاہر وآثار تک محدود نہیں بلکہ معنوی روابط وتعلقات کی پختگی، باہمی چاہت وایثار اور حسنِ وابستگی کو بھی محیط ہے۔ ارشادِ نبوی ہے " استوصوا بالنساء خيرا" نیز فرمایا:" خيار كم خيار كم لنساء هم ." اس حسنِ معاشرت وملاطفت میں تفریح، مزاح اور عورت کی دلجوئی بھی شامل ہے۔

(۲) حقِ مشاورت:

اسلام نے معاشرتی زندگی کی ہر سطح پر اصول مشاورت کو بنیادی اہمیت دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ :" وامرهم شورىٰ بينهم " کا عموم واطلاق حیات اجتماعی کے اولین مرحلہ خاندانی زندگی کو بھی محیط ہے، اس لیے حیات عائلی کی تنظیم میں مشورہ عورت کا حق ہے، فرمان باری تعالیٰ:" وان ارادا فصالا عن تراض منهما و تشاور فلا جناح عليهما " اور ارشادِ نبویؐ:" آمروا النساء في بناتهن"۔

سے عیاں ہے کہ زندگی کے جن شعبوں سے متعلق وہ تجربہ اور نفع ونقصان سے واقفیت رکھتی ہے، اُن کے بارے میں اس کی رائے اور مشورہ لینا نہایت ضروری ہے کیونکہ عورت کا حقِ مشاورت اسے عائلی زندگی کی تنظیم میں مشترک اور مساوی ذمہ داری کے احساس سے سرشار رکھتا ہے جس سے حیات عائلی کی پختگی اور استقرار وثبات کی ضمانت مہیا ہوتی ہے۔

(۳) نکاح کے فوائد وآثار میں مساوی شرکت:

اسلام نے عورت کو نکاح کے انعقاد سے لے کر اس کے آثار وفوائد جیسے استمتاع صنفی، عائلی ذمہ داریوں میں تعاون، طلب طلاق وخلع وغیرہ میں مرد کے ساتھ

مساوی طور سے شریک ٹھہرایا ہے۔

اقتصادی حقوق:

عورت کے بحیثیت بیوی اقتصادی حقوق میں اہم تر مہر' نفقہ و سکنی' اور حقِ میراث وغیرہ ہیں' ان حقوق کی تفصیل کتب فقہ میں مفصل ہے' یہاں طوالت کے خوف سے انہی اشارات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

حقوقِ دُختر:

اولاد کی محبت انسان کی فطرت میں ودیعت ہے جس میں لڑکے اور لڑکی کی کوئی تفریق نہیں' لیکن بسا اوقات انسان کی مادی ضروریات و خواہشات اور ماحول کی تمدنی رسوم کے باعث لڑکی اپنے والدین کی شفقت و رعایت سے محروم ہو جاتی ہے جیسا کہ عہد جاہلیت میں عموماً رائج تھا۔ اسلام نے عورت پر ہونے والے تمام جاہلی مظالم کا قلع قمع کر کے اسے ہر حیثیت میں انتہائی پستیوں سے اُٹھا کر عزت و تکریم کی معراج پر فائز کر دیا بیٹی کی حیثیت سے عورت کے حقوق اجمالاً حسب ذیل ہیں۔

(۱) اعلیٰ پرورش:

لڑکی اور طبعی طور پر کمزور ہوتی ہے اور عہد جاہلیت میں مصنوعی غیرت کی چکی میں بھی یہی پستی تھی' اس لیے اسلام کی پرورش اور نشو و نما پر خصوصی توجہ دینے کی تاکید کرتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ''لڑکی کی پرورش والدین اور دوزخ کے درمیان پردہ ہے''۔ نیز فرمایا جو شخص دو بچیوں کی پرورش کر کے انہیں جوان کر دے تو قیامت میں (جنت میں) وہ میرے اس قدر قریب ہو گا جس قدر یہ دو انگلیاں''۔

(۲) حُسنِ تعلیم و تربیت:

اسلام نے اولاد کی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا ہے' ارشادِ نبویؐ ہے: ''کوئی باپ اپنے بچوں کو حُسنِ ادب سے بہت عطیہ نہیں دے سکتا''۔ اس میں لڑکا اور لڑکی دونوں برابر

ہیں، ان کے درمیان تفریق و امتیاز جائز نہیں۔

(۳) شفقت و رعایت میں ترجیحی سلوک:

امام غزالیؒ کہتے ہیں: ''کوئی انسان لڑکی سے کراہت اور لڑکے سے بہت خوشی نہ کرے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ بھلائی کس میں ہے؟ لڑکی بہت مبارک ہے اور اس کا ثواب زیادہ ہے''۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم اپنے بچوں کے لیے کوئی چیز لاؤ تو لڑکیوں کو پہلے دو جو شخص لڑکی کو خوش کرے گا وہ ایسا ہے جیسے کہ حق تعالیٰ کے خوف سے رویا، اور جو خوفِ خدا سے روئے اس پر آتشِ دوزخ حرام ہے''۔

حقوقِ خواہر:

بہن اگر بھائی سے بڑی ہو تو اس کے حقوق ماں کے حقوق جیسے ہیں اور اگر چھوٹی ہو تو اس کے وہی حقوق ہیں جو بیٹی کے ہیں ارشادِ نبوت ہے '' من کان له ثلاث بنات او اخوات ، او بنتان او اختان، ناحسن صحبتهن، و صبر علیهن و اتقی الله فیهن، دخل الجنة ۔

یعنی دو یا تین بیٹیوں یا بہنوں سے حسن سلوک، تحمل و برداشت اور ان کے حقوق کی رعائیت (تقوی اللہ کا بہترین مفہوم حقوق کی نگہداشت ہے) جنت میں داخلہ کی ضمانت ہے۔

ب: اجتماعی سطح پر حقوق نسواں:

اجتماعی سطح پر اسلام نے عورت کو معاشرہ کے ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے حسب ذیل اساسی حقوق سے نوازا ہے۔

(۱) تحفظ مصالح خمسہ:

اسلامی معاشرہ کے نصب العینی امتیازات میں ہم بنیادی انسانی نصب العین کی حیثیت سے مصالح خمسہ یعنی دین، نفس، نسل و آبرو، عقل اور مال کے تحفظ کی اہمیت اور اس

سلسلہ میں ہر فرد معاشرہ یعنی مرد و عورت کی مساوی حیثیت و استحقاق کی طرف اشارہ کر دیا ہے' اسلام خلیفۃ اللہ ہونے کے ناطے ہر انسان پر اپنی ذات کے مصالح خمسہ اور دوسرے تمام افراد کے مصالح خمسہ یعنی دین و نفس و آبرو اور نسل و مال کی حفاظت کی کوشش فرض ٹھہراتا ہے۔ اور مرد کی طرح ہر عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے ان مصالح کی بھرپور حفاظت کرے اور معاشرے سے تحفظ کا مطالبہ کرے' نیز انہی مصالح خمسہ کی حفاظت کی خاطر اسلام عورت کو بہت سے احکام اور تکالیف شاقہ سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور کئی خصوصی احکام اس پر لاگو کرتا ہے۔ چنانچہ عورت کے تحفظ دین کی خاطر غیر مسلم سے اس کے نکاح کی حرمت اور اہلیت دین کا اثبات' تحفظ نفس کی خاطر مرد کے برابر حق دفاع نفس' حفاظت عفت و آبرو کی خاطر پردہ حجاب کے احکام اور حد قذف کا اجراء اور تحفظ عقل و مال کی خاطر اہلیت اجتماعی و اقتصادی کا اثبات اور حریت فکر و تصرف کے علاوہ ذاتی مسئولیت ایسے مبادی مقرر فرمائے گئے ہیں۔

(۲) تساوی و تمایز:

اس کائنات عالم کے نظام کا محور اشتراک و انفراد' اجتماع و افتراق' اور تماثل و تمایز ہے۔ وصف وجود میں سارا عالم مشترک و مساوی ہے' مگر صفت حیوۃ کے باعث اجزاء عالم اور ان کے احکام و معاملات میں تفریق پیدا ہو جاتی ہے' پھر وصف حیات میں مشترک اجزاء و عناصر میں وصف تکلیف (شرعی احکام کا پابند قرار دینا) سے تفریق ہو گئی ہے' ادھر وصف تکلیف میں مشترک جن و انس کے مابین لطافت ناری اور کثافت خاکی پر مبنی افتراق اوصاف کے باعث تمایز پیدا ہو گیا' یوں یہ اشتراک و انفراد اور مساوات و امتیاز کا سلسلہ موجودات سے چل کر ایک صنف کو دوسری پر فوقیت دیتا ہوا انسان پر منتہی ہوا اور پھر انسانیت کے افراد میں یہ سلسلہ باوجود وحدت و اشتراک نسل (خلقکم من نفس واحدۃ) کے صنفی' تمدنی اور دینی امتیاز و مساوات کے حوالہ سے جاری رہا۔ امتیاز صنفی میں مرد و عورت کی تفریق' امتیاز تمدنی میں نسبی' جغرافیائی اور پیشوں پر مبنی تفریق اور امتیاز دینی میں حق و باطل' ایمان و کفر پر مبنی بنیادی تفریق کے حوالے سے احکام' معاملات اور حقوق و فرائض میں بھی

تفریق وتمایز پیدا ہوتا رہا ہے۔ یہ طے شدہ عقلی' عرفی اور شرعی حقیقت ہے کہ اشتراک کے درجہ میں مساوات ہوتی ہے اور امتیاز کے مرتبہ میں احکام و معاملات میں تفریق ہو جاتی ہے۔ یوں انسانی افراد کے درمیان اشتراک انسانیت کے باعث دوسرے مدارج اور ثانوی حقوق (صنفی تمدنی اور مذہبی) میں تفریق وتمایز ناگزیر ہے۔

بناء بریں مرد وعورت میں اشتراک انسانیت کی وجہ سے تمام بنیادی انسانی حقوق میں مساوات ہے لیکن صنفی استحقاقات اور تمدنی و معاشرتی معاملات میں تفریق اور دائرہ کار کا امتیاز عقلاً اور شرعاً ناگزیر ہے' اس لیے شریعت اسلامیہ نے مرد وعورت کے صنفی اور تمدنی امتیاز کے باعث دونوں کے ثانوی معاشرتی حقوق و معاملات اور وظائف واعمال میں تقسیم اور دائرہ بندی کر کے ظاہری تمایز وتفریق کے باوجود حقیقی مساوات پیدا کر دی ہے جو عبارت ہے اس امر سے کہ ہر فرد کو اس کے اپنے دائرہ عمل میں اتنے ہی حقوق و مواقع میسر ہوں جتنے دوسرے افراد کو ان کے اپنے دائرہ عمل میں ارزاں ہیں اور اس پر اتنے ہی فرائض عائد ہوں جتنے دوسروں پر۔

(۳) حریت استعمال ومطالبہ (ہنسی مزاق) حقوق:

اپنے انسانی' صنفی' تمدنی اور دینی حقوق کے شرعی حدود میں رہتے ہوئے آزادنہ استعمال اور پامال ہونے سے بچانے کے لیے قانونی اور آئینی اقدامات کرنے کی حریت بھی عورتوں کا اجتماعی اور معاشرتی حق ہے' استعمال حقوق کی شرعی اور تمدنی حدود و قیود کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

(۴) صنفی رعایت' شخصی استقلال اور مساوی مواقع تکمیل وترقی:

عورتوں کے اجتماعی حقوق میں یہ بھی ہیں کہ انہیں خصوصی صنفی رعایات حاصل ہوں معاشرہ میں انہیں ذاتی استقلال اور شخصی اہلیت ومسولیت وحریت اور فکری وعملی ترقی و تکمیل کے (اپنے مخصوص دائرہ عمل میں) اتنے ہی مواقع میسر ہوں جتنے کہ مردوں کو ارزاں ہیں' حقوق نسواں کے ان پہلوؤں کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے۔

حقوق نسواں کی حدود استعمال:

اس سلسلہ میں ہم ایک بنیادی اور عمومی حقیقت کے اجمالی بیان پر ہی اکتفاء کریں گے جس سے تمام حقوق انسانی کے استعمال کی شرعی اور تمدنی حدود و اغراض واضح ہو کر سامنے آ جائیں گی' وہ بنیادی اور عمومی حقیقت یہ ہے کہ اسلام چونکہ اجتماعیت کا دین ہے اور اس کے جملہ احکام' معاملات اور اختصاصات پر اجتماعیت' موضوعیت اور مقصدیت غالب ومحیط ہے' اسلیئے اسلام میں تمام انسانی حقوق کی حیثیت شخصی اغراض کے ذرائع تکمیل کی بجائے اجتماعی وظائف۔

ایثار شعارانہ' دینی اختصاصات اور اعلیٰ تر تہذیبی غایات کے وسائل تکمیل کی ہے' یعنی ہر فرد معاشرہ (مرد و عورت) اپنے تمام فطری' دینی' تمدنی اور قانونی حقوق و اختیارات کو اپنی ذاتی مادی اغراض کی بجائے ایمانی تقاضوں (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کی تکمیل' تمدنی مقاصد و اہداف (استقرار امن وانصاف) کی تحقیق و اجتماعی مصالح ومفادت (فلاح عامہ ومصالح خمسہ) کی تحصیل کے لیے استعمال کرنے اور بروئے کار لانے کا پابند ہے' ارشاد خداوندی: " وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرۃ ولاتنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک (الآیۃ)

میں اس حقیقت کی طرف اشارات موجود ہیں پس حقوق نسواں کے استعمال کی شرعی اور اجتماعی حدود اغراض بھی وہی ہیں جو اسلام نے تمام حقوق و اختیارات کو اجتماعی وظائف' دینی اختصاصات اور تہذیبی وسائل کی حیثیت دے کر طے کر دی ہیں۔

۱۱۔ استقلال شخصیت:

حیثیت نسواں کا حقیقی مفہوم طے کرتے وقت ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں ہر مرد و عورت کی اپنی جداگانہ شخصیت اور ذات مستقل طور پر قائم و باقی رہتی ہے اس استقلال شخصیت کے نمایاں مظاہر حسب ذیل ہیں۔

ا۔ اہلیت و استعداد:

عورت کا استقلال اہلیت و استعداد مندرجہ ذیل بنیادی رخ رکھتا ہے۔

ا۔ اہلیت دینی:

احکام شرعیہ کا مخاطب اور تکالیف دینیہ کا پابند بنانے میں انسان کے وصف انسانیت اور اہلیت امتثال کو بنیاد بنایا گیا ہے' اسلیے صنفی تفریق کی بناء پر اس سلسلہ میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی گئی' بنیادی طور پر تدین و تقویٰ اور اخلاق اسلامیہ سے انصاف کی اہلیت و استعداد مرد و عورت دونوں میں یکساں پائی جاتی ہے' البتہ حیاتیاتی عوارض کے باعث بعض اوقات دونوں کو یا کسی ایک کو' بعض احکام سے دائمی یا عارضی طور سے مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا ہے' عورتوں کے لیے اسلام میں داخل ہونے کی جداگانہ مستقل بیعت لازمی ٹھہرائے جانے میں بھی یہی حکم کارفرما ہے کہ عورتوں کو اپنی ذات کا مستقلاً ذمہ ٹھہرایا گیا ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان میں اہلیت و استعداد دینی بھی مردوں کی طرح ہے' ارشاد خداوندی ہے:

"یآ یّھا النبی اذا جاءک المئومنٰت یبایعنک" (الآیۃ) انسان کی فلاح کا دارومدار ایمان و تقویٰ پر ہے اور اس کی اہلیت و استعداد مرد و عورت دونوں میں یکساں ہے

" من عمل صالحاً من ذکر او اُنثیٰ و ھو مو منٌ فلنحیینہ حیٰو ۃ طیبۃً :" (الآیتہ) قرب الٰہی کے دروازے دونوں کے لیے برابر کشادہ ہیں. " ان المسلمین و المسلمات و المومنین و المومنات و القانتین و القٰنتات و الصادقین و الصادقات و الصابرین و الصابرات و الخاشعین و الخاشعات و المتصدقین و المتصدقات (الآیتہ)

ب: اہلیت اقتصادی:

دینی اہلیت کی طرح اقتصادی اہلیت میں عورت شرعی طور پر مرد سے الگ اور مستقل ہے' قرآن کا حکم یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو بلا امتیاز اس کی جدوجہد کا ثمر ملے گا:" للرّجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما ا کتسبن". عورت کو شرعی

طور پر تمام عقود و معاملات طے کرنے، تملک و اکتساب اور اپنے مملوکات میں ہر جائز تصرف کا حق حاصل ہے اور اس سلسلہ میں اس کی اہلیت شرعی کوئی قدغن نہیں۔

ج: اہلیت اجتماعی:

عورت کی اہلیت اجتماعی کا اولین مظہر اس کا حق ایجاب ہے کہ ولی اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی نہیں کر سکتا' ارشاد نبویؐ ہے: **"لیس للولی مع البنت امر"**. نیز فرمایا: **"البنت احق بنفسھا من ولیھا' والبکر تستا ذن فی نفسھا' و اذ نھا صما تھا"** اس موقع پر ابن قیم کی یہ تصریح قابل غور ہے کہ "بالغ و عاقل عورت کا ولی اگر اس کے مال میں' اس کی خلاف منشاء تصرف کا مجاز نہیں تو اس کی مرضی کے خلاف اس کی جان (نفس) کسی کے عقد میں کیونکر دے سکتا ہے"۔ عورت کی اہلیت اجتماعی کا دوسرا بڑا مظہر یہ ہے کہ وہ حالت امن و جنگ میں کسی کافر کو امان دے دے تو اس کی امان نافذ ہوگی اور ہر مسلمان کے لیے اس کی حفاظت لازمی ہوگی' ارشادِ نبویؐ ہے: **"المسلمون تتکافلا ماء ھم و یسعیٰ بذ متھم ادنا ھم"**۔ نیز فرمایا: **"ان کانت المراءۃ لتجیر علی المؤ منین فیجوز"**۔ پھر مزید برآں یہ کہ عورت اپنے فطری دائرے سے باہر کئی سماجی و معاشرتی مناصب پر فائز ہونے کی اہلیت و استعداد سے بھی بہرہ ور ہے۔ ابن الھمام رقمطراز ہیں: **"لیس فی الشرع سوی نقصان عقلھا و معلوم انھا لم یصل الیٰ حد سلب ولا یتھا بالکلیۃ' الا تری انھا تصلح شاھدۃ و ناظرۃ فی الاوقاف و وصیۃ علی الیتامی"**: "یعنی عورت کا نقصان عقل اس کی ولایت کے بالکلیہ سلب کے سبب نہیں بنتا بلکہ وہ گواہی دینے' ناظر اوقاف بننے اور یتیموں کی وصی بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔

(۲) حریت و آزادی:

اسلامی معاشرہ کے خصائص میں حریت و آزادی کا بیان بھی ہو چکا ہے' یہ حریت و آزادی جو اسلامی معاشرہ میں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی حاصل ہے' ان کے استقلال

شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے' حریت دراصل ایک اعتبار قانونی ہے جس کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان فطری طور پر خود کو خدائے واحد کا بندہ' اس کے احکام کا مکلف سمجھے اور کل کائنات کو اپنے لیے مسخر اور خدمتگار گردانے تاکہ عناصر فطرت کی غلامی سے آزاد رہ سکے اس اعتبار سے حریت ایک داخلی احساس اور باطنی کیفیت ہے۔ جو فکر و اعتقاد سے لے کر عمل و تصرف اور اخلاق و کردار تک میں پختگی اور ثبات و استقلال پیدا کر دیتی ہے۔

اسلام نے عورت کو جو حریت و آزادی عطا فرمائی ہے' اس کے بعض بنیادی مظاہر اوپر اہلیت دینی و اقتصادی اور اجتماعی کے حوالے سے بیان کیے جا چکے ہیں' دیگر نمایاں مظاہر حریت حسب ذیل ہیں۔

حریت فکر و رائے:۔

اجتماعی نصب العین کی تحصیل و تکمیل میں عورت کے بنیادی کردار انجام دہی حریت فکر و اعتقاد اور آزادی رائے کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اسلام نے عورت کو فکر و اعتقاد میں مرد کی تاثیر سے مکمل آزادی اور اظہار رائے کا بھرپور حق دیا ہے' البتہ قبولیت رائے و مشورہ کے لیے صائب ہو کہ جو عمومی شرط مرد و عورت دونوں کے لیے لگائی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہر صنف جن امور میں زیادہ تجربہ' مہارت اور واقفیت کی حامل ہے' ان امور میں اسی صنف کی رائے فائق' برتر اور صائب قرار پائے گی' عورت کی حریت رائے اور حق مشورہ کے عائلی مظاہر کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ بہت سی اجتماعی اور عمومی معاملات میں بھی اس کی رائے کو وقعت دی گئی ہے' عہد رسالت و خلافت کے واقعات اس سلسلہ میں آگے بیان ہوں گے۔ ظہار کے معاملہ میں خولہؓ بنت ثعلب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محاورہ اور مجادلہ کو قرآن نے سراہا اور اس کی رائے کے مطابق احکام ظہار نازل فرمائے: "

قد سمع الله قول التي تجادلك في زوجها تشتكي الى الله والله يسمع تحاورکما (لآیتہ) جنازہ کی موجودہ شکل حضرت اسماءؓ بنت عمیس نے حبشہ کے نصاریٰ کے ہاں دیکھی تھی' انہی کے مشورہ کے مطابق اسے اسلام میں اپنایا گیا۔

حریت اعمال واوصاف:

بنیادی طور پر حریت کی تین قسمیں ہیں: ا۔حریت ذات' یعنی جسمانی آزادی' ۲۔حریت صفات' یعنی قوائے نفسانی اور شیطانی کے تسلط سے اعمال و اخلاق انسان کی آزادی اور ۳۔حریت معاملات' یعنی تصرف وتعامل واکتساب کی آزادی۔عورت کو حریت ذات اور حریت معاملات کی طرح حریت صفات کی نعمت بھی اسلام نے عطا فرمائی ہے۔ یعنی وہ اپنے نفس کی تعمیر وتطہیر میں' مکارم اخلاق کو اپنانے اور رذائل اعمال سے بچنے میں مرد کے زیر اثر واختیار نہیں۔

حریت استعمال وتحفظ حقوق:

حریت نسواں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہیں اپنی اہلیت ہمہ نوعی کی بنیاد پر ملنے والے تمام دینی' تمدنی اور قانونی حقوق و معاملات کے استعمال اور تحفظ کی مکمل آزادی حاصل ہے۔مصالح خمسہ کا دفاع ہو کہ فکر وعمل کے ارزاں مواقع سے استفادہ' اپنے حقوق عائلی واجتماعی کا تحفظ ہو کہ شرعی اختیارات (ولایات' وصایات' نظارات) کا استعمال' عورت ہر حال میں خارجی تسلط اور دباؤ سے آزاد اور صرف شرعی حدود و مقاصد کی تکمیل کی پابند اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی مکلف ہے۔

(۳) مسئولیت وذمہ داری:

عورت کے استقلال اہلیت اور حق حریت کا لازمی تقاضا اور نتیجہ استقلال مسئولیت اور ذاتی ذمہ داری ہے' یعنی ہر وہ عمل واختصاص جس کی اہلیت اور حریت عورت کو حاصل ہے اسکی تکمیل کی ذمہ دار اور نتائج کی جواب دہ بھی وہ خود ہی ہے' اس مسئولیت و جواب دہی میں اس کے شریک کار کے سوا اور کوئی اس کا شریک نہیں۔

عورت کی اہلیت اور حریت کی طرح اس کی مسئولیت بھی متنوع مظاہر رکھتی ہے۔مثلاً دینی و اخلاقی ذمہ داری (ذاتی تعمیر سیرت) عائلی ذمہ داری (تربیت اولاد' حفاظت بیت اور اطاعت خاوند) اجتماعی ومعاشرتی ذمہ داری (امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اور تہذیبی مقاصد کی تکمیل) اور اقتصادی ذمہ داری (بملہ معاشی اعمال و تصرفات کی جوابدہی) وغیرہ۔ یہ سبھی مظاہر اسلامی معاشرہ میں عورت کے استقلال شخصیت اور ارفع و اعلیٰ حیثیت کے آئینہ دار ہیں۔

III۔ خصوصی صنفی رعایات:

اوپر حیثیت نسواں کا حقیقی مفہوم متعین کرتے وقت اس مفہوم کا تیسرا بنیادی پہلو خصوصی صنفی رعایات کا استحقاق بیان کیا گیا تھا' عورت کو اسلام نے جنس لطیف و نازک قرار دے کر حسب ذیل خصوصی رعایات سے نوازا ہے۔

ا۔ لطیف جذباتی عنایت:

بنیادی طور پر عورت کا خمیر جذبات و عواطف سے اٹھایا گیا ہے' کیونکہ بچہ کی حسن پرورش کے لیے ماں کی ممتا کو جذباتیت اور حساسیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے' یوں عورت کی نمایاں فطرت' جذبات کی حدت' وجدان کی نزاکت اور احساسات کی لطافت ہیں' اسلام مرد کی ذات میں عورت کے لیے لطف و محبت کے جذبات ابھارتا ہے۔ فرمایا: " زین للناس حب الشهوات من النساء (الآیة) اور عورت کی طبعی نزاکت و لطافت کی رعایت کرنے کا حکم دیتا ہے' ارشاد نبویؐ ہے: " یہ نازک آبگینے ہیں انہیں ٹھیس نہ لگنے پائے " باپ کو تلقین کی گئی ہے کہ جب وہ باہر سے بچوں کے لیے کوئی چیز لائے تو لڑکیوں کی نزاکت طبعی' حساسیت اور والدین کے ساتھ اُن کی لڑکوں سے زیادہ محبت کے پیش نظر انہیں پہلے دے اور پھر لڑکوں کو۔

ب۔ حفاظت و پاسبانی:

عورتوں کی نزاکت طبع اور جذباتیت کا تقاضا یہ ہے کہ مرد ان کی ہر لحاظ سے حفاظت اور پاسبانی کریں اور ان کی توہین نہ خود کریں اور نہ ہونے دیں۔

عورت کا سب سے قیمتی زیور اس کی عفت و آبرو ہے' اس لیے عفت نسواں کی حفاظت و نگہبانی اسلامی معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے' عورت کے شرف و آبرو کو مجروح کرنے

یا تہمت لگانے کی سزا لعنت اور ۸۰ کوڑے ہے: " ان الذین یرمون المحصنٰت الغافلات المومنٰت لعنوا فی الدینا و الاخرۃ"۔ اور " فاجلدو ھم ثمانین جلدۃ ول تقبلو الھم شھادۃً ابدًا"۔

سید امیر علی رقمطراز ہیں: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے احترام کو اُسوۂ اسلامیہ میں شامل فرمایا' آپؐ کے ارشادات میں عورتوں کے بارے میں فیاضی اور بہادری کی روح رچی ہوئی ہے' بحیثیت مجموعی عورتوں سے جوانمردانہ سلوک کسی اور مذہب یا معاشرتی نظام کی بہ نسبت اسلام سے زیادہ گہرا تعلق رکھتا ہے"۔

ج: تقدس و احترام:

اسلام نے عورت کو بے پناہ احترام' اکرام اور تقدس بخشا ہے اور اس احترام و تقدس کی حفاظت حرب و امن ہر حال میں ضروری ٹھہری' اگر جنگ میں مسلمان کسی غیر مسلم عورت کو قیدی بنالیں تو کسی فوجی کے لیے اس عورت پر دست درازی یا کسی قسم کی زیادتی جائز نہیں کہ اسلام میں جنس عورت محترم ہے۔ روزمرہ معاملات اور باہمی گفتگو و پکار تک میں عورت کا احترام ملحوظ رہے: " ذلک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین اور "لایسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرا منھم ولا نساء من نسآ (الآیتہ)

۴۔ مساوی مواقع تکمیل و ترقی:

جیسا کہ شروع میں بیان ہوا حیثیت نسواں کا چوتھا بنیادی پہلو یہ ہے کہ طبعی اور اہلیتی امتیازات کے مطابق انہیں اپنے مخصوص دائرہ کار میں عمل و تکمیل کے اتنے ہی مواقع میسر ہوں جتنے مردوں کو اُن کے دائرہ عمل میں ارزاں ہیں' اسلامی معاشرہ میں عورتوں کو نہ صرف اپنے مخصوص دائرہ عمل میں ترقی و تکمیل کے تمام مواقع ارزاں ہیں بلکہ اپنے فطری دائرہ کار سے باہر بھی کئی سماجی اور تمدنی خدمات انجام دینے کی سہولت میسر ہے' اس سلسلہ میں حسب ذیل تکمیلی مظاہر بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

(الف) علم:

ارشادِ خداوندی: " اذا جاءک المومنات یبا یعنک علیٰ ان لایشرکن باللہ شیئاً ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفتر ینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبا یعھن (الآیتہ) میں جن اصولوں کی پابندی کا عہد عورتوں سے لیا گیا ان کی تکمیل اور بالخصوص " ولا یعصینک فی معروف" کے بموجب ہر قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے بچنے اور رضا جوئی کے حکم پر عمل کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ عورتیں دین کے احکام اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم حاصل کریں' یوں اسلام تعلیم کے میدان میں عورت کو مکمل مواقع فراہم کرتا ہے کہ ارشادِ نبویؐ " العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم" ۔ میں بالاتفاق عورتیں بھی شامل ہیں' البتہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اسلام طبعی و اہلیتی دائرہ بندی اور صنفی ضروریات و وظائف کے امتیاز کی بنا پر عورتوں اور مردوں کو یکساں مواقع تعلیم فراہم کرنے کے باوجود دونوں کے نصاب تعلیم' اسالیب تعلیم اور مقاصد تعلیم میں تفریق و امتیاز ضروری قرار دیتا ہے' عورتوں کا نصاب تعلیم' طریق تعلیم اور مقصد تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو نسوانی زندگی اور نسوانی مقاصد حیات سے ہم آہنگ ہو۔

اقبالؒ کہتے ہیں: "مسلم خواتین کو صحیح مذہبی تعلیم حاصل ہونی چاہیے کیونکہ وہی قوم کی حقیقی معمار ہیں۔۔۔۔ ایسے تمام مضامین جن میں عورت کو نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے' احتیاط کے ساتھ تعلیم نسواں کے باب سے خارج کر دیئے جائیں"۔ بہر حال عورت کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے وہ دینی فرائض سے عہدہ برآئی' تمدنی مقاصد کی تکمیل اور عائلی وظائف کی ادائیگی میں سرخرو ہو سکے اور نسلِ نو کی عمدہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ قومی ترقی اور تہذیبی ارتقاء میں اپنا کردار ادا سکے کہ عورت کی گود انسانیت کا پہلا مکتب ہے۔

الام مدرستہ اذا اعددتھا
اعددت شعبا طیب الاعراق

ب: عمل (کام):

اسلام کا رجحان و مزاج یہ ہے کہ وہ تعطل و بے کاری اور رہبانیت وانقطاع کو پسند نہیں کرتا اور نہ ہی کسی فرد میں اُٹھنے والے زندگی اور حرکت و عمل کے داعیات کو دبانے یا مٹانے کی کوشش کرتا ہے‘ اس لیے وہ عورت کو گھر کے اندر اور گھر کے باہر پیشہ ورانہ یا غیر پیشہ ورانہ عمل انجام دینے کی بھرپور آزادی اور حق دیتا ہے‘ لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہوا اسلام صنفی اور اہلیتی امتیاز کی بناء پر مرد عورت کے دائرہ عمل میں تفریق کو فطری‘ تمدنی اور دینی ہر لحاظ سے ضروری سمجھتا ہے اس لیے عورت کو بنیادی طور سے گھریلو وظائف اور مرد کو خارجی اعمال کا پابند ٹھہراتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان تقسیم کار اور عمل کی دائرہ بندی فرماتے ہوئے حضرت علیؓ کے ذمہ خارجی کام اور حضرت فاطمہؓ کے حصے میں گھریلو اعمال ڈال کر یہ طے فرمادیا کہ عورت کو جو حریت کار اور مواقع عمل اسلام نے دیئے ہیں اور جن کی بعض مثالیں آگے ''حیثیت نسواں بعہد رسالت و خلافت'' کے بیان میں آئیں گی‘ ان سے فائدہ اُٹھانے کے لیے دو بنیادی شرطیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ عورت کا اصل دائرہ عمل گھر اور گھریلو ذمہ داریاں اور اعمال ہیں‘ اس لیے بغیر انتہائی ضرورت کے بیرون خانہ کے اشغال و اعمال کے لیے عارضی طور پر جائز ہیں۔ اور دوسری شرط یہ کہ وہ گھر کے اندر رہتے ہوئے یا عارضی طور سے بیرون خانہ بھی کچھ اعمال سر انجام دینا چاہتی ہے تو وہ اعمال اور ان میں مشغولیت ایسی ہونی چاہیے کہ عورت کے اصل فطری اعمال و وظائف کی باحسن وجوہ انجان دہی میں سہولت کے لیے اور خلل و اضطراب سے بچانے کے لیے بہت سے شرعی احکام مثلاً جنازہ میں شرکت‘ نماز جمعہ اور نماز باجماعت وغیرہ سے بھی مستثنیٰ قرار دیا ہے‘ اس سلسلہ میں پردہ یا حجاب کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے جس کی اُصولی وضاحت آگے آرہی ہے۔

ج: ملّی خدمات:

ملّی خدمات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ خدمات ہیں جن میں کسی نہ کسی شکل میں

حصہ لینا مرد و عورت کا مساوی اور مشترکہ دینی اور ملی فرض ہے جیسے اشاعت اسلام بموجب فرمان نبویؐ: "فلیبلغ الشاھد الغائب۔" اور فرمان باری تعالیٰ: "لیظھرہ علی الدین کلہ۔" اور اصلاح معاشرہ بموجب ارشاد خداوندی: "والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔" (الآیتہ) اور جہاد جب کہ ہر مسلمان پر فرض عین ہو جائے تو عورت بھی اس میں حصہ لینے کی شرعاً پابند ہے' اور قومی سطح پر مصالح خمسہ کی حفاظت و دفاع وغیرہ۔ اور دوسری قسم ان ملی اور تمدنی خدمات کی ہے جو حیات اجتماعی کی بقاء و ترقی کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہیں جیسے سیاسی' انتظامی اور عدالتی ولایات' اور علمی (سائنسی و تحقیقی و تدریسی) وفنی (صنعتی' تجارتی اور زرعی) خدمات وغیرہ۔ ان خدمات کفائیہ میں سے بعض تو ایسی ہیں جو عورت کے لیے کسی صورت جائز نہیں اور باقی خدمات کی بوقت ضرورت ادائیگی کی عورت کو اجازت دی گئی ہے' جیسا کہ اوپر استقلال شخصیت کے زیر عنوان اہلیت اجتماعی کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔ عورت کو عمل و تکمیل کے مساوی مواقع (اپنے دائرہ عمل میں) کی فراہمی سے پردہ حجاب کا مسئلہ ابھرتا ہے جس کی اصولی و اجمالی وضاحت یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے۔

حیثیت نسواں اور حجاب:

شریعت اسلامی پر مقصدیت اور مصلحیت اس قدر محیط ہے کہ کوئی بھی حکم مقاصد اور مصالح کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا' یہ ایک ایسی قطعی اور اٹل حقیقت ہے جو بے شمار ادلہ عقلیہ ونقلیہ کے استقراء سے یقین کی آخری حد تک ثابت ہو چکی ہے۔ بناء بریں تمام احکام شریعت اور بالخصوص معاشرتی احکام کی کوئی نہ کوئی بنیادی علت اور غایت ضرور ہوتی ہے جو اس حکم کا منشاء اور مدار قرار پاتی ہے اور وہ حکم متعلقہ علت اور مصلحت کی تحصیل و تکمیل کا ذریعہ ہوا کرتا ہے جس کی شرعی حیثیت (وجوب' ندب' اباحت' کراحت اور حرمت وغیرہ) اس علت اور مصلحت کے حوالہ سے طے ہوتی ہے۔

اس حقیقت کی روشنی میں پردہ یا حجاب کے شرعی حکم کو دیکھا جائے جو متعدد قرآنی آیات' بہت سی احادیث' بے شمار قیاسی دلائل اور اُمت کے مسلسل و متوارث اجماعی تعاملی کی

رو سے ایک دائمی اور غیر متغیر حکم شرعی کی حیثیت سے قطعیت اختیار کر لیتا ہے تو یہ صرف کسی ایک علت و مصلحت پر مبنی نہیں بلکہ اسلام کے مکمل نظام معاشرت تمام اغراض و مصالح کی تکمیل' بلکہ حیات انسانی کے پورے نظام اور شریعت کے مقاصد ضروریہ اساسیہ (دین' نفس' نسل' عقل اور مال) کے مجموعی تحفظ اور انہیں خلل و انحلال سے بچانے کے لیے جملہ احکام شرعیہ عملیہ کی خشت اول ٹھہرتا ہے۔

قدرت نے انسان کو تمام انواع مخلوق کی طرح ''زوجین'' یعنی دو ایسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب دائمی طبعی میلان رکھتی ہیں' انسان میں یہ صنفی میلان غیرہ محدود' غیر منضبط اور تمام دوسری انواع سے بڑھا ہوا ہے' پھر یہی نہیں کہ انسان کے جسم کے اندر صنفی تحریک پیدا کرنے والی قوتیں زیادہ شدید ہیں بلکہ باہر کی اس وسیع کائنات میں بھی ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہیں' اس صنفی میلان کو افراط وتفریط سے روک کر توسط و اعتدال کی حالت پر لانا اور منضبط کرنا ایک صالح تمدن کا اولین فریضہ ہے کیونکہ صنفی انتشار جسے قرآن نے ''فحش'' سے تعبیر کیا ہے۔ انسانیت' انسانی فرد اور انسانی سوسائٹی کے لیے سم قاتل ہے' اس مہلک علت کے انسداد کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں برے میلانات کے نشوونما دینے والی ہیجان انگیز تحریکات ناپید ہوں اور ایسی تمام صورتوں کا سدباب کر دیا جائے جو فحش یعنی بے حیائی کی تحریک و ترغیب دلانے والی ہوں' چنانچہ شریعت اسلامیہ نے اس خطرناک علت کی ممانعت کے لیے تعزیری احکام' انسدادی تدابیر اور اخلاقی و روحانی اور مادی قدروں پر مشتمل ایک مفصل پروگرام پیش کیا ہے جو ''نظام حجاب یا پردہ'' کہلاتا ہے' اس حجاب کی ہمہ گیر حدود قیود بقول قاری محمد طیبؒ ''نہ صرف معاشرت بلکہ عبادت اور نہ صرف عبادت' بلکہ باطن وقلب اور نہ صرف واقعات بلکہ احتمالات وخیالات اور نہ صرف زمانہ حیات بلکہ بعد الممات پر بھی چھائی ہوئی ہیں''۔

ثانیاً ۔ اسلامی معاشرہ میں حیثیتِ نسواں کا عملی تاریخی پہلو

چودہ صدیوں پر محیط اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں کے عملی اور تاریخی جائزہ سے بیشتر بلکہ اس جائزہ کی ضروری تمہید کے طور پر عمومی ملاحظات کی حیثیت سے حسب ذیل حقائق پر نظر رکھنا ضروری ہے:۔

(۱) عمومی ملاحظات:

ا:۔ حیثیت نسواں کے اس عملی و تاریخی جائزہ میں ہمارے پیش نظر اسلامی معاشرہ کی مجموعی' عمومی اور غالب حالت ہے' منتشر اور استثنائی حالات جو انسانی مزاج کے اختلافات اور ذاتی و سیاسی مفادات کی آویزشوں میں قدرتی طور سے ابھر آتے ہیں وہ معاشرہ کی مجموعی اور عمومی صورتحال کی عکاسی نہیں کرتے اور نہ ہی معاشرہ کے عمومی مزاج کی نفی کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کی ایجابی اور سلبی تناقضات کے ایک لازمی وفطری تقاضا کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کے مختلف ادوار مابعد رسالت میں خارجی اقوام سے معاشرتی امتزاج واختلاط اور سلاطین وامراء کی مطلق العنانیوں یا انفرادی واخلاقی انحرافات کے بعض مظاہر ایسے بھی نظر آتے ہیں جو حیثیت نسواں کے شرعی تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتے لیکن ساتھ ہی اسلامی تمدن و معاشرت کا اصل دینی مزاج ان منحرف عناصر سے نبرد آزما ہو کر انہیں مغلوب بھی کرتا رہا ہے اور ان کی تقویم وتہذیب بھی' اس لیے ہم زیر تسوید مضمون میں اسلامی معاشرہ کی مجموعی اور عمومی صورتحال اور مزاج ہی کی عکاسی کریں گے۔

اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے جسے کوئی انصاف پسند انسان جھٹلا نہیں سکتا کہ چودہ صدیوں پر محیط اسلامی معاشرہ کی تاریخ بحیثیت مجموعی ایک خدا پرست ملت کی شاندار تاریخ ہے جس کی منزل راہنما اور مشعل راہ ایک ہی ہے۔ اس کی منزل وصل الٰہی' راہنما رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشعل قرآن حکیم ہے اس لیے مسلمان معاشرہ پر ہمیشہ دینی اثر قائم رہا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور صحابہؓ کا عمل وتعامل اسکے

بنیادی نشانات تھے۔ ہر دور میں مسلمانوں نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ کسی خاص معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا تعامل کیا تھا چنانچہ مسلمانوں کا یہ تجسس ان کے تہذیبی مزاج کا ایک داخلی عنصر بن گیا جس نے دنیا میں سب سے پہلے سیرت' سوانح' حدیث اور ان سے متعلق بہت سے علوم وفنون کی ایجاد' تنظیم و ترتیب اور حفاظت واشاعت کا اعزاز مسلمان ملت کو بخشا۔

کسی قوم کی پوری منظم زندگی کو تمدن کہتے ہیں جس میں مذہب' سلطنت' بین الاقوامی تعلقات' ضابطہ وقانون اور رسوم ورواج سبھی شامل ہیں' مسلمان دین ہی کو کل زندگی مانتے تھے' اس لیے انہوں نے جو تمدن تشکیل دیا وہ بقول اقبالؒ: ''مذہب اسلام کی عملی صورت کا نام ہے اور ہماری تمدنی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اصول مذہب سے جدا ہو سکتا ہو''۔ کیونکہ دین اسلام عقائد عبادات اور معاملات کے علاوہ ایک ایسا مجلسی نظام اور طریق زندگی بھی رکھتا ہے جو ابدی اقدار کے مطابق متشکل ہو کر حیات اجتماعی کو ثبات و استقرار کو دولت سے مالا مال کرتا ہے بلکہ اقبالؒ کے نزدیک تو ''مذہب کی اصلی غایت ہی یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے''۔ اس لیے مسلمانوں کی تہذیبی اور تمدنی اور عمرانی زندگی کے ہر شعبہ کے مرکزی نقوش دین سے حاصل کیے گئے تھے اور اس کی داخلی روح ہمیشہ دینی ہی رہی۔ اگرچہ مسلمانوں کی فتوحات اور سلطنتوں کی وسعت اور مختلف اقوام کے اختلاط و امتزاج کے باعث اسلامی تمدن میں تنوع اور بوقلمونی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ مختلف اقوام اپنی منفرد عادات و تجارب' انداز تفکر اور جذبات و استعدادات اور ان سے مترشح ہونے والی مجموعی معاشرتی روش' نیز تاریخی' نسلی اور جغرافیائی عوامل کے پیش نظر اپنی زندگی اور نظم حیات کو اسلامی اقدار کے مطابق متشکل کرتے وقت داخلی فکری اشتراک اور بنیادی مقاصد و اعمال کی یکسانی کے باوصف خارجی مظاہر میں انفرادی تطبیقی رنگ اختیار کرتی رہی ہیں' تاہم اسلامی تمدن کا یہ تنوع اور بوقلمونی دین اسلام کی آفقیت و عالمگیریت کے عین مطابق تھی چنانچہ دین کی آفاقی روح نے شدید دینی حس کے بھروسے اقوام میں تمدنی وحدت پیدا کرنے میں بھرپور کامیابی

حاصل کی اور مسلمانوں کے تمام تمدنی مظاہر پر دین چار اطراف سے ازابتداء تا انتہاء حاوی رہا۔ اس سلسلہ میں مشہور مستشرق گستاؤلی بان کی یہ تصریح بڑی اہم ہے کہ: ''بلحاظ اس اثر کے جو اسلام نے مسلمانوں پر ڈالا ہے' یہ کسی مذہب سے درجہ میں کم نہیں ہے' وہ اقوام جنہیں احکام قرآنی کی ہدایت کی گئی' کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں آج بھی ان احکام کی اسی قدر پابندی کرتی ہیں جیسی انہوں نے تیرہ سو برس پہلے کی تھی۔

مشرقیوں (یعنی مسلمانوں) کی حالت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کی اس احکام مذہبی کی شدید پابندی کو ہمیشہ مدنظر رکھیں' مذہب جس کا ہم پر اس قدر کم اثر ہے' ان پر بے انتہاء غالب ہے اور اسی مذہب کے ذریعہ سے ان میں جوش پیدا کیا جا سکتا ہے

III- اوپر جو حقیقت بیان ہوئی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرہ کے ہر دور میں ایک عمومی اور مجموعی مزاج غالب رہا جو ہمیشہ دینی اور اسلامی ہی رہا' اس مجموعی دینی مزاج کے چند نمایاں خصائص و (تشکیلی' نصب العینی اور کرداری) ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں' آگے بڑھنے سے پیشتر انہیں ذہن میں مستحضر کر لینا ضروری ہے' یہ امتیازات بالاختصار وحدت دین و ایمان پر تشکیل' زمانی و مکانی حدود سے ماورائیت' ایمانی قواعد پر پائیدار اور مستقل تنظیم' ایمانی تقاضوں کی تکمیل' دین کی سیادت و اشاعت' انسانیت کی خدمت و اصلاح' جملہ افراد و طبقات کے مصالح خمسہ کی حفاظت یکسانی فکر و عمل' احترام انسانیت' مساوات حریت اور توازن وغیرہ ہیں۔

IV- بحیثیت قوم اور ملت کے ہر قوم کی قومیت کسی انفرادی یا امتیازی فارم کی ازحد محتاج ہوتی ہے اور ہر قوم کا تمدن وحدت و تنظیم پیدا کرنے کے لیے ایک خاص اجتماعی فارم (SOCIAL FORM) پر اصرار کرتا ہے' حساس اور قاہر اقوام میں یہ انفرادی فارم غیر شعوری طور پر از خود پیدا ہو جایا کرتی ہے' اسلام نے اگرچہ کوئی مخصوص تمدنی فارم مقرر یا تجویز نہیں کی تاہم مسلمانوں کے خاص طرز فکر' مخصوص اسلوب حیات اور اسلامی معاشرہ کے مذکورہ بالا خصائص و امتیازات کے سبب یا

متواتر (ASSOCIATION) کے ذریعہ مجلسی روابط کا ایک مرکزی خاکہ اور ایک (STANDARD FORM) یا معیار طرز حیات وجود میں آ گیا تھا' جو صدیوں میں پختہ ہو کر ایک ہمہ گیر کلچر کا روپ دھار گیا۔

7۔ یہ گمان درست نہیں کہ موثرات زندگی اور تمدنی نظامات زمانہ جو تغیر سے بسرعت بدلتے رہتے ہیں اس لیے مسلمانوں کے معاشرتی نظام اور تمدنی فارم میں بھی عصری تغیرات کے باعث انقلاب آتے رہے ہیں جن کا اثر معاشرہ میں حیثیت نسواں پر بھی پڑتا رہا' کیونکہ اسلامی معاشرہ کا مجموعی دینی مزاج اور تشکیلی' غایتی اور کردار خصائص ہمیشہ سے ثبات واستقلال اور پختگی و پائیداری کے آئینہ دار رہے ہیں' اس سلسلہ میں مغربی مورخ گستاؤلی بان کے پرزور اعتراف کے بعد کسی اور خارجی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی وہ کہتا ہے: ''اقوام مغربی کے تمدن میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تغیرات نہایت سرعت کے ساتھ ہوتے ہیں البتہ وہاں بھی متوسط اور ادنیٰ مدارج قومی میں زمانہ بہت کم تغیرات پیدا کرتا ہے۔۔۔ مگر بمقابل اقوام یورپ کے عرب (مسلمان) ایک صدی سے دوسری صدی تک بہت کم بدلتے ہیں' ان کی مستقل حالت فقط اس وجہ سے قائم ہے کہ ان کے قرآن میں ضوابط مذہبی وملی ومعاشرتی ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور قرآن کی عدم تبدیلی کا اثر ان کی کل معاشرت پر پڑ رہا ہے۔۔۔ عربوں کی عادات واوضاع کا اکثر حصہ زمانہ دراز سے اس درجہ مقرر اور منضبط ہو گیا تھا کہ اس میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہ ہوا اور اس وجہ سے عربوں کی حالت موجودہ کے مطالعہ سے حالت ماضیہ کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے مقام پر وہ رقمطراز ہے: ''مشرقیوں کے نظامات کا استواری۔۔۔ اور کل طبقات معاشرہ میں استحکام کا پایا جانا یورپ کی بے چینی اور بیقرار زندگی اور مختلف طبقات کی باہمی رقابت اور تقادت کے بالکل خلاف ہے۔ اس بنا پر وہ دعویٰ کرتا ہے کہ: ''حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ایک دیہاتی عرب (بطور مثال) اور اس سے بھی زیادہ اس زمانہ کے ایک بدوی میں اور ان

دونوں کی موجودہ اولاد میں بہت ہی کم فرق ہونا چاہیے اور ہے"

VI۔ مذکورہ بالا امور کی روشنی میں اسلامی معاشرہ کے مختلف ادوار میں حیثیت نسواں کے بارے میں حسب ذیل بنیادی' عمومی اور اجمالی حقائق سامنے آتے ہیں:۔

(الف) چونکہ اسلامی معاشرہ ہر دور میں جملہ مظاہر تمدن و معاشرت میں اسلامی احکام کا مجموعی اور عمومی لحاظ سے پابند رہا ہے اس لیے اسلامی تعلیمات کی رو سے عورت کو جو عائلی اجتماعی اور تمدنی حقوق' شخصی استقلال (اپنے تمام مظاہر اہلیت وحریت اور مسئولیت کے ساتھ) صنفی رعایات اور تکمیل و ترقی کے مساوی مواقع (اپنے دائرہ عمل میں) میسر ہیں اور جن کا مفصل بیان اوپر ہو چکا ہے' وہ سب کے سب اسے ہر دور میں بحیثیت مجموعی حاصل اور ارزاں رہے ہیں' جیسا کہ بالتفصیل آگے آرہا ہے' البتہ اگر ان حقوق کے استعمال اور علمی و عملی مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی مثالیں کم نظر آتی ہوں تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ تاریخ کسی دور کا ہر واقعہ اپنی تفصیلات سمیت محفوظ نہیں رکھ سکتی بلکہ عموماً مقتدر' متمول اور اعلیٰ افراد و طبقات کی زندگیوں اور حالات کی مجموعی عکاسی کرتی ہے اس لیے عوامی زندگی کے بہت سے پہلو مخفی رہ جاتے ہیں اور اگر واقعی کسی دور میں ان حقوق سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا تو اس میں طبقہ نسواں کی کوتاہی' تساہل اور تغافل کے علاوہ ان کے طبعی اور بنیادی فرائض کی تکمیل میں انہماک اور بعض اوقات حالات کی ناسازگاری مثلاً ملت کا مجموعی ادبار و انحطاط یا عارضی اضطراب وغیرہ ایسے اسباب کا دخل ہے جسے اسلامی معاشرہ میں حیثیت نسواں کی مجموعی رفعت و عظمت کے بالمقابل کوئی وقعت حاصل نہیں۔

(ب) اسلامی معاشرہ کے مختلف ادوار میں عورت کو جو حقوق اور مواقع حاصل رہے ان کے استعمال اور استفادہ کا دائرہ عملاً کبھی وسیع و غیر محدود رہا اور کبھی سمٹ کر محدود ہو جاتا رہا۔ اس وسعت و محدودیت کا اصل انحصار خود عورت کی انفرادی صلاحیتوں کی جلا یا فتگی' تعلیمی و تربیتی بالیدگی اور فنی و عملی مہارت پر رہا ہے اس لیے معاشرہ کے رویہ پر منحصر ٹھہرا کہ عورتوں کی حیثیت گھٹانے کا الزام معاشرہ کو

نہیں دیا جاسکتا۔

(ج) اسلامی معاشرہ کی تہذیبی روح (RESTRAINT) یعنی ضبط و انضباط ہے' یہ انضباط اور رکھ رکھاؤ ہر دور میں اور ہر معاملہ میں قائم رہا ہے اور اس سے معاشرت کے اسلامی آداب پیدا ہوئے ہیں جن میں آزادی بھی ہے اور قید بھی' اور یہی معاشرتی پابندیاں ہیں جو اسلامی معاشرہ کی تمدنی فارم میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پاگل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے

اسی منفرد اسلامی تمدنی فارم کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے کسی دور میں کہیں بھی بے حیائی' برہنگی اور عام صنفی اختلاط کو گوارا نہیں کیا اور اسی کے باعث مسلم معاشرہ میں یہ خاص قوت موجود تھی کہ وہ غیر اخلاقی' اجنبی اور نامانوس عناصر کی کراہت اور اجنبیت کو بہت جلد دور کر لیتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان سوسائٹی میں عورت کا احترام ہمیشہ رہا اور اسے تمام حقوق اور علمی و عملی ترقی کے مواقع بھی برابر حاصل رہے مگر اسلامی تہذیب کی چھاپ عموماً مردانہ ہی رہی ہے۔

ان عمومی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ہم اسلامی معاشرہ کے مختلف ادوار میں حیثیت نسواں کے مذکورۃ الصدر مفہوم کی روشنی میں عورت کے مقام و کردار کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لیں گے۔

(۲) اسلامی معاشرہ کے دورِ اوّل میں حیثیتِ نسواں:

اسلامی معاشرہ کے دور اول سے مراد عہد رسالتؐ اور دور صحابہ کرامؓ ہے اور چونکہ یہ عہد تشریعی دور ہے' بایں طور کہ سنتِ صحابہؓ کو بھی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بطور تمہ و ضمیمہ کے شامل کیا گیا ہے' جیسا کہ عظیم اندلسی عالم امام شاطبیؒ نے تصریح کی ہے کہ:

"ویطلق ایضاً لفظ السنة علیٰ 'ما عمل علیه الصحابةؓ وجد ذٰلک فی الکتاب او السنته اولم یوجد لکونه اتباعا لسنة ثبتت عندھم لم تنقل الینا و

اجتهاداً مجتمعاً عليه منهم او من خلفاء هم ...ويدل على هٰذا الاطلاق قوله عليه الصّلوٰة والسلام: "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين". واذاجمع ماتقدم تحصل منه الاطلاق اربعة اوجه: قوله عليه الصلوٰة والسلام و فعله واقراره.... هٰذه ثلاثة والرابع ماجاء عن الصحابة او الخلفا"۔ اس لیے اس پاکیزہ عہد میں حیثیت نسواں کے تمام مظاہر ادوار مابعد میں اسلامی معاشرہ کے لیے نشانات راہ بلکہ احکام و تعلیمات شرعیہ کی حیثیت رکھتے ہیں' البتہ شریعت چوں کہ مقصدیت اور ملیت کا غلبہ ہے لہذا اس دور کے تمام احکام و مظاہر کو صرف حرفیت پرستی اور ظاہری شکل و صورت پر انحصار کے ساتھ قبول کرنا اور دلیل شرعی بنانا درست نہ ہوگا بلکہ ہر حکم اور معاملہ کو اس کے مقصد و غایت اور حکمت و علت کے ساتھ دیکھنا ہوگا' مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مساجد میں نماز کے لیے آنے سے منع نہیں فرمایا کیونکہ نفوس اس قدر پاکیزہ تھے کہ عورتیں شرافت و حیا کا مجسمہ بنی' عفت و عصمت کے تحفظ کا پورا اہتمام کر کے گھر سے باہر نکلتی تھیں مگر عہد صحابہؓ کے آخری دور میں جب نوخیز عورتوں کو اس اہتمام و تقدس کے بغیر گھر سے باہر نکلتے دیکھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا": اگر رسول اللہ صلی علیہ وسلم عورتوں کو موجودہ حالت دیکھتے تو انہیں مساجد میں آنے سے منع فرمادیتے"۔ حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد حقیقت بنیاد سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے عورتوں کے معاملات اور معاشرتی اختلاط سے متعلق مسائل کے بارے میں یہ قاعدہ وضع کر کے احکام کا استخراج کیا کہ:" پرفتن احوال میں تحفظ عفت و عصمت کے احکام و آداب شدید تر ہو جاتے ہیں' بہر آئینہ اسلامی معاشرہ کے اس پاکیزہ دور میں حیثیت نسواں کے طے شدہ مفہوم کی روشنی میں حسب ذیل مظاہر نمایاں تھے:۔

(۱) حقوق نسواں:

گذشتہ صفحات میں اسلام کے عطا کردہ حقوق نسواں عائلی اور اجتماعی سطح پر بیان ہوئے وہ سب کے سب اسلامی معاشرہ کے دور اول میں عورتوں کو باکمل وجوہ میسر تھے بلکہ اسلام کی طرف سے عورتوں کو ان حقوق کی ارزانی کی بنیادی عہد رسالتؐ و صحابہؓ کی واقعی اور

عملی کیفیت ہے کیونکہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر عورت کو معاشرہ میں کوئی استحقاق و مقام حاصل نہ تھا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو ذلت و پستی سے نکال کر مرد کے برابر مقام دیا اور اس کے قانونی حقوق مقرر فرمائے' ذیل میں چند واقعات بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:۔

عورت کے عائلی حقوق:

دنیا کا سارا کارخانہ انسانی حقوق و فرائض کی تعین اور انکے تحفظ پر قائم ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرہ کی تشکیل فرمائی تو ہر فرد کے تعین حقوق و فرائض کے علاوہ عائلی زندگی کے مقاصد و احکام کی خصوصی وضاحت اپنے عمل مبارک سے فرمائی جس سے عورتوں کے جملہ عائلی حقوق سامنے آ گئے' اور خاندانی زندگی کی فضا پاکیزگی' محبت' اخلاص اور سکون و استقرار کی آئینہ دار بن گئی کیوں کہ اس وضاحت کی رو سے عورت گھر کی سرپرست (ماں)' برکت (بہن) ملکہ (عورت) اور سعادت و نجات (بیٹی) ہے۔

ماں کی حیثیت سے:

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ماں کو یاد فرماتے تو آبدیدہ ہو جاتے' رضاعی ماں حضرت حلیمہؓ تشریف لاتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بیٹھنے کے لیے چادر بچھا دیتے' کنیز اُم ایمنؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مادرانہ خدمت کی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھتے تو اُمّی کہہ کہ پکارتے اور فرماتے یہ میرے گھرانے کا بقیہ ہیں۔
ایک بار ام ایمنؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی نوش فرماتے دیکھ کر کہا مجھے بھی پانی پلایئے' حضرت عائشہؓ بولیں کیا تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کہتی ہو؟ اُم ایمنؓ نے جواب دیا تم نے مجھ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت نہیں کی! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ سچ کہتی ہیں اور انہیں پانی پلایا''۔

اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک کنیز کے مادرانہ خدمت کرنے پر محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کس قدر عظیم مرتبہ و مقام دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ اپنی ماں

سے انتہائی عزت واحترام اور سلوک سے پیش آتے۔ ایک صحابی کے جھلساتی دھوپ میں تپتی ریت اور پتھروں پر اپنی ماں کو کندھوں پر اُٹھا کر سفر کرنے کا واقعہ پیچھے بیان ہوا ہے۔ ایک اور صحابی نے ایک باغ عمر بھر کے لیے اپنی ماں کے لیے وقف کر دیا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ماں کے قدموں تلے جنت اور اس کا مرتبہ باپ سے سہ گنا ہے۔ چنانچہ ایک عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میرا شوہر لڑکے کو چھین لینا چاہتا ہے حالانکہ وہ میری خدمت کرتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکے سے کہا' یہ تمہارا باپ ہے اور یہ تمہاری ماں' جس کا ہاتھ چاہو پکڑ لو لڑکے نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہیں سے اسلامی معاشرہ کے عہدِ اوّل میں ماں کی عظمت وحیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بیوی کی حیثیت سے:

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ بیوی سے حُسنِ سلوک کی سخت تاکید فرمائی بلکہ ازواج مطہرات کے ساتھ بہترین برتاؤ فرما کرامت کے لیے درخشاں مثال قائم فرمادی' ارشاد پاک ہے: "خیر کم خیر کم لا هله و انا خیر کم لا هلی"۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کی دلجوئی فرماتے حتیٰ کہ ان کی خوشنودی کی خاطر شہد اپنے اوپر حرام کر لیا' جس پر یہ دائمی تحسین ومدح نازل ہوئی کہ "تبتغی مرضات ازواجک": اس ارشاد باری میں حیثیت نسواں کے جاہلی اور اسلامی تصور کا بعد المشرقین اور صنف نازک پر حضور رحمۃ للعالمین کا بے پایاں احسان اجاگر کیا جارہا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ کبھی دوڑ لگا رہے ہیں اور کبھی ام المومنین کو حبشیوں کے کھیل تفریح سے محظوظ فرما رہے ہیں' یہی نہیں گھر کے کام کاج میں امہات المومنین کا ہاتھ بھی بٹاتے ہیں۔ طبرانی وغیرہ میں روایت ہے' حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: "کان النبی صلے اللہ علیه وسلم یشیل هذا ویحط هذا' ویخدم فی مہنة اهله ویقطع لهن اللحم و یقسم البیت (یکنسه) ویعین الخادم فی خدمته"۔ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کو یاد کرتے تو آبدیدہ ہو جاتے' ان کی سہیلیوں کی بہت

قدر فرمایا کرتے' جب کبھی بکری ذبح کرتے تو ان کے گھروں میں بھجواتے تھے' ازواج مطہرات کی نازک مزاجیاں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ حضورؐ سے بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں' صدیق اکبرؓ آئے' غصہ میں بیٹی کو تھپڑ مارنے لگے تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے بیچ میں آ کر بچا لیا۔ آپؐ نے اپنے عمل پاک کے ذریعہ بیوی کا مقام اِس قدر بلند کر دیا کہ بقول حضرت فاروق اعظمؓ ''اسلام سے پہلے عورتوں کو کچھ نہیں سمجھا جاتا تھا۔'' اسلام نے وہ عظمت دی کہ ایک بار میں نے بیوی کو ڈانٹا تو اس نے برابر کے جواب دیئے۔'' یہی عمرؓ بن خطاب فرمایا کرتے۔ ''ینبغی للرجل ان یکون فی اھلہ کالصبی' فاذا کان فی القوم کان رجلاً۔'' یعنی انسان کو چاہیے حسن معاشرت و ملاطفت میں بیوی کے ساتھ بچے کی طرح رہے اور بیرون خانہ مردانہ وار۔ آقائے کائنات کی تعلیمات کا اثر تھا کہ صحابہ کرامؓ اپنی بیویوں سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ اپنی بیوی کو اس قدر چاہتے تھے کہ والد کی تاکید کے باوجود طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعت والدین کے خیال سے طلاق کا حکم دیا۔ ایک بار سفر میں تھے' زوجہ کی بیماری کا علم ہوا' انتہائی تیز رفتاری سے کام کیا اور عشاء و مغرب کی نماز کو ایک ساتھ جمع کیا۔

حضرت عبداللہؓ بن ابوبکرؓ کو اپنی بیوی عاتکہؓ سے اس قدر محبت تھی کہ جہاد تک ترک کر دیا تھا' صحابہ کرامؓ حج سے واپس آ رہے تھے' ذوالحلیفہ کے مقام پر حضرت اسید بن حضیرؓ کو بیوی کے انتقال کی خبر ملی تو منہ ڈھانپ کر رونے لگے' اس محبت کے باعث صحابہ کرامؓ بیویوں کے حق صحبت کا اس قدر لحاظ رکھتے تھے کہ ان کی درشت خوئی بھی گوارا تھی۔ حضرت لقیط بن صبرہؓ نے بارگاہ رسالت میں بیوی کی بدزبانی کی شکایت کی مگر مدت کی رفاقت کے لحاظ سے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اسلام نے عورت کو ذلت و رسوائی کے مقام سے اس قدر تیزی سے اُٹھا کر حقوق و مراعات سے نوازا کہ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں: ''کنا نتقی الکلام والانبساط الیٰ نساء نا علیٰ عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم تکلمنا وانبسطنا''۔ یعنی عہد رسالت میں ہم عورتوں (بیویوں) سے گفتگو میں

بے تکلفی برتتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ہمارے متعلق کوئی حکم نہ نازل ہو جائے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (انقطاع وحی) کے بعد ہم ان کے ساتھ بے تکلف رہنے لگے۔

بیٹی کی حیثیت سے:

اہل جاہلیت بیٹی کو غیرت کے باعث یا رزق کے خوف سے یا محض ناپسندیدگی کی بناء پر زندہ درگور کر دیا کرتے اور اس کی پیدائش پر چیں بہ جبیں ہوتے' مگر قربان جائیں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ پر' جس کی برکت سے ذہن وفکر اور رسوم واطوار بدل گئے' بیٹی کی ولادت کو منحوس سمجھنے والے اسے برکت وسعادت' دنیوی اور نجات اخروی کا ذریعہ گردانے لگے اور ایک دوسرے کو بیٹی کی ولادت پر تہنیت ومبارکباد دینے لگے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بیٹیوں کی پرورش وتربیت ایک شفیق باپ کی حیثیت سے اس عمدہ اور بہترین طریقہ سے کی کہ ان کی زندگی کا ہر پہلو دنیا بھر کی عورتوں کے لیے قابل تقلید ٹھہرا' چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ کی ایسی تربیت فرمائی کہ ان کی ذات میں وہ تمام قدسی صفات مجتمع ہو گئیں جو انسان کے مثالی کمال کی آئینہ دار ہیں۔ اس حسن تربیت کا نتیجہ تھا کہ حضرت عائشہؓ ایسی زیرک اور ذہین وفطین ہستی نے بھی اعتراف کیا کہ جناب فاطمۃ الزہراؓ سب عورتوں سے بڑھ کر دانا ہیں۔ آپؓ کا قول ہے کہ طرز کلام' اسلوب گفتگو' خضوع وخشوع' حسن خلق اور وقار ومتانت میں حضرت فاطمہؓ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ کوئی نہ تھا' رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صاحبزادیوں سے بے پناہ محبت تھی' حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے اور اپنی جگہ ان کو دیتے' نواسیوں سے بھی ازحد پیار کرتے اپنی ایک نواسی کو عالم نزع میں دیکھا تو آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے' صحابہؓ کے پوچھنے پر فرمایا یہ خدا کا رحم ہے جو وہ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاکیزہ اُسوۂ مبارکہ کی تاثیر تھی کہ صحابہ کرامؓ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان محبت وشفقت میں' تربیت وتعلیم میں اور حسن معاملہ میں' حتیٰ کہ التفات قلب ونظر میں بھی مساوات برتتے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ بیمار ہوئیں حضرت

ابوبکرؓ آئے، حال پوچھا اور فرطِ محبت سے منہ چوم لیا۔ ایک عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی اُس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں، حضرت عائشہؓ کے پاس فقط ایک کھجور تھی، وہی دے دی، اُس عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کر کے بچیوں میں بانٹ دیئے اور چلی گئی۔ حضرت ام المومنینؓ نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ بیان کیا تو فرمایا جو شخص بچیوں کی آزمائش میں ڈالا گیا اور اُس نے اُن سے اچھا سلوک کیا تو وہ اُس کو اور دوزخ کے درمیان پردہ ہوں گی۔

صحابہ کرامؓ بچیوں کی چارہ گری اور پرورش کو اپنے لیے سرمائیہ حیات تصور کرتے تھے، حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد ان کی بیٹی کی کفالت کے تین دعویدار پیدا ہوئے، حضرت علیؓ نے کہا یہ میری چچازاد بہن ہے لہٰذا میں اس کی پرورش کا حقدار ہوں، حضرت جعفرؓ بولے میں زیادہ حقدار ہوں کہ میری چچازاد ہونے کے علاوہ اس کی خالہ بھی میرے عقد میں ہے، حضرت زیدؓ انصاری نے جو حضرت حمزہؓ کے دینی بھائی تھے تقاضا کیا کہ یہ میری بھتیجی ہے اور چچا سے بڑھ کر اس کی تربیت کا حق کسے پہنچتا ہے۔

بہن کی حیثیت سے:

بہن کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کے دور اول میں عورت کا عظمت و وقعت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ حضرت جابرؓ باوجود نوجوان ہونے کے بیوہ عورت سے شادی کی تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے پر عرض کی: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! **ان ابی قتل یوم أحد و ترک تسع بنات ... کن لی تسع اخوات فکرهت ان اجمع الیهن جاریته خرقاء مثلهن و لکن امراة تمشطهن و تقوم علیهن، قال صلی الله علیه وسلم اصبیت.**" یعنی میرے والد اُحد میں شہید ہو گئے اور میری نو بہنیں چھوڑ گئے تو میں نے ان کی احسن تربیت اور نگہبانی کے لیے تجربہ کار عورت سے شادی مناسب سمجھی۔

سُبحان اللہ! کتنا ایثار و اخلاص ہے کہ اپنی جوانی، اُمنگیں اور زندگی بھر کے ارمان اپنی بہنوں پہ نچھاور کر دیئے۔

عورت کے اجتماعی حقوق:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحات عورتوں کے حق میں آیہ رحمت بن کر آئیں' آپؐ کی تعلیمات نے عورتوں کو تمام بنیادی انسانی حقوق' زندگی کی اساسی ضرورتوں اور کفالتوں میں عملی حیثیت سے مردوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ امیر علیؒ کہتے ہیں: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آئینی نظام میں عورتوں کو ایسے حقوق عطا کئے جو اس سے پہلے انہیں کبھی نصیب نہ ہوئے تھے آپؐ نے انہیں ایسی ایسی مراعات بخشیں جن کی قدر شناسی زمانہ کچھ اور ترقی کرنے کے بعد کرے گا' آپؐ نے تمام قانونی اختیارات و وظائف میں عورتوں کو مردوں کے برابر مرتبہ بخشا''۔

عورت کے بنیادی اجتماعی حق مصالح خمسہ یعنی دین' نفس' آبرو' عقل اور مال کی حفاظت کے واقعات سے تو اسلامی معاشرہ کے دور اول کی تاریخ بھری پڑی ہے' یہاں صرف ایک ہی واقعہ کا ذکر کافی ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس پاکیزہ دور میں عورت کی حرمت و تقدس کا کس قدر احترام تھا''۔ صحاح میں آیا ہے کہ ایک مسلمان عورت بنی قینقاع کے بازار میں کسی کام سے گئی' نقاب اوڑھے ہوئے تھی' ایک یہودی نے اس کی راہ روک کر استہزاء کیا' پھر اس لعین نے اس خاتون کو بے حجاب کرنے کی کوشش کی تو وہ مدد کو چلائی' فوراً ایک مسلمان دوڑا آیا اور اس مسلمان عورت کی آبرو و تقدس کے دفاع میں ملعون یہودی کو قتل کر دیا''۔

اسلامی معاشرہ نے عورت کو جو حقوق و رعایات عطا کیے تھے۔ ان سے وہ بھرپور فائدہ اٹھاتی تھی اور جہاں کہیں حقوق تلف ہوتے دیکھیں تو اُن کے تحفظ کے لیے پوری جدوجہد کرتی تھیں۔ چنانچہ جب عورتوں کو اپنے شوہروں سے شکایت پیدا ہوتی تو وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت حاضر ہو کر اپنا دکھ درد کہتی تھیں۔ اور حضرت عائشہؓ بارگاہِ رسول ﷺ میں نہایت پُر زور سفارش کرتی تھیں جیسا کہ بعض واقعات سے عیاں ہے' بخاری شریف میں آتا ہے۔

والنساء ینصر بعضھن بعضا'' یہ نصرت روزمرہ کاموں کے علاوہ ایک

دوسرے کے حقوق کے تحفظ میں بھی ہوا کرتی ہے۔

ابن ماجہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں پر دست درازی کی عام ممانعت فرمادی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے شکایت کی کہ عورتیں بہت شوخ ہوگئی ہیں ان کو مطیع کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے' آپؐ نے اجازت دے دی' لوگ نہ معلوم کب سے بھرے بیٹھے تھے' جس روز اجازت ملی اُسی روز ستر عورتیں اپنے گھروں میں پٹی گئیں' دُوسرے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر فریادی عورتوں کا ہجوم ہوگیا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع فرما کر خطبہ دیا اور فرمایا: "**لقد طاف الليل بآل محمد سبعون امراة كل امراة تشتكي زوجها فلا تجدون أُولئك خياركم**"۔ یعنی آج ستر عورتوں نے اپنے شوہروں کی شکایت کی ہے جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے وہ تم میں ہرگز اچھے لوگ نہیں ہیں۔۔ اسے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عہدِ رسالتؐ وصحابہؓ میں عورتیں اپنے حقوق کی کس طرح حفاظت کرتی تھیں۔

(۲) استقلال شخصیت دور اول میں:

استقلال شخصیت کے مظاہر' جیسا کہ پہلے بیان ہوا' تین ہیں' اہلیت' حریت اور مسئولیت اسلامی معاشرہ کے دورِ اول میں ان مظاہر استقلال کی ہلکی سی جھلک پیش خدمت ہے:۔

عہد رسالت میں عورتوں کے استقلال اہلیت ومسئولیت کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے قبولِ اسلام کی الگ بیعت لیتے تھے اور صرف مردوں کیطبیعت میں ان کی حلقہ بگوشی اسلام کو کافی نہ سمجھتے تھے' جیسا کہ ارشاد خداوندی: "**يـآيها النبي اذا جاءك المؤمنات يبايعنك**.... الخ (الآیتہ) سے عیاں ہے' اور اس سلسلہ میں عورتیں پوری آزادی کے ساتھ بیعت کے تقاضوں اور احکام اسلامی کے بارے میں پوچھا کرتی تھیں' چنانچہ ہند بنت عتبہ نے فتح مکہ کے موقع پر قبول اسلام کی بیعت کرتے وقت نہایت دلیری سے باتیں کیں اور پوچھا یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہم سے کن باتوں کا اقرار لیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا' خدا کے ساتھ کسی کو

شریک نہ کرنا، ہند بولیں، یہ اقرار آپ نے مردوں سے نہیں لیا لیکن بہرحال ہم کو منظور ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا اولاد کو قتل نہ کرنا، تو ہند نے دلیری سے کہا: "ربیناهم صغارا و قتلتهم کبارا أفانت وهم اعلم"۔ یعنی ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا، بڑے ہوئے تو بدر میں آپؐ نے اُن کو مار ڈالا، اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں، اس دیدہ دلیری کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم! اس سے پہلے آپؐ کے خیمہ سے زیادہ میرے نزدیک کوئی مبغوض خیمہ نہ تھا لیکن اب آپؐ کے خیمہ سے زیادہ کوئی خیمہ میرے نزدیک محبوب نہیں ہے۔

اہلیت اجتماعی کی انتہا یہ کہ فتح مکہؓ کے دن ام ہانیؓ نے ایک مشرک کو پناہ دے دی، حضرت علیؓ نے اسے قتل کرنا چاہا، ام ہانیؓ نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے عرض کی تو فرمایا: "اجرنا من اجرت یا اُم ھانی"۔ یعنی اے ام ہانی جسے تم نے پناہ دی ہے وہ ہماری امان میں ہے کیوں کہ المسلمون تتکا ناء دماء هم یسعیٰ بذ متهم ادناهم۔

حریت نسواں کے سلسلہ میں عورت کے ذاتی مسائل مثلاً نکاح، خلع وغیرہ میں تو اس کی رائے کی قوت طے شدہ حق تھا۔ حضرت خنساء بنت جذام بیوہ ہو گئیں تو ان کے والد نے کسی شخص سے ان کا نکاح کر دیا، وہ اس نکاح سے ناخوش تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں آپؐ نے نکاح کو مسترد کر دیا۔ ایک صاحب نے اپنی لڑکی کا نکاح مالدار شخص سے کر دیا، لڑکی کو ناپسند تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: "ان ابی زوجنی ابن اخیه یرفع بی خسیسه"۔ یعنی میرے والد نے مجھے پھنسا کر اپنی کشائش کا سامان کرنا چاہا ہے، آپؐ نے فرمایا اگر تجھے یہ عقد پسند نہیں تو تو آزاد ہے، بولی: "قد اجزت ما صنع ابی ولکن اردت ان تعلم النسآء ان لیس للاٰباء من الامر شی۔" یعنی میں اس عقد کو قبول کرتی ہوں مگر میں نے اس لیے پوچھا تا کہ عورتیں یہ جان لیں کہ والدین کو ان کی مرضی کے خلاف ان پر کوئی تسلط حاصل نہیں۔ اسی طرح بریرہؓ کا مغیث نامی غلام سے نکاح کا معاملہ ہے کہ آزادی کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش کے باوجود اس سے نکاح قبول نہیں کرتی۔

عورتوں کو اس قدر حریت فکر سے نوازا گیا اور ان کی رائے کو اس قدر وقعت دی گئی

کہ بڑے اہم معاملات میں بھی ان سے مشورہ لیا جاتا۔ حضرت حسن بصریؒ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ بیان کرتے ہیں کہ ": کان النبی صلی اللہ علیه وسلم یستشیر حتی المراۃ فتشیر علیه بالتی فیا خذ به"۔ یعنی رسول اللہ صلی علیہ وسلم عورتوں سے بھی مشورہ لیا کرتے اور ان کی صائب رائے قبول بھی فرمایا کرتے۔

چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب صحابہؓ شرائط صلح پر افسوس و حیرت کے باعث احرام کھولنے پر آمادہ نہ تھے، تو حضرت ام سلمہؓ کے مشورہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھولا تو صحابہ بھی آپ کی پیروی میں احرام کھولنے لگے۔ جنازہ کی موجودہ شکل کو حضرت اسماءؓ بنت عمیس کی رائے سے جاری کئے جانے کی روایت پیچھے گزر چکی ہے۔ خلفائے راشدین بھی خواتین سے مشورہ لیا کرتے تھے، ابن سیرینؒ حضرت عمرؓ کے بارے میں کہتے ہیں": انه کان یستشیر فی الامر حتیٰ انه کان یستشیر المراۃ فربما ابصر فی قولها لشئی یستحسنه فیا خذبه "۔ یعنی فاروق اعظم عورتوں سے بھی مشورہ لیتے اور ان کی پسندیدہ بات کو قبول فرما لیتے۔ چنانچہ حضرت شفاءؓ بنت عبداللہ کے تذکرہ میں ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:" کانت من عقلاط النساء و فضلاﺋﮩﻦ و کان عمرؓ یقد مهافی الرای ویر ضا ها و یفضلها "۔ یعنی حضرت عمرؓ شفاءؓ بنت عبداللہ کو رائے اور مشورہ میں مقدم رکھا کرتے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت عثمانؓ کے بارے میں کہا تھا کہ وہ ہم سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

(۴) خصوصی صنفی رعایات:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بنیادی عنصر عورتوں کا احترام تھا۔ عورت، جسے مشرق مرد کیدامن تقدس کا داغ، روما گھر کا اثاثہ، یونان شیطانی تخلیق، تورات لعنت ابدی کا مستحق اور کلیسا باغِ انسانیت کا کانٹا تصور کرتا ہے، اسلام میں نسیم اخلاق کی نکہت اور چہرہ انسانیت کا غازہ قرار پاتی ہے۔ اوپر سید امیر علی کا یہ قول گذرا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو ایسی ایسی خصوصی رعایات بخشیں جن کی قدر شناسی زمانہ کچھ اور ترقی کرنے کے بعد کرے گا۔ اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے احترام کو اسوۂ اسلامیہ میں شامل

فرمایا' چنانچہ وہ عورت جسے دنیا منبع معصیت اور مجسم پاپ سمجھتی تھی آپؐ نے اس قدر افزائی یوں فرمائی: "حبب الی من الدنیا النساء و الطیب و جعلت قرة عینی فی الصلوٰة" ۔یعنی عورت سے نفرت اور نفاست سے بیزاری خدا پرستی کی دلیل نہیں آدمی عورت سے پسندیدہ تعلقات رکھنے کے باوجود خدا کا محبوب بن سکتا ہے آپؐ نے عورت کو نازک آبگینہ قرار دیا' ایک سفر میں ازواج مطہرات اونٹوں پر سوار تھیں شتربان سے فرمایا: یا ابخشة ! رویدک بالقواریر" ۔انجشہ! دیکھنا یہ آبگینے ہیں۔ عورتوں کا احترام اور تقدس اس قدر ملحوظ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو راستہ میں بیٹھنے سے منع فرمایا کہ ایاکم و الجلوس فی الطرقات ۔صحابہؓ نے عرض کی: مالنا یا رسول اللہ من مجالسنا بد نتحدث فیھا' کہ آقا! گفتگو کے لیے ایسا ناگزیر ہے' تو پھر فرمایا: فاذا ابیتم الا المجلس نا عطوا الطریق حقه. قالوا و ماحق الطریق. قال صلی اللہ علیه وسلم . غض البصر' و کف الاذی' و رد السلام' والامر بالمعروف و النهی عن المنکر یعنی اگر تمھیں بیٹھنا ہی پڑے تو پھر راستے کے حقوق کا خیال کرو جو یہ ہیں: غض بصر' اذیت رسانی سے اجتناب' سلام کا جواب دینا' اور نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام کام عورتوں کے احترام سے بھی متعلق ہیں کہ عورتیں امام بخاریؒ کی تصریح کے مطابق مردوں کو (راستوں وغیرہ میں) سلام کیا کرتی تھیں اور غضِ بصر یعنی نگاہیں نیچی رکھنا اور ذرہ برابر اذیت رسانی سے بھی اجتناب احترام نسواں کی انتہا ہے۔

صحابہ کرام عورتوں کی عفت' نسوانیت اور تقدس کا کس قدر پاس کیا کرتے تھے' اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے جو اوپر گذرا کہ بنی قینقاع کے بازار میں ایک عورت سے استہزاء کی پاداش میں ایک مسلمان نے یہودی کو قتل کر دیا۔

(۴) تکمیل و ترقی کے مساوی مواقع:

پیچھے ہم نظری حیثیت سے عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ مواقع تکمیل و ترقی اور ان کی حدود دائرہ اور مقاصد بالاجمال بیان کر آچکے ہیں۔ آیئے! اب اسلامی معاشرہ کے دور اول میں مسلمان عورت کو میسر مواقع علم و عمل اور ملی خدمات کی ایک جھلک دیکھیں۔

علمی مواقع:

عورتوں کی تعلیم کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی توجہ فرمائی اور انہیں اس سلسلہ میں تمام معاشرتی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ جمعہ وعیدین کے خطبات کے علاوہ کئی مرتبہ نماز کے بعد انہیں احکام کی تعلیم دینے کے لیے تشریف لے جاتے یا اپنے کسی نمائندہ کو بھیجتے' جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو بھیجا تھا۔ بعد میں آپؐ نے عورتوں کے مطالبہ پر ہفتہ میں ایک دن ان کی تعلیم کے لیے مختص فرما دیا تھا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ:" قال النساء للنبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبنا علیک الرجال فاجعل لنا یوما من نفسک فوعدھن یوما لقیھن فیہ فوعظھن و امرھن والدین اور شوہروں کو عورتوں کی حسن تعلیم و تربیت کی تلقین فرمائی' کہ: من عال ثلاث بنات فادبھن و زوجھن و احسن الیھن فلہ الجنۃ۔ ایک عورت کا نکاح آپؐ نے ایک مفلس شخص سے قرآن کریم کی چند سورتوں کی تعلیم کو مہر ٹھہرا کر' کر دیا۔ اُمہات المومنینؓ کو ہدایت فرمائی کہ وہ ہر بات عورتوں کو سکھائیں' اور مسلمانوں سے کہا کہ اپنی نصف تعلیم کے لیے انہیں حضرت عائشہؓ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ ابتدائی دور اسلام میں پانچ خواتین لکھنا پڑھنا جانتی تھیں:

اُم کلثومؓ بنت عقبہؓ عائشہؓ بنت سعد' مریم بنت مقدادؓ اور شفاءؓ بنت عبداللہؓ حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ پڑھ سکتی تھیں انہیں لکھنا نہیں آتا تھا۔ حضرت حفصہؓ حضرت شفاءؓ سے کتابت سیکھتی تھیں' رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے شفاءؓ سے کہا انہیں خوشخطی بھی سکھاؤ۔ اس ساری کوشش و توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کل تک جو عورت علم و ادب سے قطعاً نابلد تھی آج اس کی جویا اور نگہبان و محافظ بن گئی' چنانچہ حضرت عائشہؓ سے صدہا خواتین نے تعلیم حاصل کی آپؓ انصاری عورتوں کی تعریف میں کہتی ہیں:" نعم النساء نساء الانصار لم یکن یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین"۔ یعنی انصار کی عورتیں بہت ہی اچھی ہیں کہ دین کا فہم حاصل کرنے میں حیاء ان کے آڑے نہیں آتی۔ عموماً صحابہ کرامؓ اپنی اولاد کو خود ہی تعلیم دیتے عورتوں کے لیے گھر پر تعلیم کا انتظام ہوتا' حضرت فاطمہؓ کے کاشانہ مبارکہ میں بہت سی بچیاں قرآن

کریم پڑھا کرتی تھیں، عورتیں اسلامی تعلیمات کا اس قدر گہرائی سے مطالعہ کرتیں کہ بقول حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ: ''کانت تنزل علینا الایته فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فنحفظ حلالها و حرامهاو امر هاو زاجر ها و لا نحفظها'' یعنی جو بھی آیت نازل ہوتی ہم اس کے احکام حلت وحرمت و وعید اچھی طرح سے یاد کر لیتے۔ ام سلمہؓ کی کنیز ام الحسن عورتوں کو باقاعدہ وعظ وتبلیغ کیا کرتی تھی۔ علم وتعلیم کے انہی بے پناہ مواقع اور معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہات کا نتیجہ تھا کہ تمام اسلامی علوم وفنون مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ وفتاویٰ، نیز علم اسرار، خطابت، شاعری اور طب وجراحی وغیرہ میں بے شماری صحابیات نے کمال حاصل کیا اور شہرت پائی۔

مواقع عمل:

اسلامی معاشرہ کے دور اول میں خواتین کی ساری صلاحیتیں اور کوشش صرف علم و فکر کے میدان تک محدود نہ تھیں بلکہ انہیں احکام شرعیہ کی پابندی کرتے ہوئے اپنی طبعی صلاحیتوں اور وظائف کے مناسب اعمال سرانجام دینے اور کسب رزق کے بھرپور مواقع میسر تھے۔ ذیل میں چند اجمالی اشارات پر اکتفاء کیا جاتا ہے:۔

خیاطت:

حضرت فاطمہؓ بنت شیبہ وغیرہ کے تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ انصار کی عام عورتیں سلائی کا کام کیا کرتی تھیں۔

فلاحت (کاشتکاری):

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں خواتین کھیتی باڑی کا کام بھی کرتی تھیں مگر یہ تمام صحابیات کا مشغلہ نہ تھا بلکہ سرسبز مقامات کے باشندوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مدینہ منورہ میں انصار کی تمام عورتیں کاشتکاری کرتیں اور خاص کر سبزیاں بوتی تھیں۔ سہلؓ بن سعد ایک خاتون کا ذکر کرتے ہیں جو اپنی کھیتی میں پانی کی نالیوں کے اطراف چقندر کاشت کیا کرتیں اور جمعہ کے دن سہلؓ اور دیگر صحابہؓ کو چقندر اور آٹے سے تیار کردہ حلوہ

کھلاتی تھیں۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر گھر کا کام کاج بھی کرتی تھیں اور اپنے کھیتوں سے گھوڑے کا چارہ اور کھجور کی گٹھلیاں سر پر اٹھا کر لایا کرتی تھیں، کہتی تھیں ": تزوجنی زبیرؓ..... فکنت اعلف فرسه واستقی الماء واحر زغربه واعجن... وکنت انقل النوی ی من ارض الزبیرؓ التی اقطعه رسول الله صلی الله علیه وسلم وهی منی علیٰ ثلثی فرسخ"۔

حضرت جابر بن عبداللہ کی خالہ کو طلاق ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کھیتوں میں جانے اور کھجوروں کے درخت کاٹنے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا:" اخرجی فجذی نخلک لعلک اان تصدقی منه او تفعلی خیراً :

تجارت:

صحابیاتؓ میں بعض عورتیں تجارت بھی کرتی تھیں، حضرت خدیجہؓ کی تجارت شام سے نہایت وسیع پیمانہ پر تھی، قیلہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: انی امراۃ ابیع و اشتری، اور پھر خرید و فروخت سے متعلق مسائل دریافت کیے۔ خولہؓ، ملیکہؓ، ثقفیہؓ، اور ارم ورقہؓ وغیرہ عطریات کی تجارت کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں اسماءؓ بنت مخربہ کو ان کے لڑکے عبداللہ بن ابی ربیعہ یمن سے عطر بھیجا کرتے تھے اور وہ اس کا کاروبار کرتی تھیں۔ عمرہؓ بنت طبیخ کہتی ہیں میں نے ایک مرتبہ اپنی کنیز کے ساتھ بازار جا کر مچھلی خریدی، حضرت علیؓ نے دیکھی تو مچھلی کی تعریف کی۔ ان کے علاوہ حضرت کریمہؓ اور دیگر صحابیات بھی سوداگری کرتی تھیں۔

صناعت (دستکاری):

اسد الغابۃ اور مسند امام احمد بن حنبلؒ کی متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابیات عموماً کپڑا بنا کرتی تھیں جوان کو اور ان کی اولاد کو کافی ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ زینب صنعت و حرفت کا کام کر کے اپنے گھر کا خرچ پورا کرتی تھیں، ایک دن بارگاہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کی:" انی امرأة ذات صنعة ابیع منها ولیس لی

ولا لزوجی ولا لولدی شئی.''اور دریافت کیا کہ وہ گھر والوں پر خرچ کرتی ہیں کیا انہیں اس کا کوئی ثواب ملتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں تم کو اس کا اجر ملے گا۔ حضرت سودہؓ طائف کی کھالیں درست کرتی تھیں اور ان کو دباغیت دیتی تھیں' ان صنعتوں کے علاوہ بعض صحابیات اور کام بھی جانتی تھیں۔

طبابت وجراحت:

طب اور جراحت میں رفیدہؓ اسلمیہ' ام مطاعؓ' ام کبشہ حمنہ بنت جحشؓ معاذہؓ' لیلیٰؓ' ام زیادؓ ربیع بنت معوذؓ ام عطیہؓ ام سلیمؓ کو زیادہ مہارت حاصل تھی' یہ جنگ دامن میں مریضوں کا علاج اور زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں' رفیدہؓ کا خیمہ جس میں جراح خانہ بھی تھا' مسجد نبویؐ کے پاس تھا ایسی ہی روایت کیعبہؓ بنت سعد الاسلیمہ کے بارے میں بھی آئی ہے۔ ممکن ہے یہ ایک ہی خاتون کے دو نام ہوں یا راوی کو اشتباہ ہوا ہو۔ علاوہ ازیں کتابت' خطابت اور غناء (گیت گانا) میں بھی بہت سی عورتوں کو مہارت حاصل تھی۔

ملی خدمات کے مواقع:

اسلامی معاشرہ کے دور اول میں عورتوں کو دینی و ملی خدمات اور اجتماعی رفاہ و بہبود کے کاموں کے بھی بے پناہ مواقع میسر تھے اور وہ ان مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتی تھیں جس کی ایک ادنیٰ سی جھلک ذیل میں پیش ہے۔

اشاعتِ اسلام:

دینی و ملی خدمات میں اسلام کی دعوت و تبلیغ سب سے اہم ہے اور اس میں ابتدائے اسلام ہی سے صحابیات کی مساعی جمیلہ کا کافی حصہ شامل ہے' چنانچہ فاروق اعظمؓ کا ایمان فاطمہؓ بنت خطاب ہی کی تحریک و تاثیر کا مرہون منت تھا' حضرت ام شریکؓ مخفی طور پر قریش کی عورتوں کو اسلام کی دعوت دیا کرتی تھیں' قریش کو معلوم ہوا تو ان کو مکہ سے نکال دیا۔ ام حکیمؓ بنت الحارث کی شادی عکرمہؓ بن ابی جہل سے ہوئی تھی' وہ خود تو فتح مکہ کے دن اسلام لائیں مگر ان کے شوہر بھاگ کر یمن چلے گئے' ام حکیمؓ نے یمن کا طویل سفر کر کے

انہیں دعوت اسلام دی تو وہ مسلمان ہو کر بارگاہِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابوطلحہؓ نے حالتِ کفر میں حضرت ام سلیمؓ سے نکاح کرنا چاہا تو انہوں نے کہا کہ اسلام قبول کر لو تو وہی میرا مہر ہوگا ورنہ غیر مسلم سے میرا نکاح کیونکر ہو سکتا ہے' چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے۔

ارشاد و اصلاح اور احتساب:

نظری پہلو کے بیان میں ہم اجتماعی نصب العین کی تحصیل اور ایمانی تقاضوں (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کی تکمیل میں عورتوں کے کردار کی اہمیت پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ اسلامی معاشرہ کے دور اول میں خواتین معاشرتی اصلاح اور نیکیوں کی ترغیب میں بھرپور کردار ادا کرتی تھیں۔ فتوحات عجم کے بعد نرد بازی' شطرنج بازی وغیرہ کا رواج ہوا۔ حضرت عائشہؓ کے گھر میں کچھ کرایہ دار رہتے تھے' ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ نرد کھیلتے ہیں' سخت برافروختہ ہوئیں اور کہلا بھیجا کہ اگر نرد کی گوٹیاں باہر نہ پھینک دو گے تو اپنے گھر سے نکلوا دوں گی۔ ایک دفعہ کسی عورت نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میری بیٹی دلہن بنی ہے لیکن بیماری سے اس کے بال جھڑ گئے ہیں کیا مصنوعی بال جوڑ دوں؟ فرمایا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔ ایک دفعہ شام کی چند عورتیں حضرت عائشہؓ کی زیارت کو آئیں' رومیوں کے اختلاط سے وہاں کی عورتیں بھی حمام میں برہنہ غسل کیا کرتی تھیں' فرمایا! تم ہی وہ عورتیں ہو جو حماموں میں جاتی ہو' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو عورت گھر سے باہر کپڑے اتارتی ہے وہ اپنے اور خدا کے درمیان پردہ داری کرتی ہے۔ حضرت سمراءؓ بنت نہیک کے متعلق ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کانت تمر فی الا سواق و تامر بالمعروف و تنھی عن المنکر و تضرب الناس علیٰ ذٰلک بسو طکان معھا. یعنی وہ بازار میں جا کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتیں اور غلط کاروں کو کوڑے سے مارتیں۔ ایک بار حضرت عائشہؓ کی بھتیجی حفصہؓ بنت عبدالرحمٰن نہایت باریک دوپٹہ پہن کر سامنے آئیں' دیکھتے ہی غصہ سے دوپٹہ کو چاک کر دیا اور فرمایا تم نہیں جانتیں کہ سورۂ نور میں کیا احکام آئے ہیں' اس کے بعد گاڑھے کا دوسرا دوپٹہ منگا کر

اوڑھا دیا ایک عورت کی چادر میں نقش ونگار بنے ہوئے دیکھے تو ڈانٹا کہ یہ چادر اتار دو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے کپڑوں کو دیکھتے تھے تو پھاڑ ڈالتے تھے۔ ابن ابی السائب تابعی نے وعظ شروع کی تو حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا مجھ سے تین باتوں کا وعدہ کرو ورنہ بزور تم سے باز پرس کروں گی، عرض کیا ام المومنینؓ! کیا باتیں! فرمایا دعاؤں میں مسجع عبارتیں نہ بناؤ، ہفتہ میں صرف ایک دن وعظ کرو، جب لوگوں کی خواہش ہو تب وعظ کرو۔

اصلاح واحتساب کے سلسلہ میں صحابیات نہ رعایا کی پروا کرتی تھیں اور نہ فرمانرواؤں کی، حضرت عمرؓ کہیں جارہے تھے، حضرت خولہؓ بنت ثعلب سے ملاقات ہوگئی، وہ وہیں حضرت عمرؓ کو نصیحت کرنے لگیں اور آپؓ خندہ پیشانی سے سنتے رہے۔ مہر کی مقدار کی تحدید کے معاملہ میں ایک بڑھیا نے حضرت عمرؓ کو سرِ محفل ٹوک دیا۔ حضرت سودہؓ بنت عمارہ اور حضرت عکرشہؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو سختی سے انصاف کی تلقین کی اور ظالم گورنروں کو معزول کرنے پر مجبور کیا۔ حجر بن عدی اور ان کے اصحاب کو قتل کرنے پر حضرت عائشہؓ نے امیر معاویہؓ کی سخت سرزنش کی اور انتہائی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اس طرح کے بے شمار واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔

شرکتِ جہاد اور خدمت مجاہدین:

جہاد میں شرکت اور مجاہدین کی خدمت وہ اہم سعادت ہے جس کا موقع صحابیات کو ملا اور انہوں نے جس خلوص اور عزم واستقلال سے اس عظیم خدمت کو نبھایا اس کی نظیر نہیں ملتی غزوہ بدر میں ام ورقہؓ بنت عبداللہ نے شہادت کی آرزو پر شرکت کی اجازت چاہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں گھر ہی میں شہادت عطا ہوگی۔

غزوہ بدر میں حضرت عائشہؓ ام سلیمؓ ام سلیطؓ ام عمارہؓ اور دیگر صحابیات شریک ہوئیں، ام عمارہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں مردوں کی سی ثابت قدمی اور بیباکی وشجاعت کا مظاہرہ کیا کہ انتہائی افراتفری اور انتشار کے عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں تیر وتلوار چلاتی رہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں تعریف فرمائی "وما التفت یمینا و لا شمالا الا وانا ارھا تقاتل دونی احد کے علاوہ وہ خیبر،

حنین اور یمامہ کی جنگ میں بھی شریک ہوئیں' یمامہ میں انہوں نے اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ سترہ زخم کھائے اور ایک ہاتھ کٹ گیا۔ غزوہ خندق میں حضرت صفیہؓ نے حیرت انگیز ثبات و بہادری سے عورتوں کے خیمہ پر حملہ آور یہودی کو قتل کر کے یہودیوں کو بھگا دیا۔ حنین میں اسلامی فوج کے قدم اکھڑ چکے تھے مگر ام حارثؓ چند باہمت نفوس کے ساتھ پہاڑ کی طرح جمی رہیں۔ جنگ یرموک میں حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ ' ام ابانؓ ام حکیمؓ خولہؓ ہندؓ اور ام المومنین جویریہؓ نے بڑی دلیری سے جنگ کی اور اسماءؓ بنت یزید انصاریہ نے خیمہ کی چوب سے ۹ رومیوں کو قتل کر دیا۔ حنین میں حضرت ام سلیمؓ کا خنجر لے کر نکلنا مشہور بات ہے۔

صحابیات بحری لڑائیوں میں بھی شرکت کرتی تھیں' چنانچہ ۲۸ھ میں جزیرہ قبرص پر حملہ ہوا تو حضرت ام حرامؓ اس میں شامل ہوئیں۔ غزوات میں قتال کے علاوہ صحابیات اور بہت سی خدمات انجام دیا کرتی تھیں' جن میں اہم ترین یہ ہیں:۔ پانی پلانا' زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا' شہیدوں اور زخمیوں کو میدان سے اٹھا کر لے جانا' چرخہ کاتنا' تیر اٹھا کر دینا' خوردونوش کا انتظام کرنا' قبر کھودنا اور فوج کو ہمت دلانا وغیرہ۔

حضرت ام سلیمؓ اور انصار کی چند عورتیں زخمیوں کی تیمارداری کی خاطر ہمیشہ غزوات میں شریک ہوا کرتیں' چنانچہ ایک صحابیہؓ جو ۶ غزوات میں شریک ہوئیں کہتی ہیں'' **کنا نداوی الکلمی و نقوم علی المرضی**''۔ اور ربیعؓ بنت معوذ کا بیان ہے **کنا نغزو مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فنسقی القوم و نخذ مھم و نرد القتلی والجرحی الی المدینہ**'' اور ام عطیہؓ کہتی ہیں'': **غزوت مع الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سبع غزوات اخلفھم فی رحالھم نا صنع لھم الطعام واداوی الجرحی و اقوم علی المرضی**''۔ غزوات میں شریک ہو کر مختلف خدمات انجام دینے والی چند دیگر صحابیات کے نام یہ ہیں: امِ یمنؓ ' حمنہؓ بنت جحش' سلمیٰؓ زوجہ ابی رافع' امِ عامرؓ ' امِ خلاّؓ ' انصاریہؓ ' کعیبہؓ بنت سعد اور رمیصاءؓ زوجہ ابی طلحہؓ وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن۔

خدماتِ متفرقہ:

مذکورہ بالا مذہبی، ملی اور رفائی خدمات کے علاوہ اور بھی بہت سے سماجی وفلاحی کام سرانجام دیا کرتی تھیں جن کے انہیں مواقع میسر تھے اس سلسلہ میں بعض سیاسی خدمات جیسے خلفاء کو مشورہ دینا، امان دینا، نومسلموں کی کفالت کرنا جیسا کہ امِ شریکؓ کا گھر نومسلموں کے لیے مہمان خانہ بن گیا تھا۔ اور مساجد کی صفائی وغیرہ کرنا، چنانچہ ایک بار کسی نے مسجد نبویؐ میں تھوک دیا تھا، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ کر اس قدر برہم ہوئے کہ چہرہ مبارک سرخ ہوگیا، ایک صحابیہؓ اٹھیں اُس کو مٹادیا اور خوشبو لگائی، آپ نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ خوب کام کیا۔ ایک صحابیہؓ ہمیشہ مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نیک کام کی نہایت قدر فرمائی، چنانچہ جب ان صحابیہؓ کا انتقال ہوا تو صحابہؓ نے ان کو راتوں رات دفن کردیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع نہ دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ مجھے کیوں نہیں خبر کی، صحابہؓ نے عرض کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرمارہے تھے ہم نے تکلیف دینا گوارا نہیں کیا۔

اسلامی معاشرہ کے دورِ اوّل میں پردہ:

عہدِ رسالتؐ اور دورِ صحابہؓ میں خواتین اسلام کے ان مذکورہ کاموں اور خدمات میں بھرپور حصہ لینے سے بعض ترقی پسند لوگ اس گمان میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ اُس پاکیزہ عہد میں عورتیں پردہ ہرگز نہیں کرتی تھیں، چنانچہ ''پردہ اور تعدد ازدواج'' کے مصنف مظہر الحق خان نے یہ خیال فاسد پھیلانے کی بھرپور کوشش کی ہے، وہ چند احادیث کی فاس تاویلات کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ سے مراد وہ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دور خلافتِ راشدہ لیتے ہیں) کے مسلمانوں میں پردہ، برقعہ اور زنانخانہ قسم کی چیزیں نہیں تھیں اس کے برعکس مسلمان عورتیں آزادانہ طور پر گھر سے باہر کے کاموں میں اور تکمیلات میں حصہ لیتی تھیں، تاہم یہ حالات خلافت بنوامیہ کے آخری ایام تک قائم رہے اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہونے لگے جن سے مسلمانوں میں پردے

کا رواج شروع ہو گیا"۔ موصوف کا یہ گمان سراسر بے بنیاد ہے' وہ مقدس خواتین جن کی زندگیاں شریعت کے احکام کی عملی تصویر تھیں اور جو احکام حجاب کے نزول کی خبر ملتے ہی جہاں تھیں وہیں اپنے کمربند (نطاق) پھاڑ پھاڑ کر اپنے چہرے ڈھانپنے لگی تھیں' ان کے بارے میں بے پردگی کا تصور مضحکہ خیز ہی ہیں کور باطن کا بھی آئینہ دار ہے' عہد رسالت و خلافت راشدہ میں خواتین پردے کا مکمل اہتمام کرتی تھیں' نقاب پوش رہتی تھیں' محفہ میں سفر کرتی تھیں' اور غیر محرم حتیٰ کہ نابینا (جیسا کہ ابن ام مکتوم سے حجاب کے حکم کا واقعہ مشہور ہے) سے بھی پردہ کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب لوگ ہمارے سامنے سے گذرتے تھے تو ہم چہرے پر چادر ڈال لیتے تھے' لوگ گذر جاتے تھے منہ کھول دیتے تھے"۔ ایک صحابیہؓ کا بیٹا شہید ہوا وہ نقاب پہن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں صحابہ کرامؓ نے ان کو دیکھ کر کہا کہ بیٹے کی شہادت کا حال پوچھنے آئی ہو اور نقاب پوش ہو کر؟ بولیں میں نے اپنے بیٹے کو کھو دیا ہے شرم و حیا کو تو نہیں کھویا۔ حضرت عائشہؓ کے مطابق غلام سے پردہ ضروری نہیں اس لیے آپؓ حضرت ابو عبداللہ سالمؒ سے جو نہایت متدین غلام تھے پردہ نہ کرتی تھیں' ایک دن وہ آئے اور کہا کہ " خدا نے آج مجھے آزاد کر دیا"۔ چونکہ اب وہ غلام نہیں رہے تھے اس لیے حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پردہ گرا دیا اور عمر بھر ان کے سامنے نہ ہوئیں۔ ایک بار حضرت افلح بن ابی القیسؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ملاقات کو آئے' آپ پردہ میں چھپ گئیں' وہ بولے تم مجھ سے پردہ کرتی ہو' میں تمہارا چچا ہوں کیونکہ میرے بھائی کی بیوی نے تم کو دودھ پلایا ہے"۔ آپؓ نے جواب دیا " مرد نے تو دودھ نہیں پلایا۔ یہ اور اس قسم کے دیگر بے شمار واقعات اسلامی معاشرہ کے دور اول میں پردہ کے وجود کی اٹل شہادت ہیں۔ باقی رہا عورتوں کا اعمال و تکمیلات میں حصہ لینا' تو یہ آزادانہ اور بے حجابانہ نہ تھا جیسا کہ مظہر صاحب نے سمجھا ہے' بلکہ عام روزمرہ کے کاموں میں تو صحابیاتؓ ہمیشہ باپردہ اور باحیا حصہ لیتی تھیں' البتہ غزوات میں شرکت ایک استثنائی صورت تھی جو ضرورت پر مبنی تھی کہ قاعدہ شرعیہ ہے "الضرورات تبیح المحظورات"۔ یعنی ضرورت احکام کو بدل دیتی ہے لیکن یہ تبدیلی صرف ضرورت کی حد تک ہی ہوتی ہے عام نہیں ہو سکتی'

جیسا کہ قاعدہ ہے": الضرورات تقدر بقدر ھا"۔ چنانچہ جنگ کی استثنائی حالت کے احکام صرف جنگ کی حد تک ہی محدود رہتے ہیں۔

مولانا مودودی رقمطراز ہیں": مسلمان جنگ میں مبتلا ہوتے تھے' عام مصیبت کا وقت ہے۔۔۔۔ ایسی حالت میں اسلام قوم کی خواتین کو عام اجازت دیتا ہے کہ وہ جنگی خدمات میں حصہ لیں۔۔۔۔ کیونکہ جہاں حقیقی ضروریات پیش آجائیں وہاں پردہ کے حدود کم بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ لیکن جب ضرورت رفع ہو جائے تو حجاب کو پھر انہی حدود پر قائم ہو جانا چاہیے جو عام حالات کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔

(سہ ماہی منہاج لاہور جلد ۲ شمارہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۴)

آدم وحوا کا معاملہ

انسان کی تخلیق کے بارے میں طرت سے یہ ''غیر فطری فعل'' کیسے سرزد ہو گیا کہ مادہ یعنی حوا کو نر یعنی آدم کے وجود سے جنم لینے پر مجبور ہونا پڑا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اس غیر فطری اور مضحکہ خیز نظریئے کے ''بانی'' اور ''موجد'' علمائے یہود و نصاریٰ ہیں۔ سب سے پہلے علماء یہود نے یہ نظریہ وضع کر کے عہد نامہ عتیق میں شامل کیا۔ عہد نامہ عتیق کی کتاب پیدائش باب دوم میں مرقوم ہے کہ

خداوندِ یہوا نے زمین کی مٹی سے انسان (آدمؑ) کا بت بنایا پھر اس کے نتھنوں کے ذریعے اس میں زندگی کی روح پھونکی پھر سمت مشرق میں باغ دن بنایا جس میں ہر قسم کے درخت تھے اس باغِ عدن میں شجر حیات بھی تھا اور نیکی و بدی کی پہچان کا شجر بھی۔ اس میں دریا بہتے تھے۔ پھر خداوندِ یہوا نے چرند و پرند پیدا کئے۔ آدمؑ نے ان چرندوں اور پرندوں کے نام رکھے۔ اما بعد آدم کی پسلی سے حواؑ کو پیدا کیا۔''

حقیقت میں یہودیوں کے اس مذہبی عقیدے یا نظریئے کا ماخذ بابلیوں کا وہی ''ان کی'' اور ''نن ہورسگ دیوی والا مذہبی قصہ ہے۔ دلمون کے جنت میں ''ان کی'' یعنی پانی کا دیوتا اکیلا رہتا تھا۔ ایک دن اجانک وہاں ''نن ہورسگ'' دیوی یعنی مادرِ کائنات آ نمودار ہوئی۔ ''ان کی'' نے ''نن ہورسگ'' دیوی کے مباشرت کی جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی اور نو ماہ بعد ماں بن گئی۔ اس قصے کا اثر یہودیوں نے بخت نصر شاہ بابل کے دور میں بابلیوں کی قید کے دوران لیا اور اس میں کچھ ترامیم و اضافے کر کے اپنی آسمانی کتابوں کی زینت بنا دیا۔ بابلیوں میں چونکہ صدہا سال تک مادری معاشی نظام رائج رہا ہے لہٰذا ان

کے قصے کی اصل ہیرو یا مرکزی کردار ''نن ہورسگ'' دیوی یعنی عورت ہے جو نہ صرف بذات خود ''ان کی'' یعنی پانی کے دیوتا کی بلکہ پوری کائنات کی بھی خالق ہے اس کے برعکس یہودیوں میں بابلیوں کی اسیری کے زمانے میں چونکہ پدری نظام چل رہا تھا اور ان کے معاشرے میں عورت کی مذہبی اور سماجی حیثیت نہایت پست تھی لہٰذا انہوں نے اپنے قصے کا مرکزی کردار اور ہیرو آدم یعنی مرد کو بنایا۔ وہ لوگ اس وقت ذہنی طور پر بھی یہ بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے کہ عورت کو جوان کے نزدیک حقیر ترین مخلوق تھی مرد پر تخلیقی لحاظ سے فوقیت دی جائے۔

یہودیوں کے بعد یہی نظریہ عیسائی مذہب کے بانیوں نے عہد نامہ عتیق سے مستار لیکر اپنی کتابوں میں شامل کرلیا۔ انجیل کی کتاب پیدائش باب دوم میں یہی روایت کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے۔

''خدا نے باغ عدن لگایا۔ اور انسان (آدمؑ) کو اپنی صورت پر پیدا کر کے وہاں رکھا۔ پھر خدا نے کہا کہ (باغ عدن میں) آدم کا اکیلا رہنا مناسب نہیں لہٰذا میں اس کے لیے مددگار اسی کی مانند بناؤں گا۔ پھر خداوند نے آدمؑ پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا تو اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکال کر ایک عورت بنائی اور آدم کے پاس لایا۔''

ازاں بعد عیسائیوں نے پیدائش آدم کے اس نظریئے میں مزید حاشیہ آرائی کی اور مرد کو عورت پر مزید واضح فوقیت دینے کے لیے یہاں تک کہہ دیا کہ عورت مرد کا ایک طفیلی وجود ہے جسے محض پیدا ہی اسی لئے کیا گیا ہے کہ وہ مرد کی تنہائی اور بوریت دور کرے اور اپنی دلربا اداؤں سے خدا کے اس لاڈلے ''خدائی صورت'' رکھنے والے مرد کا جی بہلائے۔ اس ضمن میں بائبل کا نظریہ کچھ یوں ہے۔

''آدم کو سب سے پہلے پیدا کیا گیا اور جب اس نے تنہائی اور بوریت محسوس کی تو اس کی بائیں پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا۔''

بائبل کے اس نظریہ کی تفہیم و تفسیر عیسائیوں کے سینٹ پال نے ان الفاظ میں کی ہے۔

''مرد کو عورت کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ عورت کو مرد کے لئے پیدا کیا گیا ہے لہٰذا (شرعی) قانون کی رو سے عورتوں کو مردوں سے کمتر درجے پر رہنا چاہیے۔''

اس کے بعد علمائے نصاریٰ نے پیدائش کے اس نظریئے میں مزید غلو کیا اور اس

میں عجیب وغریب رنگ آمیزیاں کیں۔ بالآخر تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ

"حوا یعنی عورت کو آدم کی سب سے بڑی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے جو تمام پسلیوں میں سے زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے۔"

مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ عورت روز ازل سے ہی ٹیڑھی مخلوق جسے سیدھا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی صراط مستقیم پر چلایا جا سکتا ہے۔ اور اگر کوئی سر پھرا اسے سیدھا کرنے کی سعی لاحاصل کرے گا بھی تو یہ ازلی ٹیڑھی مخلوق ٹوٹ تو جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہو پائے گی گویا۔

ٹوٹ سکتی ہے لچک سکتی نہیں

علمائے یہود ونصاریٰ کے اسی مذہبی نظریئے کا اثر مسلم فقہا، مورخین اور مفسرین نے بھی لیا ہے۔ حالانکہ اسلام ایک دین فطرت ہے اور اس میں کسی بھی قسم کے غیر نظریئے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی بھی عقل سلیم رکھنے والا انسان ہماری اس بحث کو پڑھنے کے بعد بخوبی جان سکتا ہے کہ اس قسم کی تمام روایات وضعی، فرضی اور من گھڑت ہیں جو مردوں نے عورت کو تضحیک وستم کا نشانہ بنانے اور اسے اپنا طفیلی دست نگر ثابت کرنے کے لیے تراشی ہیں دراصل یہ مرد شاونزم کی ایک گھٹیا سازش تھی جسے مذہب کا رنگ دے دیا گیا۔
اس موضوع پر تاریخی اور مذہبی حوالوں سے روشنی ڈالنے کے بعد ہم یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ قرآن حکیم کا اس ضمن میں کیا نظریہ ہے؟ لیکن اس سے قبل کہ ہم اس موضوع پر اسلامی نکتہ نگاہ سے بحث کریں یہ جان لینا از حد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تخلیق کے متعلق جدید ترین سائنسی تحقیقات کیا کہتی ہیں۔ موجودہ دور کی سائنسی تحقیقات اس قدر ترقی کر چکی ہیں کہ انسان ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے اور کائنات کے صدیوں سے سربستہ رازوں کے نزدیک جا پہنچا ہے۔ اس قدر غیر معمولی ترقی کر لینے کے بعد انسانی تخلیق کے متعلق سائنس دانوں نے جو نظریہ وضع کیا ہے اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ

"آج سے کھربوں سال پہلے خطہ ارضی پر پانی ہی پانی تھا اسی پانی میں پہلے سے موجود کیمیاوی عناصر نے ایک خاص موسمی ماحول کے زیر سایہ لاکھوں سال کے ارتقائی عمل کی کروٹیں بدلتے ایک ایسے خلیئے کی صورت گری کر ڈالی جو نہ صرف روح زیست جیسی

ترفیعی صفت کا حامل تھا بلکہ اپنے وجود میں سے مزید خلیے بھی تولید کر سکتا تھا۔ اس خلیے میں نر مادہ دونوں کی خصوصیات جمع تھی۔ یوں بالآخر بے شمار خلیے الجی کی صورت میں نمودار ہوئے جن کے باہمی میل جول' اتصال اور تعمل سے جادۂ حیات نے ارتقاء کا زینہ زینہ چڑھنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ بعض حیاتیاتی وجودوں میں نر اور بعض میں مادہ پہلو کا اضافہ ہونے لگا۔ جس کا نتیجہ بالآخر مکمل طور پر نر اور مادہ خلوی جانداروں کی صورت میں سامنے آیا۔ انسان جو اس حیاتیاتی ارتقاء کی ایک کڑی ہے حیوانات سے منہا ہو کر اشرف المخلوقات کے درجے تک پہنچا ہے۔''

سائنسی نظریئے کے اس سارے عمل میں نر کی مادہ پر کوئی سبقت نظر نہیں آتی۔ گویا سائنس نے رمد کے اس ادعا کا تیا پانچہ کر دیا ہے کہ اسے فطرت نے تخلیق میں اولیت دی ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو پلڑا عورت کا ہی بھاری نظر آتا ہے کیونکہ اولین زندہ خلیفہ توالد و تناسل کی خصوصیات کا حامل ہونے کی وجہ سے مادہ سے زیادہ مشابہ نظر آتا ہے۔ بہر کیف حق یہ ہے کہ سائنسی اور ارتقائی نکتہ نظر سے مرد کو عورت پر یا عورت کو مرد پر کوئی واضح برتری یا سبقت حاصل نہیں ہے یہ ایک ہی زنجیر کی دو مختلف الخواص کڑیاں ہیں جو باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ تذکیر و تانیث کے یہ حیاتیاتی نکتے ایک ہی وجود میں متشکل ہو کر سفر حیات پر رواں ہوئے لیکن بعد میں ارتقائی ضرورت کے پیش نظر انہوں نے الگ الگ تجسیم اختیار کیا۔ چنانچہ اشرف المخلوقات کے انسانی درجے کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔

یہ تو تھا سائنس کا وہ جدید ترین نظریہ جو انسان نے صدیوں اور قرنوں کی محنتِ شاقہ کے بعد آج آ کر وضع کیا ہے جبکہ انسانی ذہن از حد ترقی کر چکا ہے یہ نظریہ ہمیں صاف بتا رہا ہے کہ سب سے پہلے زندگی کی نمو کیچڑ یا پانی والی جگہ سے ہوئی۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ جدید ترین تحقیقات پر مشتمل زندگی کی ابتدا کا یہ سائنسی نظریہ وہی ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے پیش کیا تھا۔ سائنس نے دراصل نمودِ حیات کے اسی نظریئے کی آج آ کر توثیق کی ہے جو قرآن حکیم نے صدیوں پہلے اس وقت پیش کیا تھا جس وقت انسانی

ذہن از حد پسماندہ تھے اور موجودہ سائنسی علوم سے قطعاً نا آشنا تھے۔ چودہ سو سال پہلے والا قرآن حکیم آج بھی ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جو ہمیں بتا رہا ہے کہ

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَسْنُوْنٍ ﴾

اور تحقیق ہم نے پیدا کیا انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے جو بنی تھی سڑی ہوئی کیچڑ سے۔ سورۃ الصفت)

موجودہ ترقی یافتہ دور کے سائنس دانوں کا یہ نظریہ بھی کہ فطرت نے سب سے پہلے ایک زندہ خلیہ پیدا کیا اور اس زندہ خلیئے میں سے نر اور مادہ دونوں وجود تولد ہوئے دراصل قرآن حکیم کے پیش کردہ اس نظریئے کی تائید وتوثیق ہے جس کے تحت کہا گیا ہے کہ

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَنِسَاءً (سورۃ النساء)

اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جاں (نفس واحدہ) سے پیدا کیا۔ اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر بہت سے مرد (نر) اور بہت سی عورتیں (مادہ) دنیا میں پھیلا دیے۔ گویا قرآن حکیم کے نزدیک مرد عورت نفس واحدہ سے تخلیق کیے گئے ہیں اور یہ دونوں ایک ہی جیسی سرشت، طینت اور جنس کے مالک ہیں لہٰذا ان دونوں میں سے کسی ایک کو ادنیٰ اور دوسرے کو اعلیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مرد کو تخلیقی اعتبار سے عورت پر فوقیت دینے والے حضرات یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ نسل انسانی کی کھیتی کو عورت نے ہی اپنے خون جگر سے سیراب کیا ہے۔ اور بنی نوع کے تحفظ اور تکثیر کا سہرا صرف اسی کے سر ہے۔ یہ کائنات کی وہ حسین دیوی ہے جس کی کوکھ سے عالم انسانیت نے جنم لیا۔ یہ وہ مادر مہربان ہے جس کی آغوش راحت کوش میں تہذیب وتمدن انسانی کا نومولود بچہ پرورش پا کر جوان رعنا بنا ہے۔

آج کا مرد لاکھ اترائے اپنی جوانمردی، بہادری، توانائی اور رعنائی کے گیت گا گا کر اپنے ہی منہ میاں مٹھو بنتا پھرے اس کے باوجود یہ حقیقت اٹل اور ناقابل تردید ہے کہ اس کی تمام تر توانائیاں اور رعنائیاں شیر مادر کی مرہون منت ہیں۔ اس کی تمام رگوں میں ماں کا ودیعت کردہ خون دوڑ رہا ہے۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ مرد عورت کی تخلیق ہے لیکن یہ دعویٰ قطعی احمقانہ ہے کہ عورت مرد کی تخلیق ہے۔

عورت کے احوالِ شخصیہ

حافظ محمد سعد اللہ

شخصی احوال سے مراد وہ حالات وکیفیات یا وہ حقوق وفرائض یا وہ احکام ہیں جو ایک انسان کی ولادت سے لے کر وفات تک اس کی ذات سے مختص ہوتے ہیں۔ انگریزی میں الاحوال الشخصیہ کو پرسنل لاز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ احوال شخصیت میں زیادہ تر انسان کی ازواجی زندگی' اس کے ابتدائی اور اختتامی مراحل اور طریقے ازواجی تعلق کے ثمرات وعواقب اور اس کے حقوق واجبات وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے احوال شخصیہ میں زیادہ تر انسان کی ازدواجی زندگی' اس کے ابتدائی اور انتہائی مراحل اور طریقے ازدواجی تعلق کے ثمرات وعواقب اور اس کے حقوق واجبات وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس مضمون میں خصوصاً عورت کے شخص احوال کے متعلق اسلام کے حوالے سے مختصراً عرض کرنا مقصود ہے۔

اسلام کی آمد سے قبل دنیا کے مختلف انسانی معاشروں میں عورت کی جو حیثیت اور حالت تھی' جو کچھ اسے سمجھا جاتا تھا اور جس طرح اس کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا تھا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ قدرت نے اسے مرد کی طرح ذی روح' ذی شعور اور ذی وقار بنایا تھا مگر وہ بے جان مورتی کی مانند مرد کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اس کی کوئی ذاتی مرضی نہ تھی' رائے نہ تھی' کوئی اختیار نہ تھا' جوا میں داؤ پر لگ جاتی ' اس کا خاوند فوت ہوتا تو دیگر مال واسباب کی طرح اپنے خاوند کے ورثاء کو ورثۃً منتقل ہو جاتی یا ''ستی'' کی بھینٹ چڑھ جاتی' اپنے ماں باپ' بھائی بیٹے یا خاوند کی وراثت میں اس کا کوئی حق نہ تھا' خاوند اس کے ساتھ من مانی' کرتا غرض وہ اپنی زندگی سے تنگ تھی کہ نیر اسلام طلوع ہوا۔ اسلام جہاں دیگر مظلوم مقہور طبقات انسان کے لیے آیہ رحمت بن کر آیا وہاں وہ دیرینہ مجبور' لاچار بے کس اور ظلم

وستم کی چکی میں پسنے والی اس صنف نازک کے لیے بھی ابر رحمت ثابت ہوا۔ اسلام نے انسان ہونے کے ناطے سے مرد اور عورت کو برابر قرار دیا اعلان کیا کہ کسی مرد کو محض مرد ہونے کی بنا پر افضل اور عورت کو بر بنائے عورت ذلیل اور گھٹیا نہیں تصور کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما النساء شقائق الرجال (بیشک عورتیں مردوں ہی کی ہم جنس ہیں) فضیلت اور برتری کا معیار صرف شخصی اور اخلاقی طہارت اور پاکیزگی ہے۔

اسلام نے عورت کے شخصی احوال کے سلسلے میں خصوصی رعایت برتی ہے۔ ہر جگہ اس کے حقوق کا پورا پورا تحفظ اور عدل وانصاف مہیا کیا گیا ہے۔ ذیل کی معروضات سے اس چیز کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

نکاح

ضرورت نکاح:

اس عالم آب وگل کی تقریباً ہر شے کے اندر اپنی نوع کی بقا کا فطری جذبہ پایا جاتا ہے اور قدرت نے اس جذبہ کی آسودگی کے لیے خود اسی کی نوع میں ایک صنف مقابل کی تخلیق کی ہے، یہ صنف مقابل اس کے جذبات واحساسات کو سوز وحرکت عطا کرتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ بقائے نوع کا سامان کرے قرآن کریم میں ارشاد ہوا:

جعل لكم من انفسكم ازواجا ومن الانعام ازواجا يذرؤكم فيه

اس (اللہ تعالیٰ) نے تم ہی میں سے تمہارے لیے جوڑے بنائے اور مویشیوں کے جوڑے بنائے اس طرح وہ تمہیں پھیلاتا (تمہاری نسل چلاتا) ہے ایک دوسری جگہ فرمایا:

ومن كل شئى خلقنا زوجين لعلكم تذكرون

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم سمجھ سکو۔

ان آیات کریمہ نے صراحت کردی کہ قانون زوجیت اپنی وسعت میں کائنات کی ہر شے پر حاوی ہے اس سے نہ انسان مستثنیٰ ہے نہ دنیا کی کوئی دوسری چیز۔ اس چیز کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنے بعض ذاتی استعداد اور نوعی خصوصیات اظہار

کے لیے ایک میدان کی محتاج ہے اور صنف مقابل یہ میدان فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نسبت ہے جو زوجین کے درمیان پائی جاتی ہے اور دونوں مساوی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس میں کسی کی ذلت وحقارت اور عزت وسربلندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ

وہ عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

گویا اردو محاورہ کے مطابق دونوں میں لباس چولی دامن کا ساتھ ہے وہ ان کے حق میں اوڑھنا بچھونا ہیں اور یہ ان کے حق میں میاں بیوی میں وہی قرب واتصال اور وہی نسبت ہے جو لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ مرد وعورت کو ایک دوسر کے لیے لباس کی تشبیہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ لباس جس طرح انسانی جسم کو سردی، گرمی اور دیگر مضرات سے بچاتا ہے اس کے عیوب اور نقائص کو چھپاتا ہے اسی طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کو بہت سے مفاسد میں پڑ جانے سے بچاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے لیے پردہ پوشی کا کام دیتے ہیں۔

تعلق زوجیت جب ایک فطری داعیہ قرار پایا تو شریعت نے اس کی کھلے دل سے اجازت دی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ اسے سنت انبیاء قرار دیا گیا اور اس پر اجر وثواب کا وعدہ فرمایا گیا۔

مقاصد نکاح:

مرد اور عورت کے درمیان طبعی اور فطری بے پایاں کشش آدمی کو ایک ایسے موڑ پر کھڑا کردیتی ہے جہاں سے اس کے حق پرست اور بندہ ہوا وہوس ہونے کا بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف جذبات اور ہیجان کی طوفان خیزی اسے ہر بندش کے توڑ پھینکنے پر آمادہ کرتی ہے تو دوسری طرف خدا کا خوف اور عقل وفطرت کے تقاضے اسے حدود کی پاسداری پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ کش مکش آدمی کے دعویٰ ایمان کے لیے کسوٹی بن جاتی ہے کہ کہاں تک اپنے عزم واعتقاد میں سچا ہے۔

کامیابی اسی شخص کے لیے ہے جو اس کش مکش میں عفت اور پاکبازی کا دامن نہ چھوڑے اور جذبات کے اندھے، بہرے تقاضے اس کو جادہ مستقیم سے منحرف نہ کر دیں۔

عفت و عصمت اور پاکدامنی اور طبعی جنسی خواہشات کی جائز تکمیل اور جنسی بے راہروی سے بچنے کے لیے شریعت نے ہر مسلمان مرد اور عورت کو حکم دیا کہ وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار کی کوشش نہ کرے بجز اس کے کوئی معاشی یا جسمانی مجبوری لاحق ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفرج.

اے گروہ نوجوانان! تم میں سے جو (عورت کی) ضرورت (گھر، نان، نفقہ وغیرہ) کو پورا کر سکتا ہو اسے ضرور شادی کر لینا چاہیے کیونکہ رشتہ ازدواج آنکھ کو نیچا کرنے والا (بدنگاہی سے محفوظ کرنے والا) اور شرم گاہ کو (برائی سے) بچانے والا ہے۔

حدیث ہذا اور نکاح کے سلسلے کی آیات قرآنی سے مترشح ہوتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا مقصد محض جنسی جذبات کی تسکین نہیں بلکہ نکاح کے دیگر متعدد دینی اخلاقی اور تعمیری و تربیتی مقاصد و فوائد اور مصالح ہیں۔ ورنہ یہ سنت انبیاء کا درجہ نہ پاتا۔ قضائے شہوت تو ایک ضمنی چیز ہے۔ علامہ سرخسی نے مبسوط میں لکھا ہے۔

لیس المقصود بهٰذا العقد قضاء الشهوة وانما المقصود مابیناه من اسباب المصلحة ولکن اللّٰه تعالیٰ علق به قضاء الشهوة ایضاً لیرغب فیه المطیع والعاصی، المطیع للمعانی الدینیة والعاصی لقضاء الشهوة.

ترجمہ: اس عقد (نکاح) سے مقصود قضائے شہوت نہیں بلکہ مقصود دراصل وہ مصالح ہیں جن کو ہم بیان کر چکے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قضائے شہوت کو بھی معلق کر دیا ہے تاکہ اس میں اطاعت گزار اور نافرمان، دونوں قسم کے لوگ رغبت رکھیں، اطاعت گزار تو دینی مقاصد کی تکمیل و تحصیل کے لیے اور نافرمان قضائے شہوت کے لیے قرآن مجید کی رو سے اسلامی قانون ازدواج نکاح کا اولین مقصد

عفت وعصمت اور اخلاق کی حفاظت ہے۔ارشاد ہوا:

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ۔

محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئیں بشرطیکہ تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو' نکاح میں لانے کے لیے نہ کہ شہوت رانی کے لیے سورۃ النساء کی آیت نمبر 25 میں عورتوں کے لیے مُحْصِنٰتٍ کا لفظ استعمال ہوا۔سورۃ المائدہ کی آیت 5 میں پھر عورتوں کے لئے مُحْصِنٰت اور مردوں کے لیے مُحْصِنِیْنَ کی قید لگائی گئی۔ان آیات میں نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا گیا ہے اور لفظ حصان ''حصن'' سے ماخوذ ہے کے جس کے معنی قلعہ کے آتے ہیں اس طرح احصان کے معنی قلعہ بندی کے ہوئے۔جو مرد نکاح کرتا ہے وہ ''محصن'' ہے گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ مُحْصَنَۃ یعنی اس قلعہ کی حفاظت میں آ گئی ہے جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے۔کہ اسلام میں نکاح کا اولین مقصد اخلاقی اور عصمت کا تحفظ ہے۔یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر دوسری غرض کو قربان کیا جا سکتا ہے مگر کسی دوسری غرض کے لیے اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔زوجین کے درمیان جب کبھی بھی اس مقصد کے فوت ہو جانے کا اندیشہ قوی ہو تو پھر شریعت سرے سے نکاح ہی کو ختم کرنے کا حکم دیتی ہے۔

قرآن مجید کی رو سے نکاح کا دوسرا اہم مقصد مرد اور عورت کی باہمی تسکین مودت ومحبت اور راحت ہے۔ارشاد ہوا'

ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا.

وہی ہے جس نے تم کو تن واحد سے پیدا کیا اور اس کے لیے خود اس کی جنس سے ایک جوڑ ا بنایا تا کہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ.

اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے لیے خودتم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اس نے تمہارے (میاں بیوی کے) درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

میاں بیوی کا یہ باہمی سکون وراحت اور مودت ورحمت محض لذت کا سکون نہیں بلکہ یہ وہ بنیاد ہے جس کا وجود تمدن انسانی کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوت بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ خانگی زندگی کی مسرت اور آرام وسکون کے باعث ہی انسان فضل وکمال کو حاصل کرتا اور اخلاق عالیہ کا ملک بنتا ہے۔

یہ نکاح کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ جن پر کئی ایک دیگر دنیوی واخروی منافع وفوائد متفرع ہوتے ہیں۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اور ابوزہرہ مصری نے الاحوال الشخصیھۃ میں نکاح کے فوائد اور مصالح وحکمتوں پر قدرے تفصیلاً بحث کی ہے۔

انہی ارفع مقاصد کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا اور اس سنت پر عمل نہ کرنے والے سے اپنی لاتعلقی کا اظہار فرمایا علاوہ ازیں متعدد روایات میں تبتل (ترک نکاح) سے سختی سے منع فرمایا۔

نکاح کے معاملے میں عورت کی آزادی اور رضامندی:

نکاح انسانی زندگی میں انتہائی اہم موڑ اور ایک نئی زندگی کے آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے شریعت اسلامیہ میں نکاح ایک مستقل اور تادم زیست کا معاہدہ ہے جسے ناگزیر حالات ہی میں توڑا جاسکتا ہے لہٰذا شریعت ایک عاقل بالغ مرد اور عورت کو اس بات کا پورا پورا حق دیتی ہیں۔ اور موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اس جاودانی معاہدے سے قبل اچھی طرح غور وفکر کرلے سوچ سمجھ لے دیکھ بھال لے اور جانچ پرکھ لے کیونکہ اسے اپنے ساتھی کے ساتھ پوری زندگی گزارنی ہے لہٰذا زندگی بھر کا ساتھی ایسا ہونا چاہیے جو اس کے لیے باعث سکون اور باعث رحمت ہو تا کہ کہیں اس کی زندگی خوشیوں کا گہوارہ بننے کی بجائے

تلخیوں کا موجب نہ بن جائے۔

مرد تو اس انتخاب میں ہمیشہ سے مکمل اختیارات کا مالک چلا آیا ہے۔ مگر عورت کی وہ پوزیشن نہ تھی۔ اسلام نے انتخاب زوج کے سلسلے میں عورت کو بھی پورا پورا اختیار دیا ہے۔ وہ اپنی مرضی اور رضامندی سے جس آدمی سے بھی شرعی حدود و قیود کی موجودگی میں نکاح کرنا چاہے کر سکتی ہے۔ عزیز و اقارب حتی کہ والد کو بھی اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس پر اپنی مرضی کو ٹھونسے جب تک عورت کی صریح اجازت نہ ہو اس وقت تک نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتنکح الایم حتی تستا مرو لاتنکح البکر حتی تستاذن

شادی شدہ عورت کا نکاح (بیوگی یا طلاق کے بعد) اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس سے مشورہ نہ لے لیا جائے اور دوشیزہ کا نکاح بھی اس کی اجازت لیے بغیر نہیں کیا جائے گا۔

امام بخاری نے اس حدیث کا باب ہی ''**لا ینکح الاب و غیرہ البکر و الثیب الابرضا ھا**'' کے عنوان سے باندھا ہے جس کا معنی ہے باپ یا کوئی اور ولی دوشیزہ اور خاوند دیکھی عورت کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہیں کرا سکتا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

لایجزو نکاح احد علی بالغة صحیة العقل من اب او سلطان بغیر اذنھا بکر اکانت او ثیبا فان فعل ذالک فالنکاح موقوف علی اجاز تھافان اجازته جاز و ان ردته بطل.

کسی باپ یا بادشاہ کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوشیزہ یا خاوند دیکھی عورت کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف ہے اگر وہ منظور کر لے تو فبہا ورنہ وہ نکاح باطل ہو جاتا (ٹوٹ جاتا) ہے۔

مسلم شریف کی حدیث میں ہے۔

الایم احق بنفسھا من ولیھا و البکر تستاذن فی نفسھا و اذنھا

صماتها.

شادی شدہ عورت (بیوگی یا طلاق کے بعد) اپنے نفس کی اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے اور دوشیزہ سے اس کے نفس (نکاح) کے معاملے میں اجازت طلب کی جائے گی اور اس کا خاموش رہنا ہی اس کی اجازت ہے۔

باکرہ لڑکی کی خاموشی کو اس لیے اجازت سمجھا گیا کہ اس میں حیا زیادہ ہوتی ہے اور عموماً زبان سے نہیں بولتی۔ پھر خصوصاً والد کے سامنے بولنا تو اور مشکل ہو جاتا ہے۔

جن روایات میں ولی کی اجازت یا موجودگی مذکور ہے وہ نابالغہ کے نکاح پر محمول ہیں استحباباً و اقتضاءً جس بالغہ عورت کو اپنی ذات اپنے مال اور دیگر امور میں تصرکا حق حاصل ہے اسے نکاح کے معاملے میں حق کیوں نہیں حاصل ہوگا۔

نابالغ کا نکاح:

نابالغ لڑکی یا لڑکے میں چونکہ سمجھ و فکر کی کمی ہوتی ہے۔ اپنے برے بھلے کی تمیز نہیں کر سکتے' ان کے عقود' خرید و فروخت معتبر نہیں ہوتے اس لیے شرعاً ان کا اختیار کامل ولی کو دیا گیا ہے صغیر اور نابالغہ کے نکاح کے سلسلے میں بھی فقہاء کے نزدیک ولی کو ولایت اجبار حاصل ہے مگر یہ حق صرف باپ اور دادا کو حاصل ہے۔ کیونکہ ان سے بہت کم ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ لڑکی کے منافع' اس کی مصلحتوں' ضروریات اور بھلائی کو پس پشت ڈال کر اپنے مصالح اور منافع کے لیے اس کو قربان کر دیں گے۔ ہدایہ میں ہے۔

لانهما لاملا الرای و افرا لشفقة.

کیونکہ وہ دونوں (باپ دادا) پوری رائے (سمجھ) اور (لڑکی کے معاملے میں) بہت زیادہ شفیق ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کا کیا ہوا نکاح بعد از بلوغ بھی صحیح ہوگا۔

تاہم اگر یہ ثابت ہو جائے کہ باپ یا دادا نے چھوٹی بچی کی مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر صرف اپنے منافع کو سامنے رکھا ہے تو یہ نکاح شرعاً صحیح نہیں ہوگا۔

صغیرہ کا خیار بلوغ:

باپ اور دادا جو اولاد پر انتہائی شفیق ہوتے ہیں اور جن کو ولایت تامہ حاصل ہوتی ہے اگر وہ چھوٹی لڑکی کے مصالح پس پشت ڈال دیں تو ان کا کیا ہوا نکاح بھی بعض صورت میں باطل ہو جاتا ہے تو ان کے سوا دوسرے رشتہ دار مثلاً چچا یا بھائی یا وہ جن کو ولایت بعیدہ حاصل ہوتی ہے اگر ایسا نکاح کر دیں تو بدرجہ اولیٰ نکاح فسخ ہو سکے گا۔ مگر اس کے لیے ہمارے فقہاء نے ایک شرط لگائی ہے کہ آثار بلوغ (حیض وغیرہ) کے ظاہر ہوتے ہی لڑکی اپنی ناپسندگی کا اظہار کر دے۔

مسئلہ کفو:

اگر چہ تمام انسان مرد و عورت سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اس اعتبار سے تمام اقوام اور افراد عالم بحیثیت انسان مساوی درجہ رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود نکاح کے مسئلے میں شریعت نے کفایت (ہمسری) کو ملحوظ رکھا ہے اور غیر کفو میں نکاح کرنے کو نامناسب سمجھا ہے۔ کیونکہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ ازدواجی تعلق ایسے مرد اور عورت کے درمیان قیام ہو جن کے درمیان غالب حال کے لحاظ سے مودت و رحمت کی توقع ہو اور جہاں یہ توقع نہ ہو وہاں رشتہ کرنا مکروہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح سے قبل (منکوحہ بننے والی) عورت کو دیکھ لینے کا حکم یا کم از کم مشورہ دیا ہے۔

نکاح کے بعد میاں اور بیوی دونوں کی خواہش ہوتی ہے کہ آپس میں موافقت محبت و موانست رہے دونوں کے میل ملاپ اتفاق و اتحاد سے خانگی امور کا انتظام ہو اور دونوں راحت و آرام کی زندگی بسر کریں۔ دوسرے یہ کہ سسرالی رشتہ داروں سے بھی کوئی بگاڑ نہ ہو بلکہ پرانی رشتہ داریوں اور محبت و مودت کے تعلقات کی از سر نو تجدید ہو ایک دوسرے کے معاون مددگار اور خوشی اور غمی کے شریک ہوں۔

یہ تمام مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ دونوں میاں بیوی کے مزاجوں میں مکمل یا قریب قریب ہم آہنگی ضرور ہو۔ اخلاق و عادات خاندانی روایات اور

طرز معاشرت کی خصلتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں۔ اب چونکہ ہر خاندان، قبیلہ اور ہر برادری کے عادات واطوار طرز معاشرت اور مزاجوں میں قدرتی طور پر اختلاف ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہوئی کہ کفالت کا لحاظ رکھا جائے تاکہ نکاح کے فوائد اتفاق واتحاد اور مصالح مقتضیہ فوت نہ ہو جائیں۔

فقہائے احناف کے نزدیک کفاد (ہمسری) کی بنیاد درج ذیل چھ چیزیں ہیں اگر کفو کا اعتبار کیے بغیر کوئی ولی کسی نابالغہ کا یا بالغہ لڑکی خود اپنا نکاح غیر کفو میں کرے گی تو ہر دو صورتوں میں نابالغہ کو اور ولی کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ وہ عدالت سے نکاح کو فسخ کرا سکے وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔

نسب[1]۔ اسلام[2]۔ حریت[3]۔ مال[4]۔ دیانت[5]۔ حرفت[6]۔

مہر:

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ نکاح اسلام میں زوجین کے درمیان ایک مستقل معاہدہ ہے کیونکہ نکاح کا فائدہ تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ یہ عقد موبدہ ہو۔ ہنگامی، عارضی اور وقتی تعلق سے وہ فوائد منزلیہ حاصل نہیں ہو سکتے جن کا حصول اول الذکر صورت میں مقصود ہے اب شریعت نے مرد کے اختیار طلاق کے بے جا استعمال کو روکنے کے لیے مہر کا تقرر فرمایا۔ کیونکہ مالی خسارہ اس کے پیش نظر رہے گا تو وہ عام حالات میں آمادہ طلاق نہ ہوگا۔

دوسرے یہ کہ انسانی فطرت ہے کہ جو چیز انسان کو مفت میں مل جائے اور اس کے حصول پر اسے کچھ خرچ نہ کرنا پڑے تو وہ عموماً اس کی قدر نہیں کرتا۔ لہٰذا شریعت نے انسانی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے عقد نکاح کو معزز اور باقدر و قیمت بنانے کے لیے مرد کے ذمہ مہر کو ضروری قرار دیا۔

تیسرے یہ کہ ایک عورت جب اپنے والدین کے گھر سے بیاہ کر اپنے مستقل ہمسفر زندگی کے گھر آتی ہے تو وہ بالکل ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ جس میں اسے گھر بار بسانے کے لیے متعدد اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا شریعت نے مرد کے اوپر لازم

ٹھہرایا کہ وہ اس سلسلے میں عورت کی کچھ معاونت کرے تا کہ وہ گھریلو انتظام کو بحسن وخوبی اور بہ سہولت سرانجام دے سکے۔

مہر مرد کی طرف سے ایک لازمی ہدیہ اور عورت کا ضروری حق ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَاءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ. [۲۶]

ان محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئیں تا کہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو حاصل کرو۔ نکاح میں لانے کے لیے نہ کہ آزاد شہوت رانی کے لیے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً.

اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔

پھر حکم ہوا۔

وَآتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ.

اور مناسب طور پر ان کے مہر ادا کرو۔

فقہائے احناف کے نزدیک مہر واجب ہے اگر چہ بوقت نکاح مہر کا نام نہ بھی لیا گیا ہو (یعنی مقرر نہ کیا گیا ہو) نکاح بہر حال بدون ذکر مہر بھی صحیح ہوگا اور مہر مثل واجب ہوگا۔

مہر جب عورت کا حق ہے تو وہ اپنے حق کو معاف بھی کر سکتی ہے قرآن میں فرمایا گیا:

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًا.

پھر اگر وہ (عورتیں) خوش دلی کے ساتھ مہر میں سے کچھ معاف کر دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ۔

مقدار مہر میں اختلاف کی بنا پر فقہاء میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک مہر کی مقدار کم از کم دس درہم ہے۔ جو رائج الوقت وزن کے اعتبار سے

دو تولے اور تقریباً گیارہ ماشے بنتے ہیں۔ اگر درہم (چاندی) کے علاوہ کوئی چیز مہر قرار پائے تو اس کی قیمت بوقت عقد دس درہم چاندی سے کم نہ ہو۔

اور زائد مہر کے لیے شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی تاہم گنجائش سے زیادہ مہر کا مقرر ا چھا نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروق کا حکم ہے۔

خبردار عورتوں کے مہر زیادہ نہ باندھو۔ اگر مہر کی زیادتی دنیا کے اعتبار سے بڑائی ہوتی یا تقرب الی اللہ کا سبب ہوتی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ آپ ایسا کرتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت سے اپنا نکاح کیا ہو یا اپنی صاحب زادیوں میں سے کسی کا نکاح کر دیا ہو اور بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر باندھا: د۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بارہ اوقیہ کے 480 درہم ہوئے۔

بہر حال مہر کی زیادتی عند الشرع پسندیدہ نہیں اور نہ یہ کوئی بڑائی کی بات ہے۔ علاوہ ازیں یہ مروت انسانی کے بھی تو خلاف ہے کہ جو رفیق حیات اور مونس وغمخوار بن رہا ہے اس پر مہر کا اس قدر بار لا دیا جائے کہ وہ زندگی بھر ادا نہ کر سکے اور قرضے کا ایک عظیم بوجھ کاندھے پر رکھے رہے۔

وطی اور خلوت صحیحہ یا زوجین میں سے کسی کی موت سے مہر موکد ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مقرر مہر میں کمی نہیں ہو سکتی۔ اگر مباشرت سے قبل ہی طلاق کی نوبت آ گئی تو مقرر مہر کا نصف مرد کے ذمہ ہوگا۔

مہر میں ہر وہ چیز صحیح ہے جس پر مال متقوم کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ یا جس چیز کو مال نہ کہا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ مرد اتنا عرصہ عورت کی خدمت کرے گا' سال بھر اس کی کھیتی باڑی کرے گا یا اسے (بیوی کو) حلال وحرام اور حج وعمرہ کے احکام کی تعلیم دے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں مہر کا بدل نہیں ہو سکتیں اگر یہ چیزیں مہر کا مقرر ہوئیں تو مہر مثل واجب ہوگا۔[۳۴] یعنی اتنا مہر جتنا اس عورت کے قبیلہ والیوں کا عموماً باندھا جاتا ہے شغار (جسے پنجابی میں وٹہ سٹہ کہتے ہیں) یعنی ایک شخص اپنی لڑکی یا بہن کا نکاح دوسرے سے کر دے اس شرط پر کہ وہ

(دوسرا) اپنی لڑکی یا بہن کا نکاح اس سے کر دے گا۔ اور ہر ایک کا مہر دوسرا نکاح ہو تو ایسا کرنا شریعت میں گناہ ہے۔ ایسی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا۔

مہر کی قسمیں:

مہر کی دو قسمیں ہیں۔ معجّل اور مؤجل، معجّل وہ ہے جو خلوت سے قبل یا عندالنکاح دیا قرار پایا ہو اور مؤجل وہ ہے جس کے لیے کوئی معیاد و وقت مقرر ہو۔ مہر معجّل کی صورت میں عورت کو اس بات کا شرعاً حق حاصل ہے کہ وہ وصول کرنے تک اپنے نفس سے خاوند کو باز رکھ سکتی ہے۔ اور شوہر کے لیے جائز نہیں کہ وہ عورت پر زبردستی کرے اور اگر تمام کا تمام مہر مؤجل ہو تو پھر عورت کو یہ حق نہیں کہ وہ ایسا کرے۔

جہیز:

جہیز کے سلسلے میں قرآن وسنت سے کوئی صریح حکم یا ممانعت نہیں ملتی اس لیے والدین کی طرف سے رخصتی کے وقت اپنی لڑکی کو مناسب جہیز (جس میں نہ اسراف ہو نہ قرض اٹھایا گیا ہو اور نہ نمائش مقصد ہو) دنیا مباح معلوم ہوتا ہے ہمارے ملک میں والدین کی طرف سے جہیز کو لازم تصور کر لیا گیا ہے شرعی نقطہ نگاہ سے ٹھیک نہیں ہے شریعت کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتی۔ جہیز کے لزوم ہی کا نتیجہ ہے کہ باپ حلال وحرام کی تفریق کیے بغیر پتہ نہیں کیا کہ گزرتا ہے اس لیے مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس رسم کو یا تو نہایت سادگی سے ادا کیا جائے یا سرے سے ختم ہی کر دیا جائے کیونکہ اس کے مفاسد اس کے مصالح سے زیادہ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں صرف حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا جہیز ملتا ہے مگر وہ بھی آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گرہ سے نہیں دیا بلکہ حضرت علی المرتضیٰؓ کی زرہ فروخت کرا کر بنایا گیا ہے دوسرے وہ جہیز اتنا مختصر اور اتنا سادہ ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اتنا کچھ بھی غالباً اس لیے فرمایا گیا کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کو بالکل ایک نیا گھر بسانا تھا۔ باقی صاحبزادیوں کی رخصتی میں تو یہ چیز بھی نہیں ملتی۔

بہر حال والد نے اگر اپنی لڑکی کو جہیز میں کچھ دیا ہے اور وہاں عرف میں عاریۃً نہیں دیا جاتا ہو تو وہ واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ لڑکی والے اگر کچھ لیے بغیر نکاح یا رخصتی نہ کر دیتے ہوں تو خاوند اس کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے کیونکہ شرعاً وہ رشوت ہے۔ والدین نے اپنی لڑکی کو جہیز دیا۔ بعد میں کہتا ہے کہ عاریۃً دیا تھا اور لڑکی یا اس کے مرنے کے بعد اس کا شوہر اس بات کا مدعی ہے کہ بطور تملیک دیا تھا۔ اب دیکھا جائے گا کہ اگر وہ ایسی چیز ہے جسے لوگ عموماً جہیز میں دیا کرتے ہیں تو پھر لڑکی یا اس کے شوہر کا قول مانا جائے گا اور اگر عموماً یہ بات نہ ہو بلکہ عاریۃً اور بطور تمایک دونوں طرح دینے کا رواج ہو تو اس کے باپ یا ورثا کا قول معتبر ہوگا۔

کسی لڑکی نے اپنے ماں باپ کے مال سے اور اپنی دستکاری سے جہیز کے لیے کچھ سامان بنایا۔ اس کی ماں فوت ہوگئی اس کے باپ نے اس کی تیار کردہ اشیاء اسے جہیز میں دے دیں تو اس کے باقی بہن بھائیوں کو حق نہیں کہ وہ ماں کی طرف سے میراث کا دعویٰ کریں۔ ماں نے بیٹی کے لیے اس کے باپ کے مال میں سے جہیز تیار کیا یا کوئی چیز جہیز میں اسے دے دی باپ کو معلوم ہوا مگر خاموش رہا اور لڑکی رخصت کر دی گئی تو اب باپ اس جہیز کو لڑکی سے واپس نہیں لے سکتا۔

نفقہ:

ازدواجی زندگی کو زیادہ بہتر اور پرسکون بنانے کے لیے اسلام نے زوجین کے دائرہ عمل کی تقسیم فرما دی ہے عورت کا کام عام حالات میں گھر کے اندر بیٹھ کر بچوں کی تربیت گھر کی نگہداشت اور دیگر خانگی فرائض کو سرانجام دینا ہے۔ قرآن مجید میں امہات المومنین (حضورؐ کی ازواج مطہرات) کو حکم ہوا۔

وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ.

اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو۔

اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل و عیال کے واسطے ضروریات زندگی فراہم کرنا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ.

وسعت والے کو اپنے اہل پر خرچ اپنی وسعت کے موافق کرنا چاہیے۔ اور جس کی آمدنی کم ہو اسے چاہیے کہ اسے اللہ نے جتنا دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

اور جس کا بچہ ہے' اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا' موافق دستور کے

رہائش مہیا کرنے کے سلسلے میں حکم ہوا۔

اَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ.

ان کو اپنی حیثیت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو۔

نفقہ سے مراد کھانا پینا' کپڑا لتا' رہنے کا مکان اور دیگر ضروریات لازمہ ہیں' شرعی نقطہ نگاہ سے بصورت نکاح صحیح بیوی کا نفقہ مرد کے اوپر واجب ہے بیوی چاہے مسلمان ہو یا ذمیہ' غریب ہو یا امیر' بالغہ ہو یا نابالغہ بیوی نے جب اپنا آپ خاوند کے سپرد کر دیا ہے تو اب خاوند اس کی جملہ جائز ضروریات زندگی کا ذمہ دار ہے۔

اگر بیوی نافرمان ہو کر خاوند کے گھر سے چلی جائے تو اس کا نفقہ خاوند پر واجب ہے۔ اور اگر گھر سے باہر نہ نکلے تو اس صورت میں بھی خاوند پر نفقہ واجب ہے۔

خاوند کم سن ہو یا مقطوع الذکر ہو یا خصی ہو یا ایسا بیمار ہو کہ جماع پر قدرت نہ رکھتا ہو یا بالکل فقیر ہو تو بھی بیوی کا نفقہ اس پر واجب ہے۔ کیونکہ نفقہ کی علت محقق ہے اور وہ بیوی کا اپنے آپ کو سپرد کر دینا ہے۔

خاوند کے گھر میں اگر بیوی بیمار ہو جائے تو اس کا علاج خاوند کے ذمہ ہے۔

کھانے پکانے کے جملہ ضروری برتن' سامان اور اثاث البیت (چارپائی' لحاف' تکیہ' چادر' دری' قالین وغیرہ) یوں ہی جسمانی طہارت وصفائی کے لیے ضروری اشیاء (صابن' تیل' کنگھا وغیرہ) مرد کے ذمہ ہیں۔

عورت اگر چائے یا حقہ وسگریٹ کی عادی ہو تو اس کا خرچ خاوند پر واجب نہیں۔ اسی پر پان' چھالیہ اور تمبا کو وغیرہ کا قیاس کیا جائے گا جو عموماً بطور عادت استعمال ہوتی ہیں نہ کسی بطور غذا۔

سال میں کم از کم دو جوڑے کپڑے (ایک سردیوں کے لیے دوسرا گرمیوں کے لیے) بیوی کے لیے مرد پر واجب ہیں۔

خاوند پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ بیوی کے لیے علیحدہ مکان مہیا کرے۔ جس میں اس کے خاندان کا کوئی دوسرا فرد نہ رہتا ہو۔ ہاں اگر عورت خود سے اپنے اس حق سے دستبردار ہو جائے اور خاوند کے گھر والوں کے ساتھ رہے تو وہ دوسری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عورت کا نفقہ خاوند پر ہر حال میں واجب ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا اور بصورت انکار یا بصورت عدم استطاعت اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ (عورت از خود کل نفقہ یا بعض نفقہ نہ ملنے کے باوجود اپنے شوہر کے ساتھ قطع تعلق نہ کرنا چاہے تو یہ الگ بات ہے) البتہ نفقے کی مقدار اور قسم کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے بلکہ مرد کی مالی حالت اور استطاعت پر ہے۔

قرآن مجید نے اس بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ:

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ

مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق۔

یہ نہیں کہ غریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو یا مالدار وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔

محرمات:

انسان پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے ماں باپ بہن بھائیوں اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ انسان کا قریب ترین ماحول ہے جس میں وہ پھلتا پھولتا اور نشوونما پاتا ہے۔ قدرت کا عطا کردہ یہ ماحول انسان کا بے لوث خادم ہوتا ہے اس

کے رنج وراحت اور خوشی وغم کو اپنا رنج وراحت اور خوشی وغم تصور کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسان نے غیر شعوری طور پر اس ماحول کو ایک مقدس حرم کی حیثیت دے دی اور اس کے ساتھ انتہائی عقیدت اور محبت کے جذبات وابستہ کر دیے۔

اس کا ایک بڑا فائدہ یہ نکلا کہ انسان جس دائرہ میں شب وروز رہتا اور زندگی گزارتا ہے وہ اخلاقی خرابیوں سے بڑی حد تک محفوظ ہو گیا ورنہ ایسے دائرہ میں میل جول اور اختلاط کی وجہ سے ہر طرح کی بے راہروی کے قوی امکانات موجود تھے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ اسلام نے جن رشتوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں زیادہ تر دور جاہلیت ہی سے حرام چلے آتے تھے۔اسلام نے ان میں چند اصلاحیں کر کے ان رشتوں کو اسی حال پر رکھا ہے دوسری بات یہ ہے کہ سورہ النساء کی آیت نمبر 23 میں جن رشتوں کو حرام ٹھہرا گیا ہے ایک سلیم الفطرت انسان طبعی طور پر ہی ان کی رغبت نہیں کر سکتا۔طبیعت سلیمہ ان سے جماع کا خیال تو کیا نظر بد بھی ان کی طرف اٹھانا گوارا نہیں کرتی بلکہ غلبہ وہیجان شہوت کے وقت ان کا خیال وتصور بھی شہوت کو ٹھنڈا کر دینے کے لیے سرد پانی کا کام کرتا ہے۔

محرمات کے بیان میں فقہاء کے اندر چنداں اختلاف نہیں پایا جاتا۔فقہ کی تمام مسلمہ کتب میں محرمات کی تفصیلات وجزئیات موجود ہیں میں یہاں عبدالرحمٰن الجزیری کی کتاب ''**الفقہ علی مذاہب الاربعہ** سے ایک اقتباس درج کر رہا ہوں جو میرے خیال میں محرمات کے بیان کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

نکاح کی متفق شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس عورت سے نکاح مطلوب ہے وہ عقد میں آنے کی صلاحیت رکھتی ہو جو عورتیں عقد کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کے ساتھ عقد کرنا جن وجوہ کی بنا پر حرام ہو جاتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔

ایک تو وہ وجوہ میں جن کی بناء پر عورت ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔

دوسری وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر عورت عارضی طور پر حرام ہوتی ہے جب حرام ہونے کی وجہ دور ہو جائے تو وہ پھر حلال ہو جاتی ہے۔

وہ وجوہ جن کی بنا پر کسی عورت کے ساتھ نکاح ہمیشہ کے لیے حرام جاتا ہے تین ہیں: نسب شادی یا دودھ۔

نسب کی بناء پر تین قسم کی عورتیں دائمی طور پر حرام ہو جاتی ہیں۔ پہلی قسم میں اوپر اور نیچے (یعنی شاخ اور جڑ) کی نسبی عورتیں داخل ہیں جڑ میں ماں جس کے پیٹ وہ پیدا ہوا اور وہ جو کسی جہت سے اس کی جدہ ہو خواہ باپ کی طرف سے ہو یا ماں کی طرف سے (یعنی دادای ہو یا نانی) اور اس سے اوپر۔ اور شاخ میں اس کی بیٹیاں نواسیاں اور پوتیاں اور اس سے نیچے (یہ سب محرمات ابدیہ میں ہیں)

دوسری قسم ماں باپ کی شاخیں ہیں ان میں بہنیں ہیں خواہ کسی جہت سے ہوں حرام ہیں یعنی خواہ حقیقی بہن ہو یا باپ شریک یا ماں شریک ہو اسی طرح بہنوں کی بیٹیاں (یعنی بھانجیاں) اور ان کے بیٹوں یعنی بھانجوں کی بیٹیاں اور بھائی کی بیٹیاں یعنی بھتیجیاں اور بھتیجوں اور ان سے نیچے کی اولاد۔

تیسری قسم دادا اور نانا کی شاخیں یعنی پھپیاں اور خالائیں خواہ وہ حقیقی ہوں یا سوتیلی۔ نسبی محرمات کی گنتی یہیں تک ہے۔ لہٰذا پھپھی اور خالاؤں کی بیٹیاں حرام نہیں ہیں اور نہ چچا یا ماموں کی بیٹیاں اور دادی کی شاخ میں بجز اس کے جو نسب میں پہلے درجہ پر ہے اور کوئی حرام نہیں ہے۔

شادی کے رشتہ سے بھی تین قسم کی عورتیں حرام ہیں۔

پہلی قسم اس عورت کی شاخ جس سے تخلیہ ہو چکا ہو۔ لہٰذا بیوی کی بیٹی سے جو اس کی (یا سوتیلی بیٹی ہے) شادی حرام ہے خواہ اس لڑکی کی کفالت (پرورش) اس نے کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں جو فی حجور کم آیا ہے (یعنی وہ لڑکی جو خانہ پروردہ ہو) اس سے اس کی کیفیت کا بیان کرنا مقصود ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ بھی تمہاری بیٹی کی مانند ہے جسے تم نے اپنے حجرہ (گھر) میں پالا ہے۔

اسی طرح ربیبہ کی بیٹی (سوتیلی نواسی) اور اس بیٹی کی بیٹی سے بھی نیچے سے نیچے درجہ تک شادی حرام ہے لیکن اگر اس کی ماں سے صرف نکاح ہوا ہے اور تخلیہ نہیں ہوا تو وہ

لڑکی حرام نہیں ہے۔

دوسری قسم بیٹی کی جڑ ہے لہٰذا نکاح کے ہوتے ہی بیوی کی ماں (ساس) اور اس کی نانی (یعنی نینا ساس) اور داری (یعنی رویا ساس) حرام ہو جاتی ہیں اگر چہ اس سے تخلیہ نہ ہوا چنانچہ کہتے ہیں کہ بیٹی سے نکاح ہو تو اس کی ماں حرام اور ماں سے تخلیہ ہو تب بیٹی حرام۔ غالباً اس میں حکمت یہ ہے کہ بچپن کی حالت اور اوائل عمری میں لڑکی کا تعلق مرد کے ساتھ گہرا ہوتا ہے اور لڑکیاں مرد کے معاملہ میں بڑی غیرت مند ہوتی ہیں اس لیے چاہیے کہ اس کے ساتھ عقد کر کے اس کی ماں سے تمام امیدیں منقطع کر لے تاکہ کسی قسم کا کینہ یا بغض ان کی محبت کے رشتہ کو نہ توڑے بخلاف ماں کے کہ اس کے لیے آسان ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی خاطر جس سے اسے سخت محبت ہے ایسے شخص کو نظر انداز کر دے جو اس کا شریک حال نہیں ہے اور اس طرح اس کا بیٹی کے ساتھ جو علاقہ الفت ہے وہ نہیں ٹوٹتا۔

تیسری قسم میں وہ عورتیں ہیں جن سے باپ نے مباشرت کی ہو۔

اب رہا دودھ کا رشتہ: اس رشتہ سے وہ تمام عورتیں حرام ہو جاتی ہیں جو نسب سے حرام ہوتی ہیں اس حکم سے بعض عورتیں مستثنیٰ ہیں جن کی تفصیل ان کے بیان میں آ رہی ہے۔

یہ وہ صورتیں ہیں جو ہمیشہ کے لیے عورت کو حرام کو دینے کا موجب ہیں لیکن وہ وجود جن سے عارضی طور پر عورت حرام ہوتی ہے وہ چند امور ہیں۔

ایک امر رشتہ دار سے شادی ہے۔ چنانچہ یہ جائز نہیں ہے کہ دو بہنوں کو عقد ازدواج میں لائے یا ماں بیٹی یا اسی طرح کی اور دو عورتوں سے شادی کرے۔ اس کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔

دوسرے ملکیت (یعنی مالک ہونا) لہٰذا عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ اپنے غلام سے شادی کرے اور نہ مرد کو حق ہے کہ وہ اپنی لونڈی سے شادی کرے جب تک کہ اسے آزاد نہ کر دے۔

تیسرے شرک، یعنی کسی مسلمان کو مشرکہ عورت سے جو کسی آسمانی دین کی پیرو نہ ہو شادی کرنا حلال نہیں ہے۔

چوتھے تین طلاق (طلاق مغلظہ) جس سے وہ حرام ہو جاتی ہے جب تک کہ وہ کسی دوسرے سے شادی نہ کر لے (اور وہ شخص طلاق نہ دے دے یا وفات نہ پا جائے)

پانچویں کسی کے ساتھ وابستہ ہونا خواہ نکاح کے باعث وابستگی ہو یا عدت کے باعث پس اگر حرام ہونے کی یہ وجوہ دور ہو جائیں تو وہ عورتیں پھر حلال ہو جائیں گی۔ اور ان وجوہ (مانع حلت نکاح) میں چار بیویوں کا موجود ہونا یا چوتھی کا عدت میں ہونا ہے کہ پانچویں سے شادی حلال نہیں ہے۔

رضاعت:

رضاعت کا لغوی معنی پستان سے دودھ چوسنا ہے مگر اصطلاح شرعی میں اس کی معنی کسی عورت کے دودھ کا ایسے بچے کے پیٹ میں جانا ہے جس کی عمر دو سال یعنی چوبیس ماہ (یا بقول امام ابوحنیفہ اڑھائی سال یعنی تیس ماہ) سے زیادہ نہ ہو۔ احناف کے نزدیک مدت رضاعت (اڑھائی سال) کے اندر جب بچہ کسی عورت کا دودھ پیتا یا چوستا ہے ایک مرتبہ ہو یا زیادہ مرتبہ رضاعت ثابت ہوتی ہے رضاعت ثابت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سوائے چند مستثنیات کے وہ تمام رشتے حرام ہو جائیں گے جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں مثلاً رضاعی ماں، رضاعی بہن، رضاعی خالہ، رضاعی پھوپھی، رضاعی بھتیجی، بھانجی وغیرہ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان الرضاعة تحرم ماتحرم الولادة.

رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت (نسب) سے حرام ہو جاتے ہیں۔

مدت رضاعت (اڑھائی سال) کے بعد اگر کوئی بچہ کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو اس سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

جس عورت کے پستان سے بچہ نے دودھ پیا ہے وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شادی بالکل بوڑھی ہو یا نو سال کی ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا حتیٰ کہ اگر مردہ عورت کا دودھ پیا گیا تو بھی رضاعت ثابت ہوگی۔

ثبوت رضاعت کے لیے زمانہ کا ایک ہونا بھی ضروری نہیں۔ ایک پستان پر جتنے بچے جمع ہوں گے ان کے زمانہ رضاعت میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو وہ سب کے سب ایک دوسرے کے رضاعی بہن بھائی ہوں گے۔

نو سال سے کم لڑکی کے پستان میں اگر دودھ آ جائے اور کوئی بچہ پی لے تو اس سے رضاعت نہیں آتی۔

اگر مرد کے پستان میں دودھ آ جائے اور کوئی بچہ نوش کر لے تو اس سے بھی حرمت رضاعت نہیں آتی۔

اگر کسی عورت کا دودھ پانی یا دوائی یا کسی جانور کے دودھ میں ملا کر دیا گیا تو عورت کا دودھ اگر پانی یا دوائی وغیرہ پر غالب ہو تو حرمت رضاعت ثابت ہو گی۔

عورت کا دودھ کھانے یا کسی دیگر مائع چیز میں ملا کر دیا جائے تو اس سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

نہ ہی بذریعہ حقنہ یا کان سے اندر پہنچانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔

اگر مرد نے اپنی بیوی کا پستان چوس لیا تو حرمت رضاعت نہیں آتی اگرچہ اندر دودھ بھی چلا جائے۔

رضاعت کے ثبوت کے لیے صرف عورتوں کی گواہی کافی نہیں بلکہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے حرمت رضاعت ثابت ہو گی۔

حضانت:

حضانت کا لفظ حضن سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''آغوش'' کے ہیں اسی سے حَـاضِـنَۃ اس عورت کو کہتے ہیں جو بچے کو اپنی آغوش میں پالتی ہے۔ اصطلاح شرع میں حضانت کے معنی صغیر سن بچے، عاجز، مجنون یا ہوش باختہ کو حتی المقدور مضرتوں سے بچانا اور اس کی اصلاح و تربیت مثلاً صاف ستھرا رکھنا کھلانا پلانا اور ضروریات راحت کا خیال رکھنا ہے۔

صغر سنی میں بچہ چونکہ والد کی بہ نسبت ماں کا زیادہ محتاج ہوتا ہے اور زیادہ شفیق

ہوتی ہے اس لیے شریعت نے بچے کی حضانت (تربیت) کا حق اولاً ماں کو دیا ہے چاہے وہ بچے کے باپ کے نکاح میں ہو یا اس سے جدائی ہو جائے۔ ہر دو حال میں وہ بچے کی زیادہ مستحق ہے۔

البتہ ماں اگر مرتد ہو جائے یا فاقہ وفاجرہ ہو یا چور ہو یا گانا گاتی ہو یا نوحہ کرنے والی ہو یا بچے کے کسی غیر محرم سے نکاح کر لے تو ان صورتوں میں اسے حق پرورش حاصل نہیں کیونکہ ان صورتوں میں بچے کے اخلاق واطوار بگڑنے کا قوی اندیشہ ہے۔ بعض فقہا نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر اس پر اللہ کی محبت اور خوف خدا اس قدر غالب ہو کر بچے کی طرف دھیان نہ دے یا بے نماز ہو یا اکثر اوقات گھر سے باہر پھرتی رہتی ہو اگر چہ یہ باہر پھرنا گناہ کے لیے نہ ہو تو ان صورتوں میں بھی اسے حق حضانت حاصل نہیں۔

اگر ماں فوت ہو جائے یا پرورش سے انکار کر دے تو پرورش کے سلسلے میں ماں کے بعد بچے کی نانی یا پڑنانی کا حق ہے۔ نانی نہ ہو تو پھر دادی کا حق ہے دادی کے بعد بالترتیب سگی بہن کا' اخیافی بہن (ماں کی طرف سے) اور علاتی بہن (صرف والد کی طرف سے) کا نمبر ہے' بہنوں کے بعد خالہ اور خالہ کے بعد پھوپھی کا حق ہے۔ مذکورہ عورتوں کو حق پرورش اسی وقت تک حاصل ہے جبکہ غیر شادی شدہ ہوں یا بچہ کے کسی محرم سے شادی کر دیں۔ غیر محرم سے شادی کرنے کی صورت میں ان کا حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔

ماں یا دیگر مذکورہ عورتوں کو اس وقت تک بچے کی تربیت کا حق حاصل ہے جب تک کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے کھا پی نہ لے کپڑے پہن لے اور استنجا و طہارت وغیرہ کرنا سیکھ نہ لے بعض فقہاء نے نو سال کی عمر کا اندازہ بھی لگایا ہے۔ اور اگر لڑکی کی ہو تو جب تک بالغہ نہ ہو جائے۔

بچے کے خاندان میں اگر کوئی عورت ایسی نہ ہو جو اس کی پرورش کر سکے تو پھر بالترتیب باپ' دادا' سگا بھائی' باپ شریک بھائی' ماں شریک بھائی' سگا بھتیجا' سوتیلا بھتیجا' سگا چچا' سوتیلا چچا' پھر چچازاد' البتہ لڑکی ہو تو چچازادوں کے حوالے نہ کی جائے گی حامنہ کی اجرت بچے کے باپ کے ذمہ ہو گی۔

بچے کی ماں اگر اس کے باپ کے نکاح میں ہے تو پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں بصورت جدائی اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی شہر میں رہے جہاں بچے کا باپ رہتا ہو۔

بچہ ماں کے پاس ہو یا باپ کے پاس دونوں ایک دوسرے کو بچے کی ملاقات سے منع نہیں کر سکتے۔

طلاق

گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ نکاح زوجین کے درمیان ایک مستقل معاہدہ ہے اور اس معاہدے سے کئی ایک دینی و دنیوی فائدے مقصود ہیں۔ وہ مقاصد و فوائد تبھی حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ اس معاہدے کو مستقل بنایا جائے۔ اسلام میں اس معاہدے کو ہمیشہ قائم اور دائم رکھنے کے لیے زوجین کو مختلف طریقوں سے تعلیم و تربیت دی گئی ہے۔ اور انہیں بتایا گیا ہے کہ حتیٰ الامکان اس عقد کو فسخ نہ کریں۔ مگر شریعت کی نگاہ میں یہ معاہدہ نکاح اتنا بھی مستحکم نہیں کہ اسے کسی حالت میں بھی ختم نہ کیا جا سکے اسلام میں نکاح عیاشی اور صرف جنسی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں بلکہ اس سے دیگر متعدد اعلیٰ و اہم مقاصد مطلوب ہیں۔ زوجین کے باہمی اجتماع سے اگر وہ اہم مقاصد پورے ہوتے نظر نہ آئیں اور حدود اللہ اور قوانین الٰہیہ کے توڑے جانے کا خدشہ پیدا ہو تو پھر شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ سرے سے اس معاہدہ کو ختم کر دیا جائے مگر یاد رہے۔ شریعت کی نگاہ میں یہ وہ آخری حربہ ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہے۔ اگر اتنی بھی اجازت نہ دی جاتی تو یہ فطرت کے خلاف ہوتا جو روح شریعت کے منافی ہے۔ پھر یہ کہ اس ناگزیر حربے کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ دوسرے یہ کہ معاہدہ نکاح کو ابدی بنانے اور زوجین کے انتہائی فوائد و منافع کا لحاظ رکھتے ہوئے احتیاطی تدابیر کی گئیں کہ اسلام میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا۔

چونکہ مرد نسبتاً زیادہ سوچ کر قدم اٹھانے والا اور بردبار ہوتا ہے دوسرے اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے اس لیے ان حقوق سے دستبردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے۔

جو شخص اپنا روپیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا اور صرف اس وقت اسے چھوڑے گا جب اس کے لیے چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ لیکن اگر صرف کرنے والا ایک فریق ہو اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے فریق کو دیا جائے تو اس دوسرے فریق سے یہ امید کم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں فریق اول کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس نے مال صرف کیا ہے مرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حقوق کی حفاظت ہے۔ بلکہ اس میں یہ مصلحت بھی مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔''

اقسام طلاق:

طلاق کا معنی ہے فوراً یا مآل (انجام) کے اعتبار سے نکاح کو اٹھا دینا۔ فقہاء نے عموماً دو طرح سے طلاق کی تقسیم بیان کی ہے' ایک تو وقت اور عدد اور طریق کار کے اعتبار سے تقسیم ہے۔ اور دوسری الفاظ طلاق اور نیت طلاق کے اعتبار سے۔

وقت اور طریق کار کے لحاظ سے طلاق کی تین قسمیں ہیں۔

احسن۔ حسن۔ بدعی۔

طلاق احسن:

یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو صرف ایک طلاق دے ایسے طہر (وہ ایام جن میں ماہواری نہیں آتی) میں جس میں اس سے مجامعت نہ کی گئی ہو۔ پھر اسے چھوڑے رکھے یہاں تک کہ عدت (تین حیض) گزر جائے۔

طلاق حسن:

اسے طلاق سنت بھی کہا جاتا ہے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی تین طہروں میں تین طلاقیں دے۔یعنی ہر طہر میں ایک طلاق۔

طلاق بدعی:

یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دی جائیں ایک ہی لفظ کے ساتھ مثلاً تجھے تین طلاق یا الگ الگ مثلاً تجھے طلاق طلاق طلاق۔احناف کے نزدیک ایسی طلاق واقع ہو جاتی ہے اگرچہ ہے گناہ۔

طلاق رجعی:

یہ ہے کہ صریح (واضح) الفاظ کے ساتھ ایک یا دو مرتبہ طلاق دی جائے۔اپنی بیوی کو صریح الفاظ کے ساتھ طلاق کہنے میں خاوند کی نیت ہو یا نہ ہو بہر صورت طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

مولانا امجد علی نے صریح الفاظ کے ساتھ طلاق دینے کی ایک سو چالیس صورتیں بتائی ہیں۔

طلاق رجعی تعلق نکاح کو فی الفور ختم نہیں کرتی بلکہ شرعاً اس میں گنجائش ہوتی ہے کہ زوج عدت کے دوران اپنی بیوی سے رجوع کر لے۔رجوع کرنے میں بیوی کی رضا مندی بھی ضروری نہیں اور رجوع یہ ہے۔کہ یا تو زبانی کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا ہے۔یا اس کے ساتھ مجامعت کر لے یا اس کا بوسہ لے لے یا شہوت کے ساتھ اسے مس کرے۔یہ اعمال گویا اس بات کے علامت ہیں کہ اس نے اپنے فیصلہ طلاق سے رجوع کر لیا ہے اور دوبارہ اپنی زوجہ کو اپنے نکاح میں رکھنے پر رضامند ہے۔طلاق رجعی میں نکاح ثانی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

طلاق بائن:

یہ ہے کہ صریح الفاظ (مادہ ط' ل' ق سے مشتق الفاظ) کے علاوہ ایسے الفاظ کنائیۃ استعمال کرلے جن میں طلاق اور عدم طلاق دونوں معنی کا احتمال ہو۔ ایسے الفاظ کہنے میں طلاق کی نیت ہونا یا ایسی صورت حال کا ہونا ضروری ہے جو طلاق پر دلالت کرتی ہو۔

کنایہ کے الفاظ مثلاً جا نکل' جا گھر خالی کر' اپنی راہ لے' تو مجھ سے جدا ہے میں نے تجھے آزاد کیا وغیرہ اکیس وائیس کے قریب ہیں۔

طلاق بائن کی صورت میں سلسلہ نکاح منقطع ہو جاتا ہے' زوجین اگر دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر رضا مند ہوں تو عدت یا عدت گزرنے کے بعد نکاح ثانی ضروری ہوگا۔

طلاق مغلظہ:

طلاق مغلظہ اور طلاق بدعی ایک ہی چیز ہے۔ یعنی ایک ہی طہر میں تین مرتبہ صریح طلاق دے دی جائے۔

ایسی طلاق کا حکم یہ ہے کہ عورت جب تک زوج ثانی کا منہ نہ دیکھ لے اس وقت سابق خاوند کی زوجیت میں دوبارہ نہیں آسکتی۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے "تحلیل" کہتے ہیں۔

طلاق دہندہ کے واسطے ضروری ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہو بچہ کی اور مجنوں...... کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

فقہائے احناف کے نزدیک مکرہ (جسے مجبور کیا گیا ہو) اور سکران (جو عمداً شراب پینے کی وجہ سے بیہوش ہوگیا ہو) ان کی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

طلاق سنجیدگی سے دی جائے یا ہنسی مذاق میں دی جائے یا یوں ہی زبان سے نکل جائے۔ تمام صورتوں میں واقع ہو جاتی ہے خاوند چونکہ طلاق دینے کا مالک ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اسے طلاق کا اختیار ہے۔ لہٰذا وہ یہ اختیار کسی دوسرے کے سپرد بھی کرسکتا ہے۔

لفظ طلاق زبان سے نہ کہے بلکہ بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے الفاظ طلاق لکھ کر بیوی کی طرف بھیج دے تو بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔

خلع:

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ بعض مصالح کے پیش نظر طلاق کا اختیار اسلام میں مرد کو حاصل ہے۔ تاہم اسلام میں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ اگر عورت کا بوجوہ مرد کے پاس گزارا مشکل ہو جائے، رشتہ زوجیت کے قائم رکھنے میں عورت کا نقصان اور اس کی حق تلفی ہوتی ہو اس کی عزت اور آبرو خطرہ میں ہو۔ اور حدود اللہ قائم نہ رہ سکتی ہو۔ تو عورت سراسر بے بس اور مجبور محض نہیں کہ ہمیشہ مظلومیت کی زندگی بسر کرے اور شوہر کے مظالم اور بے توجہی کا شکار رہے۔ بلکہ اسے یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو کچھ مال دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کر لے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے۔ کہ طلاق کی طرح یہ خلع بھی آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ورنہ شریعت کی نگاہ میں یہ بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایما امرءة اختلعت من زوجها من غير باس لم ترح رائحة الجنة.

ترجمہ: جس عورت نے بلا وجہ اور بلا ضرورت اپنے خاوند سے خلع کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ خلع فی الحقیقت کوئی قابل ستائش چیز نہیں بلکہ قبیح چیز ہے۔ بایں ہمہ بعض اوقات ضرورۃً خلع کرنا لازمی ہوتا ہے۔

خلع کا لفظی معنی جسم سے کپڑا وغیرہ اتار پھینکنا ہے اور اصطلاح شرع میں کچھ معاوضہ لے کر ملک نکاح کو لفظ خلع کے ساتھ زائل کرنا ہے خلع کا باعث اگر خود خاوند کی طرف سے ہو تو خاوند کو بیوی سے کچھ لینا مکروہ ہے۔ اور اگر خلع کا باعث عورت ہی کی طرف سے ہو تو بلا کراہت جائز ہے خلع سے فقہاء احناف کے نزدیک طلاق بائن واقع ہوتی ہے ؎۱
خلع ایک قسم کی بیع ہے۔ جب تک میاں بیوی دونوں کی طرف سے ایجاب وقبول مکمل نہ

ہو۔اس وقت تک خلع نہیں ہوتا جب خلع کی پیش کش مرد کی طرف سے ہو تو عورت کے اسی مجلس میں قبول کرنے سے قبل قبل رجوع نہیں کرسکتا۔اور اگر عورت بلا قبول کیے اس مجلس سے اٹھ جائے تو رجوع کرسکتا ہے اور اگر خلع کی پیشکش عورت کی طرف سے ہو تو وہ مرد کے قبول کرنے سے پہلے پہلے رجوع کرسکتی ہے۔

جو چیز مہر بن سکتی ہو وہ بدل خلع بھی بن سکتی ہے۔جس طرح طلاق میں طلاق دندہ (شوہر) کا عاقل بالغ ہونا شرط ہے اسی طرح خلع میں بھی شرط ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی طلاق ہے۔

جس قدر مال پر خلع ہوا ہے وہ عورت پر لازم ہوگا۔

ظہار:

ظہار کا لفظ ظہر سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیٹھ یا سواری کے ہوتے ہیں۔

اصطلاح شرع میں اس سے مراد کسی مسلمان خاوند کا اپنی بیوی (کتابیہ ہو یا چھوٹی ہو یا بڑی ہو) کو یا اس کے کسی عضو (جس سے پورا انسان مراد لیا جاتا ہو) کو محرمات ابدیہ (وہ عورتیں جن سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے۔بوجہ نسب کے یا رضاعت کے یا مصاہرت کے) یا ان کے کسی عضو (مثلاً پیٹھ، ران، پیٹ وغیرہ) سے تشبیہ دینا ہے۔

دور جاہلیت میں ظہار کا رواج تھا اور اس سے مقصود ایسی طلاق ہوتی تھی جس میں رجوع کی گنجائش نہ ہو۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں بعض صحابہ سے بھی یہ چیز سرزد ہوگئی تو قرآن مجید میں سورۃ المجادلۃ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں جاہلیت کی اس رسم یا قانون کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا۔اور واضح فرمایا گیا کہ تمہاری مائیں وہی ہیں جنہوں نے تم کو جنم دیا ہے۔یا تمہیں دودھ پلایا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہیں۔ان کے علاوہ کوئی عورت محض تمہارے کہنے سے تمہاری ماں نہیں بن جاتی۔خصوصاً وہ عورت جس سے تم تعلق زوجیت بھی قائم کر چکے ہو البتہ اس کے یہ الفاظ کہنے پر شریعت نے ہلکی سی سزا مقرر فرمائی تا کہ آئندہ کے لیے وہ ایسی جرات نہ کرسکے۔

ظہار کے لیے ضروری ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو اپنی محرمات عورتوں کے کسی عضو سے تشبیہ دے اگر اپنے باپ یا بیٹے یا دوسرے مرد محارم سے تشبیہ دی تو یہ ظہار نہ ہوگا۔

اگر اپنی بیوی سے کہا انت علی کظھر امی (تو میرے اوپر ایسے ہی حرام ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ) تو ظاہری ہوگا اگرچہ طلاق کی نیت کرے۔

مذکورہ عضو کے علاوہ کسی اور عضو سے تشبیہ دے تو مظاہر (ظہار کرنے والے) کی نیت پر موقوف ہے۔ ظہار کی نیت ہے تو ظہار اور طلاق کی نیت ہے تو طلاق مگر طلاق بائن ہوگی۔

ظہار کرنے کی صورت میں اس وقت تک بیوی سے نہ مجامعت کر سکتا ہے نہ اس کا بوسہ لے سکتا ہے اور نہ شہوت سے اسے مس کر سکتا ہے جب تک کہ کفارہ نہ ادا کرلے۔

ظہار کا کفارہ ایک غلام (مسلم ہو یا غیر مسلم' مذکور ہو یا مونث' چھوٹا ہو یا بڑا)

آزاد کرنا ہے اور اگر غلام نہ پا سکے (جیسا کہ آج کل ہے) تو دو مہینے متواتر روزے رکھے۔ ان دو مہینوں میں نہ عیدین آئیں نہ ایام تشریق تواتر ہر حال میں لازمی ہے۔ اگر کسی وجہ سے درمیان میں روزہ ترک کر دیا تو نئے سرے سے دو ماہ کے روزے رکھنا ہوں گے۔ اگر روزوں کی بھی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کا دو وقت کا کھانا ہے۔ اتنا کھانا کہ سیر ہو کر کھائیں یا ہر مسکین کو قریباً دو سیر گندم (نصف صاع) یا اس کی قیمت مہیا کرنا ہے اگر ایک ہی مسکین کو ساٹھ روز تک دن رات کھلایا تو بھی ٹھیک ہے۔

لعان:

لعان کا لغوی معنی ہانکنا اور دور کرنا ہے اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ چار حلفیہ شہادتیں ہیں جو میاں بیوی ایک دوسرے کے خلاف دیتے ہیں اور ایک شہادت میں لفظ لعنت بھی ہوتا ہے۔ مرد کی شہادت حد قذف کے قائم مقام اور عورت کی شہادت حد زنا کے قائم مقام تصور کی جاتی ہیں۔

جب شوہر اپنی محصنہ بیوی پر بالفاظ صریح زنا کی تہمت لگائے یا اس عورت سے

ہونے والی اولاد کے متعلق کہے کہ یہ اس (مرد) کی نہیں تو ان صورتوں میں لعان واجب ہوتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ النور کی آیت نمبر 6 تا 9 میں کیا گیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قاضی کے روبرو پہلے مرد چار مرتبہ حلفیہ شہادت دے کہ وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہو تو اس پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہو۔ اس کے بعد اس کی بیوی چار مرتبہ حلفیہ گواہی دے کہ وہ (اس کا خاوند) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر وہ (خاوند) سچا ہو۔ اس کے بعد قاضی ان دونوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے تفریق کر دے گا۔ لعان کے بعد وہ کبھی بھی رشتہ زوجیت میں منسلک نہیں ہو سکتے۔

اگر خاوند لعان سے گریز کرے تو اس کو قید کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ لعان کرے یا اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرے۔ جھوٹ کے اقرار میں اس پر حد قذف ہو گی۔

جس بیوی پر تہمت زنا لگا رہا ہے اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ محدود فی القذف نہ ہو اور نہ ہی بالکل بچی یا پاگل یا زانیہ ہو۔

بیوی پر تہمت زنا لگانے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عاقل بالغ ہو اگر میاں بیوی دونوں یا ان میں سے ایک گونگا ہو تو لعان نہ ہو گا۔

بچے کی نفی وہی معتبر ہے جو پیدائش کے سات دن کے اندر اندر ہو یا بوقت ولادت ہو۔ بعد کی نفی کا اعتبار نہ ہو گا۔

شوہر اگر ایک سے زیادہ مرتبہ تہمت زنا لگائے تو ایک ہی مرتبہ لعان ہو گا۔

بیوی پر اگر لواطت کی تہمت لگائی تو نہ لعان ہے نہ حد۔

بخاری شریف جلد ثانی کتاب الطلاق میں لعان کے سلسلے میں جو احادیث آتی ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:

(ا) لعان قاضی کے سامنے ہی ہو سکتا ہے عورت اور مرد آپس میں یا اپنے عزیزوں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے اور نہ ہی ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔

ب۔ لعان سے قبل قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں سے کوئی ایک

قصور کا اعتراف کر لے۔(ظاہر ہے ان میں سے ایک تو لامحالہ جھوٹا ہے جب دونوں اپنی بات پر اصرار کریں تب لعان ہے

ج۔ فریقین کی طرف سے لعان کا فعل تمام ہونے کے بعد خود بخود تفریق نہیں ہو جائے گی بلکہ قاضی ان کے درمیان تفریق کا اعلان کرے گا۔

د۔ لعان سے پیدا شدہ تفریق ابدی ہے۔اس معاملہ میں ''تحلیل'' کا قانون بھی نہیں جاری ہوتا۔

ایلاء:

ایلاء لغتہً باب افعال کا مصدر ہے جس کا معنی قسم اٹھانا ہے۔اصطلاح شرع :۔ اس سے مراد مرد کا اس بات پر قسم اٹھانا ہے کہ وہ چار ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ اپنی بیوی کے قریب نہ جائے گا (جماع نہ کرے گا)

اہل جاہلیت کی ایک رسم یہ بھی تھی کہ بعض اوقات غصہ میں آ کر یا عورت کو محض تنگ کرنے کی خاطر قسم کھا لیتے ہیں کہ عمر بھر اپنی بیوی سے ہمبستر نہیں ہوں گا اور کبھی ایک طویل مدت کے لیے اس طرح کی قسم کھا لیتے۔عورتوں کے حق میں یہ سراسر ظلم تھا۔نہ تو انہیں بیویوں کے حقوق حاصل ہوتے اور نہ ہی پہلے خاوندوں سے آزاد ہوتیں کہ کہیں نکاح ثانی کر سکیں اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی قسم اٹھانے میں مدت کی تحدید فرما دی فرمایا:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآءِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

ترجمہ: جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(اور اگر طلاق کا عزم کر لیں تو اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے)

بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس مدت (چار ماہ) کے تعین میں راز یہ ہے کہ اتنے عرصے میں خواہ مخواہ نفس اپنی صنفی خواہش پورا کرنے پر مائل ہوتا ہے۔(اس سے زیادہ عرصے تک وہ صبر نہیں کر سکتا)اور اگر وہ اپنی صنفی خواہش کو پورا کرنے سے باز

رہے تو اس سے اس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

چار ماہ سے کم مدت میں ایلاء نہیں ہوتا

فقہاء کے نزدیک بیوی کے قریب نہ جانے کو اگر ایسی عبادت پر معلق کرے جس میں مشقت اٹھانا پڑتی ہو (مثلاً روزہ، حج، صدقہ وغیرہ) تو یہ بھی ایلاء ہے۔

چار ماہ کے اندر اندر وطی کر لی تو حانث (قسم توڑنے والا ہوگا۔ کفارہ یمین (یعنی قسم کا کفارہ تین روزے یا دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا دینا) اس پر لازم ہوگا اور ایلاء اس طرح ساقط ہو جائے گا۔

چار ماہ گزرنے کے بعد احناف کے نزدیک خود بخود طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔

مولی (ایلاء کرنے والا) رجوع کرنا چاہتا ہو مگر بوجوہ جماع پر قدرت نہ رکھ سکتا ہو۔ (خود یا عورت بیمار ہو، بیوی چھوٹی ہو یا اتنی مسافت پر ہو کہ چار ماہ میں وہاں نہ پہنچ سکتا ہو) تو زبانی رجوع کرلے اور بہتر ہے کہ رجوع پر گواہ بھی بنائے۔

اور اگر مدت رجوع (چار ماہ) میں جماع پر قدرت رکھ سکے تو ضروری ہے کہ رجوع کے لیے بیوی سے مباشرت کرے۔

چار ماہ کی مدت میں میاں بیوی کا اختلاف ہو جائے تو میاں کا قول معتبر ہوگا۔

طلاق بحکم القاضی:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی کو صرف اس وقت طلاق حق حاصل ہے جب خاوند میں کوئی ایسا عیب پایا جائے جو تناسل و توالد میں مانع ہو اور پھر عورت طلاق کا مطالبہ بھی کرے۔ اگر عورت خاوند میں اس قسم کا عیب ہونے کے باوجود اس کے ساتھ رہنے پر رضا مند ہو تو پھر قاضی کو طلاق کا اختیار حاصل نہیں۔ اگر خاوند قوت مردمی سے محروم ہو (بیماری کی وجہ سے یا طبعی اور خلقی کمزوری کی وجہ سے یا بڑھاپے کی وجہ سے یا صغرسنی کی وجہ سے یا جادو وغیرہ کے اثر سے) اور بیوی کے پاس جانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو یا خصی ہو تو

قاضی اسے ایک سال کی مہلت دے گا اس دوران وہ علاج معالجہ سے اگر بیوی کے پاس جانے کے قابل ہو گیا تو فبہا ورنہ قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کرا دے گا کیونکہ اس صورت میں مقاصد زوجیت ہی فوت ہو جاتے ہیں اور جب مقاصد زوجیت پورے نہ ہو رہے ہوں تو پھر تعلق زوجیت کو قائم رکھنا بے معنی اور معاصی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر خاوند مقطوع الذکر ہو تو فی الفور تفریق کرادی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک مذکورہ تین سبب (نامردی، خصی ہونا آلہ تناسل کا کٹا ہوا ہونا) اسی سے فرقت کی جا سکتی ہے۔ امام محمد فرماتے ہیں اگر خاوند پاگل ہو یا اسے کوڑھ اور جذام کا مرض ہو تو بھی عورت کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ بذریعہ قاضی طلاق حاصل کر لے۔

میاں بیوی کا اگر (خاوند کے بیمار ہونے یعنی بیوی کے پاس نہ آ سکنے میں) اختلاف ہو جائے تو دیگر مستورات کے ذریعے عورت کا کنوارپن معلوم کیا جائے گا اور واقعی کنواری ہوئی تو تفریق کر دی جائے گی اور اگر کنواری نہ ہوئی تو پھر قاضی تفریق نہ کرے گا۔

عدت:

عدت کا لفظ عدد سے بنا ہے۔ اور یہ لفظ تعداد کے معنوں میں مصدر خلاف قیاس ہے۔ لغۃً اس کا اطلاق عورت کے ایام حیض وطہر پر ہوتا ہے۔ حنفی مسلک کے مطابق اس کی اصطلاحی تعریف یوں ہے۔ عدت وہ مدت مقررہ ہے جو نکاح یا ہمبستری کے آثار ختم ہو جانے کے لیے رکھی گئی ہے۔

اس مدت کے دوران شرعاً عورت نکاح ثانی نہیں کر سکتی۔ مرد کے لیے یہ قید نہیں کیونکہ وہ تو پہلی بیوی کی موجودگی میں بھی دوسرا نکاح کر سکتا تھا۔ اب جبکہ اس نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو بدرجہ اولیٰ دوسرا نکاح کر سکتا ہے۔ عدت کی رسم زمانہ جاہلیت میں بھی تھی۔ عرب کے لوگ نسب کے معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ عورت (جس کے ساتھ خاوند ہمبستری کر چکا ہے) کو طلاق ملنے یا کسی اور وجہ سے میاں بیوی کے درمیان تفریق ہو جانے یا خاوند کے فوت ہو جانے پر ایک خاص مدت تک عقد ثانی سے رکنا پڑتا تھا تاکہ

معلوم ہو جائے کہ زوج اول کا نطفہ رحم میں قرار پایا گیا ہے یا نہیں؟ شریعت نے اس چیز کو برقرار رکھا۔ قرآن میں حکم ہوا۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ.

ترجمہ: مطلقہ عورتیں (جن کو طلاق مل گئی ہے) اپنے آپ کو (عقد ثانی سے) تین قروء (حیض یا طہر) کے لیے روکے رکھیں عدت کا حکم صرف انہی عورتوں کے واسطے ہے جن کے ساتھ خلوت صحیحہ یا ہمبستری ہو چکی ہو۔ جس عورت کے ساتھ ہمبستری کی نوبت نہ آئی ہو اور اسے طلاق ہو جائے تو اس کے لیے کوئی عدت نہیں۔

عدت کی تین اقسام ہیں:

عدت بوضع حمل۔ عدت بالاقراء۔ عدت بالاشہر حاملہ عورت کو اگر طلاق مل جائے یا اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کی عدت وضع حمل ہے یعنی بچہ جننے تک ہے۔

اگر آزاد اور حیض والی عورت کو طلاق ہو جائے تو اس کی عدت امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین حیض (ماہواری) ہے۔

اور اگر بوجہ بڑھاپا یا صغر سنی یا کسی اور عذر کی وجہ سے ماہواری نہیں آتی تو اس کی عدت تین ماہ ہے۔

خاوند کے فوت ہونے کی صورت میں اگر عورت حاملہ نہ ہو تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔

مہینوں کا شمار قمری مہینوں کے اعتبار سے ہوگا۔

طلاق کی صورت میں بعد از طلاق اور وفات کی صورت میں بعد از وفات مدت عدت کا آغاز ہوگا۔

طلاق بائن کی صورت میں عدت کے دوران اگر دوبارہ خاوند نکاح کرنا چاہے تو اس پر نئے سرے سے مہر ہوگا۔

جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس پر چار ماہ دس تک سوگ کرنا ضروری ہے۔

سوگ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس دوران زیب و زینت نہ کرے خوشبو نہ لگائے سرمہ نہ

استعمال کرے اور نہ ہی بھڑک دار کپڑے پہنے۔

مطلقہ عورت کے واسطے ضروری ہے کہ وہ عدت وہیں گزارے جہاں وہ قبل از طلاق رہتی تھی۔

مطلقہ عورت کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ دن میں یا رات میں گھر سے باہر پھرتی پھرے البتہ جس کا خاوند فوت ہو چکا ہے اس کے لیے جائز ہے کہ وہ دن کے وقت اور رات کے کچھ حصہ میں باہر نکل سکتی ہے۔

متعدہ (جو عورت عدت گزار رہی ہے) کا نفقہ (طعام قیام لباس) مرد کے ذمہ ہے۔

البتہ جس کا خاوند فوت ہو گیا اس کا نفقہ خاوند کے ورثا پر واجب نہیں۔

چار قسم کی عورتوں پر عدت نہیں۔

ا۔ جسے دخول (ہمبستری) سے قبل طلاق مل جائے۔

ب۔ جس کا خاوند دار الحرب میں رہ جائے۔

ج۔ دو بہنوں سے نکاح کیا جائے تو فسخ نکاح کے بعد ان پر عدت نہیں۔

د۔ چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے پر فسخ نکاح کا حکم ہوگا۔ اس صورت میں بھی ان پر عدت نہیں۔

اگر عورت کا حالت حیض میں طلاق دی تو عدت میں وہ حیض شمار نہ ہوگا۔ جس میں طلاق دی گئی بلکہ اس کے بعد تین حیض شمار ہوں گے۔

مفقود الخبر کی بیوی:

اگر کسی عورت کا خاوند لاپتہ ہو جائے اور کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے یا کس حال میں ہے تو وہ عورت کیا کرے؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب بیان کرتے ہیں کہ وہ عورت اس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ اس کے خاوند کے ہم عمر لوگ زندہ ہوں اور اس کا اندازہ نوے سال ایک سو بیس سال لگایا گیا ہے۔ مگر حنابلہ اور امام مالک کی یہ رائے ہے کہ چار سال کے بعد اس کے سابق خاوند کو فوت شدہ تصور کر کے اسے عقد کر لینا چاہیے۔

عورت کے مہر کی مقدار اور ''شرعی'' مہر

عرفان خالد ڈھلوں

اکیسویں صدی عیسوی میں داخل ہونے والے انسان نے جہاں مادی ترقی میں اس کی حدوں کو چھو لیا ہے اور مزید اختراع وایجاد کے دروازے کھولتا جاتا ہے وہیں جاہلیت بھی اسی شدومد سے انسان کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہی ہے اس جاہلیت کی ایک شکل مسلمانوں کے معاشرے میں غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی اور شرعی بنا کر پیش کرنا ہے۔ جس کی ایک مثال عورت کا ''شرعی'' حق مہر ہے۔

ہمارے معاشرے میں ایسے بیسیوں واقعات دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں کہ شادی کے موقع پر رسم حنا' سامان جہیز اور سامان بری' بارات اور ولیمہ' باجا' قمقمے اور روشنیوں وغیرہ پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور قرض تک لے کر اس موقع پر برادری میں اپنی ''عزت'' قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن نکاح کے وقت جب مہر مقرر کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ دلہن کا حق المہر ''شرعی'' ہوگا اس نام نہاد ''شرعی حق المہر'' کی مقدار بتیس روپے آٹھ آنے بتائی جاتی ہے۔ شرع کے نام پر بتیس روپے آٹھ آنے کو مہر مقرر کرنے پر عموماً کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔ ایک طرف تو لڑکی کے والدین سے زیادہ جہیز کا تقاضا یا امید کی جاتی ہے جو کہ نہ صرف غیر اسلامی بلکہ ایک ظالمانہ رویہ ہے دوسری طرف ''شرعی'' مہر کے نام پر بتیس روپے آٹھ آنے دلہن کے ہاتھ میں تھما کر اسے خریدی ہوئی متاع سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے عورت کو مہر کا حق عطا کیا ہے۔ پاکستان کی اکثر خواتین اسلام کے عطا کردہ حقوق سے لاعلم ہیں۔ بیشتر علاقوں میں دانستہ عورت کو علم سے محروم رکھا جاتا ہے یا دھونس سے ان کے حق

چھین لیے جاتے ہیں۔انہی حقوق میں سے ایک مہر کا حق ہے۔

آئندہ صفحات میں قرآن وسنتِ رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کا مہر کیا ہوتا ہے۔اس کی مقدار کتنی ہے اور ''شرعی'' مہر جیسا گمراہ تصور ہماری معاشرتی زندگی میں کہاں سے در آیا ہے۔

مہر کی تعریف:

قرآن مجید میں مہر کے چار نام آتے ہیں:

1. الصداق
2. النحلة وآتوا النساء صدقاتهن نحلة
3. الاجر وآتوهن اجورهن بالمعروف
4. الفريضه وقد فرضتم لهن فريضة

احادیث میں مہر کے بارے میں تین نام استعمال ہوئے ہیں۔

1. المهر فان اصابها فلها مهر هابما اصاب منها
2. العليقة ادوا العلائق
3. العقر عقر نسائها

یوں قرآن اور احادیث میں مہر کے ساتھ مختلف نام ہیں۔

مہر کی تعریف میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ان کی اکثریت اسے بدل البضع یعنی شرمگاہ کا بدل قرار دیتی ہے جبکہ دوسرے گروہ کے نزدیک عورت سے جسمانی استمتاع کا بدل نہیں بلکہ ایک فرض ہے جو عورت کی عزت وشرف کے اظہار کے لیے شوہر پر عائد کیا گیا ہے۔

جو فقہاء مہر کو بدل البضع قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک نکاح میں مہر کی وہی حیثیت ہے جو بیع یعنی خرید وفروخت میں قیمت کی ہے۔

مثلاً حنفی فقیہہ ابن عابدین مہر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اسم للمال الذی یجب فی عقد النکاح الزوج فی مقابلة البضع

مہر اس مال کا نام ہے جو عورت کی شرمگاہ کے بدلے شوہر پر واجب ہوتا ہے۔
اس سے ملتے جلتے الفاظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں استعمال کیے ہیں۔
حاشیۃ الدسوقی' اور الخرشی' میں لکھا ہے:

الصداق كالثمن

مہر کی قیمت کی مانند ہے۔

الکافیکی میں ہے: **ولانه بدل منفعتها**

مہر کو عورت سے جسمانی منفعت کا بدل قرار دینے والے فقہاء قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

احل لكم ماوراء ذلكم ان تبتغوا باموالكم محصنين غير مصافحين فما استعتم به منهن فاتوهن اجورهن فريضة۔

ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے حاصل کرنا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو پھر ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مہر شرمگاہ کا بدل ہے۔ کیونکہ جو چیز منفعت کے مقابل ہو اسے ہی اجر کہا جاتا ہے اور اس آیت میں اجور ادا کرنے کو کہا گیا ہے۔

فقہاء کا دوسرا گروہ مہر کو عورت سے جسمانی لطف کے حصول کا بدل قرار دینے کی بجائے اسے لازمی ھدیہ اور ایک فریضہ کا نام دیتا ہے۔ جو عورت کی عزت وتوقیر اور اس کی مالی کفالت کی علامت کے طور پر شوہر اسے ادا کرتا ہے۔

ان کے استدلال کی بنیاد یہ قرآنی آیت ہے:

واتو النساء صدقاتهن نحلة

اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو۔

لفظ "نحلۃ" کا لغوی معنی عطا کرنا ہے۔ "نحلت فلاناشیاًاعطیۃ یعنی میں نے اسے عطا کیا۔ لہٰذا مہر اللہ کی طرف سے عورت کو عطیہ ہے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رحمۃ اللہ قتادہ ابن زید اور ابن جریج وغیرہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں شوہروں کو خطاب

کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ خوشی کے ساتھ اور بطور تبرع اپنی بیویوں کو مہر ادا کریں لفظ ''نحلة'' کے لغوی معنی یہ بھی بیان کیئے گئے ہیں۔

العطية الخالية من العوض

ایسا عطیہ جو کسی قسم کے عوض سے خالی ہو۔

مہر کی تعریف کرتے ہوئے دونوں گروہوں نے اپنی اپنی تعریف کی حمایت میں قرآن مجید کی آیت کو دلیل بنایا ہے۔مہر کو بدل البضع یعنی شرمگاہ کا بدل قرار دینے والوں نے قرآنی آیت کے الفاظ ''استمتاع'' اور ''اجور'' کو مدِ نظر رکھا۔اس کے برعکس مہر کو عطیہ اور فریضہ کا نام دینے والے فقہاء نے قرآنی آیت کے لفظ ''نحلة'' کو بنیاد بنایا ہے۔یہ دونوں ہی قرآنی آیات ہیں۔ان دونوں میں سے کسی ایک کے حکم یا عمل کے منسوخ ہونے کے بارے میں کوئی اختلافی بحث نہیں ہے اور نہ ہی یہاں عام اور خاص یا مطلق ومقید کی کوئی پیچیدگی پائی جاتی ہے۔اس لیے مہر کی تعریف کرتے وقت ''استمتاع'' اور ''اجور'' کے الفاظ پر زور دیتے ہوئے لفظ ''نحلة'' کو نظر انداز کرنا نہیں چاہیے اور نہ ''نحلة'' ہی کو اہم جانتے ہوئے ''استمتاع'' اور ''اجور'' کے الفاظ کو غیر اہم قرار دینا چاہیے بلکہ دونوں قرآنی آیات کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔لہٰذا یہ بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ لفظ ''مہر'' کو عورت سے حصول منفعت جسمانی کا بدل قرار دینے تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ یہ لفظ معنی کے اعتبار سے اس سے زیادہ جامع ہے۔

مزید یہ کہ مہر کو صرف ''بدل البضع'' قرار دینے کی تعریف میں قرآنی اعتبار سے ایک نقص بھی نظر آتا ہے۔مہر کی ادائیگی کی جو مختلف حالتیں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قرآن کی رو سے اس حالت میں مہر ادا کرنا فرض ہو جاتا ہے لیکن مرد نے عورت سے کوئی لطف حاصل نہیں کیا ہوتا۔مثلاً اگر نکاح میں مہر مقرر ہوا لیکن خلوت صحیحہ سے قبل ہی طلاق واقع ہو جائے تو اس صورت میں مرد عورت کو مقرر شدہ مہر کا نصف ادا کرے گا۔قرآن مجید کی آیت ہے:

وان طلقتمو هن ن قبل ان تسموهن وقد فرضتم لهن فريضة

نصف مفروضتم

اور اگر تم نے ان کو ہاتھ لگنے سے پہلے طلاق دے دی ہو لیکن مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔

اگر نکاح کو بیع یعنی فروخت کی مانند اور مہر کو قیمت قرار دے دیا جائے یا مہر کو محض عورت سے جسمانی لطف کے حصول کا معاوضہ ہی تسلیم کیا جائے تو پھر مندرجہ بالا حالت میں مرد پر نصف مہر کی ادائیگی لازم نہیں ہونی چاہیے۔ مرد نصف مہر کس بات کا ادا کرے اس نے عورت سے کوئی چیز حاصل نہیں کی۔ لیکن قرآن کا یہ حکم ہے کہ نصف مہر ادا کیا جائے۔ یہاں یہ بات بالکل واضح نظر آتی ہے کہ نصف مہر کی ادائیگی کا حکم عورت کی عزت وتکریم کی خاطر دیا گیا ہے۔ ایک عورت مرد کے عقد نکاح میں آئی' اس کے نام سے منسوب ہوئی۔ اب اگر طلاق ہو جائے اور صحبت نہ بھی ہوئی ہو تو عورت کو نصف مہر ادا کیا جائے گا۔ یہ نصف مہر یقیناً کسی چیز کا بدل یا معاوضہ نہیں ہے بلکہ عطیہ ہے اور عطیہ احترام اور عزت کے جذبات سے دیا جاتا ہے۔

لہٰذا مہر ''بدل البضع'' اور ''اجر'' ہی نہیں بلکہ ''صداق'' اور ''نحلۃ'' بھی ہے۔ یہ عورت سے جسمانی استمتاع کا بدل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی عزت واحترام کے اظہار اور اس کی مالی کفالت پر رضامندی کی علامت کا نام بھی ہے اس لیے کہ مرد کو عورت کی تمام مالی ضروریات کی کفالت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم

مرد عورتوں پر نگران ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

مہر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی ادائیگی لازمی ہے خواہ اس کا تعین نکاح کے وقت نہ ہو یا مرد اور عورت دونوں بوقت نکاح مہر نہ ہونے پر متفق ہوں اس صورت میں نکاح تو درست ہوگا لیکن مرد پر مہر مثل فرض ہوگا۔ مہر کی ادائیگی میں

چھوٹ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ عورت از خود برضاء ورغبت اور بغیر کسی جبر واکرہ کے مہر معاف کردے۔

قبل از اسلام کے جاہلی دور میں لڑکی کا باپ مہر کی رقم اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ مہر کو لڑکی کی قیمت تصور کیا جاتا تھا۔ جسے وہ لڑکی کی پرورش پر اٹھنے والے اخراجات کے طور پر بھی وصول کرتا تھا۔ سب سے پہلے اسلام نے عورت کو مہر کی ملکیت کا حق واپس دلایا اور عورت کو مہر سے محروم رکھنے کے تمام طریقوں کو ختم کیا۔

قرآن مجید کی آیت ہے:

وآتوا النساء صدقاتهن نحلة

عورتوں کو ان کے مہر خوشدلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو۔

مہر کی اضافت میں لفظ ''صدقاتھن'' استعمال ہوا ہے۔ یعنی عورتوں کے مہر، مہر کی اضافت عورتوں کی طرف ہے۔ عورت ہی اپنے مہر کی مالکہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

ایما امراۃ نکحت علی صداق اوحیاء او عدۃ قبل عصمۃ النکاہ فھولھا

جس عورت نے مہر یا بخشش پر یا بخشش کے وعدہ پر نکاح کیا تو یہ سب چیزیں عورت کی ہیں۔

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت (وآتو النساء صدقاتھن نحلۃ) کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے۔ دور جاہلیت میں ولی ہی عورت کا مہر وصول کرتا ہے اور عورت کو کچھ بھی نہیں دیتا تھا۔ لہٰذا قرآن مجید نے انہیں اس فعل سے منع کیا اور انہیں حکم دیا کہ مہر عورتوں کو دو۔

آج بھی ہمارے معاشرے کے بعض علاقوں میں لڑکی کی شادی کو منافع بخش تجارت سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کے والدین یا ولی مہر کو لڑکی کی قیمت کے طور پر وصول کرتے ہیں۔ انسانی معاشرے میں جہاں لڑکی کو باعث عار سمجھ کر زندہ گاڑ دینے کی مثالیں تاریخ

میں محفوظ ہیں وہیں اسے مالی منفعت کا ذریعہ جانتے ہوئے پالنے اور پھر بیاہ کر نفع کمانے کے واقعات بھی ملتے ہیں۔

اسلام بیٹی کو نہ تو باعث عار گردانتا ہے اور نہ ہی اسے منافع بخش کاروبار کا ذریعہ۔ اسلام کے بیٹی کو جو شرف و مقام عطا کیا ہے اس کا اندازہ نبی کریم ﷺ کے اس ایک فرمان مبارک سے ہی ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

من كانت له ثلاث بنات او ثلاث اخوات او بنتان او اختان فاحسن صحبتهن و اتقى الله فيهن فله الجنة

جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں پھر اس نے اچھی طرح ان کا ساتھ دیا اور ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرا۔ پس اس کے لیے جنت ہے۔

اسی طرح حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من عال جاريتين دخلت انا و هوا الجنة كهاتين و اشار با صبعيه

جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی تو میں اور وہ دونوں اس طرح اکٹھے جنت میں داخل ہوں گے اور آپؐ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا کر اشارہ کیا (یعنی کلمہ اور بیچ کی انگلی)

مہر کی مقدار:

مہر کی مقدار کے بارے میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

1۔ یہ زیادہ سے زیادہ کتنی مالیت کا ہو سکتا ہے اور۔

2۔ اس کی کم از کم مقدار کیا ہے۔

مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار:

جہاں تک مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار کا تعلق ہے اس ضمن میں قرآن اور حدیث سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مالیت کی کوئی حد نہیں ہے۔

قرآن مجید کی آیت ہے:

وان ارتم استبدال زوج مکان زوج آتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منه شیئاً

اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کر ہی لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سارا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔

اس آیت سے مہر کے زیادہ ہونے کا جواز ملتا ہے۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے:

احل لکم ماوراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مصافحین

ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے حاصل کرنا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو۔

اس آیت میں بھی ''اموال'' کا لفظ مطلق ہے کسی حد سے مقید نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی بیویوں کے مہر مختلف تھے۔ کسی کا مہر زیادہ تھا اور کسی کا کم۔

آپ ﷺ نے جب حضرت خدیجہؓ سے نکاح فرمایا تو آپ نے حضرت خدیجہؓ کو بطور مہر بیس جوان اونٹنیاں دی تھیں عرب معاشرے میں اس وقت سب سے قیمتی چیز جوان اونٹنی ہوتی تھی۔

حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کے وقت جو مہر ادا کیا وہ گھر کے کچھ اسباب و سامان تھے جن کی قیمت پچاس درہم تھی ایک روایت میں ہے: حضرت عائشہؓ کا مہر چار سو درہم تھا۔

آپ ﷺ کے حضرت ام حبیبہؓ کے ساتھ عقد نکاح کے موقع پر چار ہزار درہم مہر مقرر کیا گیا تھا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

کان صداقه فی ازواجه اثنتی عشرة اوقیة ونشاھل تدری

ماالنش ھو نصف اوقیة وذلک خمس مائة درھم

آپ ﷺ کی بیویوں کا مہر بارہ اوقیہ چاندی اور ایک نش تھا۔ تم جانتے ہو نش کیا ہے۔ وہ آدھا اوقیہ ہے۔ اور یہ پانچ سو درہم ہوئے۔

حضور ﷺ کی ایک بیٹی حضرت ام کلثومؓ کا نکاح جب حضرت عثمانؓ سے ہوا تو مہر پانچ سو درہم طے ہوا تھا حضرت علیؓ نے اپنی حطمی زرہ حضرت فاطمہؓ کو مہر میں دی تھی یہ زرہ پانچ سو درہم میں فروخت ہوئی تھی ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو بارہ سو اوقیہ مہر میں دیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت سے بھی مہر کے کثیر ہونے کا جواز ملتا ہے۔ آپ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا میں نے انصار کی عورت سے عقد کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اسے دیکھ لیا ہے اس لیے کہ انصار کی آنکھوں میں کچھ عیب بھی ہوتا ہے۔ اس سے کہا میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ نے فرمایا کتنے مہر پر عقد کیا ہے۔ اس نے کہا چار اوقیہ چاندی پر۔ آپ نے فرمایا:

علی اربع اواق کانما ینحتون الفضة من عرض ھذا الجبل.

چار اوقیہ پر گویا تم لوگ اس پہاڑ سے چاندی کھود لاتے ہو (یعنی جبھی تو اتنا زیادہ مہر باندھتے ہو)

اسی طرح ابن العربی' عقبہ بن عامر کی روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک آدمی اور ایک عورت کا نکاح کرایا۔ اور مہر نہیں لکھا گیا تھا۔ اور نہ ہی شوہر نے بیوی کو کچھ دیا تھا۔ وہ شخص حدیبیہ میں شریک ہوا اور خیبر سے اپنا حصہ وصول کیا۔ جب وہ مرنے لگا تو اس نے کہا کہ حضور ﷺ نے فلاں سے میرا نکاح فرمایا اور مہر معین نہ کیا نہ میں نے اسے کچھ دیا۔ میں اسے مہر کے طور پر خیبر کا حصہ دیتا ہوں۔ عورت نے وہ حصہ لے کر بیچا تو وہ ایک سو ہزار (مائۃ الف) یعنی ایک لاکھ ہوا۔

دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمرؓ نے اپنے دور حکومت میں بھاری مہر باندھنے پر تشویش کا اظہار فرمایا تھا۔ اس وقت عورتوں نے بہت زیادہ مہر طلب کرنا شروع کر دیئے

تھے۔جس کی وجہ سے یہ معاشرتی خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ مالی طور پر تنگدست اور بہت زیادہ مالیت کے مہر ادا کرنے کی سکت نہ رکھنے والے نوجوان نکاح سے محروم رہ جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے شاید زیادہ سے زیادہ مہر کی حد مقرر کرنا چاہی۔انہوں نے ایک مرتبہ مجمع عام میں بھاری مہر باندھنے پر ناپسندیگی کا اظہار فرمایا۔لیکن حضرت عمرؓ کی مخالفت ایک عورت نے سرعام کی اور کہا:

لیس ذلک لک یاعمر

اے عمر آپ کو اس کا اختیار نہیں۔

اس عورت نے مزید کہا:

"یعطینا اللّٰہ وتحرمنا الیس اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ یقول (و آتیتم احداھن قنطارا......"

(یہ حق) ہمیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور آپ ہمیں اس سے محروم کررہے ہیں۔کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: اور تم اسے ڈھیر سارا مال دے چکے ہو......

عورت کی بات کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا:

امرا اصابت ورجل اخطا

عورت نے درست کیا اور مرد نے غلطی کی۔

حضرت عمرؓ نے اس موقع پر جو جملے ادا فرمائے تھے ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ کا ارادہ زیادہ مہر باندھنے پر پابندی لگانے کا نہیں تھا بلکہ وہ اس بات کی ترغیب دینا چاہتے تھے کہ بھاری مہر نہ باندھے جائیں۔

آپ نے فرمایا تھا:

الا لا تغا لوا صداق النساء فانھا لو کانت مکرمۃ فی الدنیا اوتقوی عند اللّٰہ لکان او لاکم لھا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما اصدق رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم امراۃ من نسائہ ولا اصدقت امراۃ من بناتہ اکثر من ثنتی عشرۃ اوقیہ

خبر دار رہو، عورتوں کے بھاری مہر مت باندھا کرو کیونکہ بھاری مہر باندھنا بزرگی سبب ہوتا دنیا میں یا اللہ کے نزدیک پرہیزگاری کا تو تم میں لائق تر اس کے نبی ہوتے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر نہ اپنی کسی بیوی کا باندھا اور نہ اپنی کسی بیٹی کا۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی ایک بیٹی کے نکاح کے موقع پر ایک ہزار دینار مہر باندھا تھا۔

لہٰذا مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار پر قرآن وحدیث نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ شریعت اسلامی عورت کو یہ حق عطا کرتی ہے کہ وہ اپنے خاندانی و معاشرتی مقام و مرتبہ کے لحاظ سے طلب کرے۔ البتہ اسلام ہر چیز میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

خير الامور اوسطها

بہترین کام میانہ روی کے ہیں:

پس مہر باندھنے میں بھی میانہ روی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ مہر اتنا زیادہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی دائیگی مرد کی مالی استطاعت سے باہر ہو۔ ایسی مثالیں بھی دیکھنے اور سننے میں آتی ہیں کہ لاکھوں کی رقم کے مہر مؤجل طے کئے جاتے ہیں مردان بھاری مہر مؤجل پر یہ خیال کر کے رضامندی کا اظہار کر دیتے ہیں کہ یہ رقم ادا نہیں کرنی پڑے گی اور ایسا صرف لکھنے کی حد تک ہے۔ لہٰذا مہر اگر لاکھوں میں بھی طلب کیا جارہا ہے تو لکھ دینے میں کیا حرج ہے۔ جبکہ قرآن شوہروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو مہر خوشدلی کے ساتھ اور فریضہ جانتے ہوئے ادا کریں۔ لہٰذا اگر مہر طلب کرنے میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لیا جائے تو جھوٹ لکھنے اور بولنے کی قباحتوں سے بچا جا سکتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں بعض اوقات بھاری مؤجل مہر اس خیال سے بھی باندھے جاتے ہیں کہ مرد کچھ بوجھ محسوس کرے تاکہ بھاری مہر ادا کرنے کے خوف کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دینے سے باز رہے اور بھاری مہر نکاح کے بندھن کو قائم رکھے۔ لیکن صرف

بھاری مہر ازدواجی زندگی کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتے اسے کامیاب بنانے کے لیے اور بھی بہت سارے عوامل کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔جن میں سے بعض نکاح سے پہلے رشتہ ڈھونڈنے اور لڑکا ولڑکی میں کفالت وغیرہ جیسے امور ہیں اور دیگر کا تعلق نکاح سے بعد والی ازدواجی زندگی سے ہے۔بعض اوقات بھاری مہر ہی عورت اور مرد کی ازدواجی زندگی میں بھاری پتھر ثابت ہوتا ہے۔اگر میاں بیوی کے درمیان ناہموار اور تلخیوں کی خلیج حائل ہوجائے وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ رہنا چاہیں تب بھی وہ اکٹھے رہنے پر مجبور ہیں۔لیکن اگر مرد مہر کی رقم ادا کرسکنے کے قابل ہوتا تو اس صورت حال میں یہ بات دونوں کے حق میں بہتر ہوتی کہ ان میں طلاق ہوجائے اور وہ دونوں کہیں اور شادی کرکے خوشگوار زندگی بسر کریں۔

مہر کی کم از کم مقدار:

عورت کے مہر کی کم از کم مقدار کے بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔

1۔ فقہاء کا ایک گروہ مہر کی کم از کم مقدار کا قائل ہے۔ان کے نزدیک دس درہم یا اس کے مساوی مال سے کم کا مہر درست نہیں ہوگا۔وہ اپنے موقف کی حمایت میں قرآن و حدیث اور قیاس تینوں سے استدلال کرتے ہیں۔ان فقہاء میں امام ابوحنیفہ'امام ابویوسف' امام محمد امام زفر'امام ابراہیم الحسن بن زیاد اور الشعبی رحم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ کے نزدیک مہر کی کم از کم مقدار پانچ درہم ہے۔سعید بن جبیر پچاس درہم اور ابراہیم نخعی چالیس درہم کے قائل ہیں اگر اس سے کم مہر باندھا گیا تب بھی کم از کم اتنا مہر ضرور ادا کرنا ہوگا۔

لہٰذا احناف کے ہاں مہر کی کم از کم مقدار دس درہم یا اس کے مساوی مال ہے۔کم از کم دس درہم کی مالیت کے مہر کے بارے میں حنفی فقہاء کا یہی فتوی ہے جسے آج بعض لوگ ''شرعی'' مہر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔فقہاء نے مہر کی کم از کم مقدار کا فتویٰ اس لیے دیا کہ

مہر معمولی اور بے وقعت ہو کر نہ رہ جائے لیکن بعض لوگوں نے اس فتویٰ کو حتمی قرار دیتے ہوئے دس درہم یا اس کی مالیت بتیس روپے آٹھ آنے کو ہی عورت کے مقدر میں لکھ دیا کہ یہی اس کا زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم ''شرعی'' مہر ہے۔ حالانکہ کم از کم مقدار کا فتویٰ ایک طرح کی حد بندی ہے۔ یہ فتویٰ بذات خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مہر اس سے زیادہ مالیت کا ہونا چاہیے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کاروباری دنیا میں کرنسی میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ وہ مختلف کرنسیوں کے شرح تبادلہ میں بھی فرق آتا رہتا ہے۔ خدا معلوم کتنا عرصہ پہلے دس درہم پاکستانی کرنسی میں بتیس روپے آٹھ آنے تھا ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے لیکن دس درہم ابھی تک بتیس روپے آٹھ آنے کے برابر ہیں۔ اگر فی الحال دس درہم کو مہر کی کم از کم مقدار تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس کی قیمت بھی آج کل بتیس روپے آٹھ آنے نہیں بنتی۔ زکواۃ عشر آرڈیننس xviii مجریہ 1980ء کے آرٹیکل 2 (XVa) کے تحت چاندی کے نصاب دو سو درہم کو 612-32 گرام وزن چاندی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

2۔ فقہاء کا دوسرا گروہ اس رائے کا حامی ہے کہ جس طرح مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار پر کوئی قدغن نہیں ہے اسی طرح اس کی کم از کم مقدار کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ اس گروہ میں امام شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق، ابوسعید الخدری، الحسن، سعید بن المسیب ابن وھب ابوثور، عطاء ابن ابی لیلیٰ، اللیث، الثوری، عمرو بن دینار، الاوزاعی اور داؤد وغیرہ شامل ہیں۔

فقہاء کے مابین اس مسئلہ میں اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث سے اس بارے میں کوئی صحیح اور قطعی نص نہیں ملتی جو احادیث ملتی ہیں اصول روایت کے تحت ان کے سلسلہ اسناد پر تنقید کی گئی ہے۔

مہر کی کم از کم مقدار ہونے کے دلائل اور ان کا تجزیہ:

حنفی اور مالکی مکتب سے تعلق رکھنے والے فقہاء عورت کے مہر کی کم از کم مقدار کے قائل ہیں البتہ احناف کے ہاں یہ مقدار دس درہم یا اس کے مساوی مال ہے۔ جبکہ مالکیہ یہ حد ربع دینار یا تین درہم یا اس کے مساوی مال قرار دیتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے

کہ انہوں نے مہر کی کم از کم مقدار کو چوری میں حد جاری کرنے کے لیے نصاب مال پر قیاس کیا ہے۔ احناف کے ہاں چوری کے مال کا کم از کم نصاب دس درہم ہے جبکہ مالکی فقہاء ربع دینار یا تین درہم کو نصاب قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کے مشہور دلائل یہ ہیں:

1۔ قرآن مجید کی آیت:

احل لکم ماوراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مصافحین۔

ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے حاصل کرنا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے بشرطیکہ حصارِ نکاح میں ان کو محفوظ کرو۔

اس آیت میں عورتوں کے ساتھ نکاح کو اپنے اموال خرچ کرنے سے مقید کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا جس نکاح میں مال یا کوئی ایسی چیز جسے معروف معنی میں مال کہا جا سکے بطور مہر نہیں ہوگا۔ وہ نکاح فاسد ہوگا۔ یہ آیت جہاں مہر کے لازم ہونے کو ثابت کرتی ہے وہیں اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مہر وہی چیز ہوگی جو مال کہلا سکے۔ بظاہر اس آیت کا تقاضا یہی ہے کہ ایک یا دو درہم مال نہیں کہلائیں گے جصاص نے لکھا ہے کہ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دس درہم کی رقم بھی مال نہیں ہے بلکہ یہ ایک معمولی رقم ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر یہی نظر آتا ہے لیکن ہم نے بالاتفاق دس درہم کو بطور مہر جائز قرار دے دیا ہے۔ اس ضمن میں وہ یہ اصول بیان کرتے ہیں:

وجائز تخصیص الایة بالاجماع

اجماع کے ساتھ کسی قرآنی آیت کو خاص کر دینا جائز ہے۔

2۔ حضرت علیؓ سے ایک روایت ہے جو مصنف عبدالرزاق میں درج ہے۔

لایکون المهر اقل من عشرة دراهم

دس درہم سے کم مہر نہیں ہوگا۔

دارقطنی میں اس کے الفاظ یوں ہیں۔

لایکون مهرا قل من عشرة دراهم

3۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

ولا مهر دون عشرة دراهم

اور دس درہم سے کم مہر نہیں ہوگا۔

4۔ شریعت اسلام نے جس انسان کے کسی عضو کے مباح ہونے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ مقرر کی ہوئی ہے۔ جیسے ہاتھ ایک عضو محترم ہے اس کو ناحق نقصان پہنچانا حرام ہے لیکن اگر کسی شخص پر مقررہ نصاب مال کے چوری ہونے کا الزام ثابت ہو جائے تو اس کا ہاتھ سزا کے طور پر کاٹ دیا جائے گا۔ اسی طرح عورت کی شرمگاہ بھی محترم عضو ہے لیکن بطور مہر مال خرچ کرنے سے یہ عضو شوہر کے لیے مباح ہو جاتا ہے۔ احناف نے عورت کی شرمگاہ کے مباح ہونے کے لیے مطلوبہ مقدار مال کو چوری کے نصاب مال پر قیاس کیا ہے ان کے نزدیک چوری میں ہاتھ کاٹنے کے لیے کم از کم نصاب مال مسروقہ دس درہم ہے لہٰذا مہر کی کم از کم مقدار بھی دس درہم ہوگی۔

حضرت ابن عباس کی روایت ہے:

قطع رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم في مجن قيمته ديناراً وعشرة دراهم

رسول اللہ ﷺ نے ایک ڈھال جس کی قیمت ایک دینار یا دس درہم تھی، کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ کی جبکہ مالک کے نزدیک نصاب سرقہ ربع دینار یا تین درہم ہے اس لیے مہر کی کم از کم مقدار بھی ربع دینار یا تین درہم ہوگی۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

تقطع يد السارق في ربع دينار فصاعدا

ربع دینار یا اس سے زیادہ کے چوری ہونے پر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

ایسا ہی حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے روایت ہے۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قطع في مجن ثمنه ثلاثة دراهم

چوری میں مال کے نصاب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کم از کم کتنا مال لائق احترام ہے۔

لہٰذا دس درہم/تین درہم یا ربع دینار وہ مقدار ہے جس کی قدر کو تسلیم کیا گیا ہے اور جس کے چرانے پر چور حد شرعی کا سزاوار ہوگا لہٰذا یہی کم از کم مقدار مہر کے لیے ہے کیونکہ اسی مقدار کو مال تسلیم کیا گیا ہے۔

تجزیہ:

1۔ آیت مذکورہ میں لفظ "اموالکم" (یعنی تمہارے اموال) سے کوئی بھی مال شرعی مراد ہے۔ یہاں مال کی تخصیص نہ تو کسی جنس کے اعتبار سے ہے اور نہ ہی مقدار کے اعتبار سے۔ یہ مال سونا، چاندی، کرنسی، مویشی، لکڑی، جائیداد منقولہ وغیرہ غرض کوئی بھی ایسی چیز ہو سکتی ہے جس کی طرف لوگ مائل ہوں جس کی لوگوں کے نزدیک قدر ہو۔ اسی طرح یہ مال مقدار میں قلیل بھی ہو سکتا ہے اور کثیر بھی۔ ہمیں قرآنی متن کے قریب تر رہنا چاہیے۔ جس کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت جن اموال کے خرچ کرنے کا ذکر کر رہی ہے وہ حکم کے اعتبار سے عام ہیں۔ لوگوں کے پاس جو اموال ہیں انہیں خرچ کر کے حلال عورتوں سے نکاح کریں۔

جہاں تک اجماع کے ذریعے اس آیت کی تخصیص کا دعویٰ ہے کہ مال کو اجماع کے ذریعے دس درہم سے خاص کر دیا گیا ہے، یہ دعویٰ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اجماع کسی امر کے حکم شرعی پر تمام مجتہدین کے اتفاق کر لینے کا نام ہے۔ اور اگر اس امر کے شرعی حکم ہونے میں بعض مجتہدین کا اختلاف پایا جاتا ہو تو یہ اجماع کی تعریف میں نہیں آئے گا بلکہ کچھ فقہاء کی فقہی رائے ہوگی۔ قرآن مجید کی آیت (ان تبتغوا باموالکم) کے لفظ "اموال" کے عام کو دس درہم پر خاص کرنے پر حنفی فقہاء کا اتفاق ہے جبکہ دیگر فقہی مکاتب اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اس تخصیص کو حنفی اجماع کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا بلکہ حنفی فقہاء کا اتفاق ہی کہیں گے اور ایسا اتفاق اجماع جیسی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس آیت کی تخصیص کے دعویٰ کے لیے اجماع کی دلیل درست نہیں معلوم ہوتی۔

2۔ حضرت علیؓ کی روایت (لایکون المھر اقل عشرة دراھم) موقوف

حدیث ہے۔ یعنی قول صحابیؓ ہے۔ عبدالرزاق نے اسے شریک' داود الزعفرانی اور شعبی سے روایت کیا ہے۔ اور دارقطنی نے اس قول کو محمد بن ربیعہ داود الاودی اور شعبی سے روایت کیا ہے۔ دارقطنی میں ابن حبان کا قول درج ہے کہ اس کی سند میں داود الاودی ضعیف راوی ہے اور شعبی کی حضرت علیؓ سے سماعت ثابت نہیں ہے نصب الرایۃ میں ہے کہ دارقطنی نے اس روایت کو جویبر' الضحاک' النزال بن سبرۃ حضرت علیؓ سے بھی نکالا ہے اور یہاں جویبر ضعیف راوی ہے الزیلعی نے کہا ہے کہ دارقطنی نے اس قول کو ضحاک سے دو طریقوں سے نکالا ہے ایک میں جویبر ہے وہ ضعیف راوی ہے اور دوسرے میں محمد بن مروان ابوجعفر ہے وہ بھی ضعیف راوی ہے جسے ذہبی نے غیر معروف قرار دیا ہے۔

ابن حبان کے نزدیک شعبی کی حضرت علیؓ سے سماعت ثابت نہیں ہے اور اس نے داود الاودی کو ضعیف راوی قرار دیا۔ لیکن ابن حبان کی رائے کے برعکس الخطیب کا قول ہے کہ شعبی کی حضرت علیؓ سے سماعت ثابت ہوتی ہے اسی طرح ایک رائے یہ بھی ہے۔ کہ اگرچہ داود الاودی پر ضعیف ہونے کا بعض لوگوں نے الزام لگایا ہے لیکن شعبہ اور سفیان نے داود الاودی سے روایت کیا ہے اور شعبہ صرف ثقہ لوگوں سے ہی روایت کرتے ہیں۔

بہر حال یہ بات تو نظر آتی ہے کہ حضرت علیؓ کے اس قول کے اسناد کی صحت کسی قسم کے الزام سے بری نہیں ہے بلکہ علماء رجال نے اس کے بعض راویوں کو ضعیف کہا ہے۔

حضرت علیؓ کا یہ قول ضعیف حدیث ہے۔ اس کے باوجود احناف اس ضعیف حدیث کو حجت تسلیم کرتے ہوئے مہر کی کم از کم مقدار کو دس درہم ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ ضعیف حدیث ہے لیکن بہت سے طرق سے نقل ہوئی ہے اور اگر ایک ضعیف حدیث متعدد طرق سے نقل ہو تو وہ حسن کا درجہ حاصل کر لیتی ہے بشرطیکہ یہ ضعف بغیر کسی فسق کے ہو لیکن ضعیف حدیث بہر حال صحیح حدیث کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ ضعیف حدیث کی اس حجیت پر دوسروں کو اعتراض ہے۔ بعض اس پر عمل کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا صرف اعمال کی فضیلت بیان کرنے میں مستحب ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ ضعیف غیر شدید ہو اور محض احتیاط کے

تقاضوں کی خاطر اس پر عمل کیا جائے گا۔

3۔ جہاں تک حضرت جابر بن عبداللہؓ کی حدیث (ولا مھر دون عشرة دراھم) کا تعلق ہے اس کی اسناد بھی ضعف کے الزام سے خالی نہیں اس کے راویوں میں مبشر بن عبید، الحجاج بن ارطاۃ، عطا، عمرو بن دینار کے نام آتے ہیں ان میں مبشر بن عبید متروک الحدیث ہے اس کی احادیث کی اتباع نہیں کی جاتی۔ امام احمد بن حنبل نے کہا کہ مبشر بن عبید کی احادیث جھوٹی اور من گھڑت ہوتی ہیں الحجاج بن ارطاۃ بھی ضعیف راوی ہے اور ضعیف راویوں سے تدلیس بھی کرتا ہے البیہقی نے کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے المحلی میں اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے، مکذوب بلا شک۔

البتہ ''نصب الرایۃ'' میں اس حدیث کے تحت حاشیہ میں لکھا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی اس روایت کے یہ اسناد بھی ہیں عمرو بن عبداللہ الاودی، وکیع بن عباد بن منصور، القاسم بن محمد اور جابر بن عبداللہ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ اس اسناد کے ساتھ یہ حدیث حسن ہے اور حسن حدیث حجت ہے۔

لیکن یہ حضرت جابرؓ کا اپنا ایک قول اس متذکرہ بالا حدیث کے خلاف جاتا ہے اور وہ قول یہ ہے:

من اعطى فى صدق امراة ملا كفيه سريقا او تمرا فقد استحل

جس نے عورت کو مہر میں کپ بھر ستو یا کھجوریں دیں تو اس نے اس کو اپنے اوپر حلال کر لیا۔

اس کے علاوہ حضرت جابر کی یہ حدیث سہل بن سعد الساعدی کی حدیث ''التمس ولو خاتما من حدید (یعنی ڈھونڈو خواہ وہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو) ہے معارض ہے جسے بخاری اور مسلم جیسے محدثین کے علاوہ امام مالک نے اپنے ''الموطا'' میں بھی نقل کیا ہے۔ یہ حدیث تمام صحاح ستہ میں موجود ہے۔ بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ متفق علیہ حدیث میں حدیث کا ذکر تفصیل کے ساتھ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

4۔ مہر کی کم از کم مقدار کو سرقہ کے نصاب پر قیاس کرنے کے بارے میں ان فقہاء

نے جو بحث کی ہے۔اس پر مختلف زاویوں سے تنقید کی گئی ہے۔نکاح سے عورت کا جسم شوہر کے لیے حلال ہو جاتا ہے۔اور نکاح سنت رسول اللہ ﷺ ہے جبکہ چور کا ہاتھ سزا کے طور پر کاٹا جاتا ہے۔اور چوری کرنا گناہ اور جرم ہے۔نکاح شرمگاہ سے استمتاع کو مباح کرتا ہے۔اس میں کوئی عضو تلف نہیں ہوتا جبکہ چوری کی سزا نافذ ہونے سے ہاتھ تلف ہو جاتا ہے۔چوری کی سزا کے نفاذ میں چور کو تکلیف اٹھانا پڑتی ہے جبکہ نکاح سے لذت حاصل ہوتی ہے چوری گناہ ہے اور نکاح اطاعت الٰہی ہے۔

لہٰذا احناف کا یہ قیاس ان کے اپنے موقف کی دلیل کی حد تک مناسب معلوم ہوتا ہے۔اجماع کے ذریعے آیت قرآنی کے عام کی تخصیص کو جائز اور ضعیف حدیث کو متعدد طرق سے وارد ہونے کی بنا پر حسن کا درجہ دے کر مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ثابت کرنے کے باوجود احناف قیاس کو دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔یہ بات اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مہر کی کم از کم مقدار کے بارے میں انہیں قرآن یا حدیث سے کوئی واضح قطعی نص نہیں ملی اسی لیے انہوں نے اپنے موقف کے تقویت کے لیے قیاس سے بھی کام لیا۔ورنہ قطعی نفس کی موجودگی میں قیاس کے سہارے کی کیا ضرورت تھی۔

مہر کی کم از کم مقدار نہ ہونے کے دلائل اور ان کا تجزیہ:

ایسے بہت سے آثار و اقوال ملتے ہیں جو اس امر کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ مہر کی مقدار دس درہم سے کم بھی ہو سکتی ہے جس چیز پر بھی عورت یا اس کا ولی راضی ہو وہ مہر ہو سکتی ہے خواہ اس کی مقدار مالیت کے اعتبار سے دس درہم سے کم ہو۔چند اہم دلائل درج ذیل ہیں۔

1. احل لکم ما وراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مصافحین .

ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے حاصل کرنا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو۔

اس آیت کے لفظ ''اموالکم'' میں اموام عام ہے جس میں کثیر بھی شامل ہے قلیل

بھی۔لہٰذا یہ آیت مہر کے کم از کم ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ مال کے ذریعے نکاح کرو۔اب یہ مال قلیل ہونے کے اعتبار سے کتنا ہی ہو آیت اس بارے میں کوئی پابندی نہیں لگاتی۔

2۔ حضرت سہل بن سعد الساعدی روایت کرتے ہیں:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جاته امراة فقالت یارسول اللّٰہ انی وهبت نفسی تلک فقامت قیاما طویلا. فقال رجل فقال یارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم زوجنیها ان لم یکن لک بها حاجة فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم هل عندک من شئی تصدقها ایاه فقال ماعندی الاازاری هذا فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اعطیتها ایاه جلست لاازارک فالتمس شیئا فقال ماا جد شیئا فقال فا لتیمس ولو خاتما من حدید' فلم یجد شیئا فقال له رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم هل معک من القرآن فقال نعم سورة کذا وسورة کذا السور سماها .فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قد انکهحتها بما معک من القرآن .

ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور اس نے آپ سے کہا میں نے اپنی جان آپ کو بخشی۔وہ عورت کافی دیر تک کھڑی رہی۔پھر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا اے اللہ کے رسولؐ اگر آپ کو اس عورت کی حاجت نہیں ہے تو میرا اس سے نکاح فرمادیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے پاس اس کو مہر میں دینے کے لیے کوئی چیز ہے؟ وہ شخص بولا میرے پاس سوائے تہبند کے کچھ نہیں ہے۔آپ نے فرمایا اگر تو تہبند ہی اس کو دے دے گا تو بغیر تہبند بیٹھے گا کوئی اور چیز ڈھونڈ اس نے کہا مجھے کچھ اور نہیں ملتا۔آپ نے فرمایا ڈھونڈ اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو۔اس نے ڈھونڈا مگر کچھ نہ ملا تب آپ نے پوچھا تمہیں کچھ قرآن یاد ہے اس نے کہا ہاں فلاں فلاں سورت یاد ہے اس نے کئی سورتوں کا نام لیا۔آپ نے فرمایا میں نے اس قرآن کے عوض جو تجھ کو یاد ہے اس عورت کا تیرے ساتھ نکاح کر دیا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مہر کی مقدار قلیل بھی ہو سکتی ہے یہاں تک کہ وہ لوہے کی معمولی سی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

وخاتم الحدید لایسوی قریباً من الدرهم

لوہے کی انگوٹھی تقریباً ایک درہم کے مساوی بھی نہیں ہوتی۔ اور مرد اگر اتنی بھی مالی سکت نہ رکھتا ہو تو اس حد سے بھی نیچے آیا جا سکتا ہے جیسا کہ لوہے کی انگوٹھی نہ ملنے پر نبی کریم ﷺ نے متذکرہ شخص سے کسی اور چیز یا مال کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ یاد شدہ قرآنی سورتوں کے عوض اس شخص کا عورت سے نکاح کر دیا۔

3۔ حضرت ابوسعید الخدری روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لیس علی الرجل جناح ان یتزوج بماله بقلیل او کثیر اذا اشهد

اس شخص پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے تھوڑے یا زیادہ مال کے ساتھ شادی کرے جبکہ وہ اس پر گواہ بنائے۔

4۔ عامر بن ربیعہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے جو بنی فزارہ سے تعلق رکھتا تھا' دو جوتیوں پر نکاح کیا تو حضور ﷺ نے اس نکاح کو جائز رکھا۔ اس موقع پر آپؐ نے عورت سے پوچھا:

ارضیت من نفسک ومالک بنعلین قالت نعم فاجازه

کیا تو اپنی جان و مال سے دو جوتیوں پر راضی ہے اس نے کہا ہاں آپ نے اس نکاح کو جائز رکھا۔

5۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں:

ان کنا لننکح المراة علی الحفنة والحفنتین من الدقیق

ہم ایک عورت کے ساتھ ایک اور دو کپ پسے ہوئے آٹے پر نکاح کر لیا کرتے تھے۔

6۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

من اعطی فی الصداق امراة کفیه سویقا او تمر فقد استحل

جس نے عورت کے مہر میں کپ بھر ستو یا کھجوریں دیں تو اس نے عورت کو اپنے اوپر

حلال کرلیا۔

7۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

ادوا العلائق قیل وما العلاق یارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ماتراضی بہ الاھلون

مہر ادا کرو۔ پوچھا گیا اے اللہ کے رسول ﷺ مہر کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا جس پر گھر والی بیویاں راضی ہو جائیں۔

اس حدیث کی تشریح میں امام شافعی کا قول ہے کہ صرف اسی چیز کو علق کہا جائے گا جو مال ہو خواہ وہ کتنی ہی قلیل ہو۔

8۔ حضرت جعفر بن محمد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

الصداق ماتراضی بہ الزوجان

مہر وہ ہے جس پر خاوند اور بیوی راضی ہو جائیں۔

9۔ حضرت ابوسعید الخدری کی روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے مہر کے بارے میں پوچھا' آپ نے فرمایا۔

ما اصطلع علیہ اھلوھم

جس پر ان کے گھر والے راضی ہو جائیں۔

10۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے بارے میں حضرت انسؓ کی روایت ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ایک عورت سے گٹھلی کے وزن کے برابر نکاح کیا اس روایت کے الفاظ ہیں:

ان عبدالرحمن بن عوف تزوج امراۃ علی وزن نواۃ

عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ایک نواۃ وزن (کے سونے) پر ایک عورت سے نکاح کیا۔

ایک نواۃ وزن سونے کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ پانچ درہم کے برابر ہوتا ہے۔

11۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ نے ام سلیم کو نکاح کا پیغام بھیجا۔

ام سلیم نے کہا اللہ کی قسم! ابو طلحہ آپ رد کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن آپ کافر ہیں اور میں مسلمان ہوں۔ میرے لیے یہ جائز نہیں کہ میں آپ سے نکاح کروں۔ ہاں اگر آپ اسلام قبول کرلیں تو آپ کا اسلام لانا اور مسلمان ہونا مہر ہوگا۔ میں آپ سے کسی اور چیز کی درخواست نہیں کروں گی۔ بعد ازاں ابو طلحہ مسلمان ہو گئے اور مسلمان ہونا ہی مہر رہا۔ ثابت (راوی جس نے انس سے روایت کیا) نے کہا میں نے کوئی ایسی عورت نہیں سنی جس کا مہر ام سلیم سے بہتر ہو کیونکہ ام سلیم کا مہر اسلام تھا۔

12۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے:

یتزوج الرجل ولو بسواک

آدمی شادی کرے اگرچہ ایک مسواک پر ہی ہو۔

13۔ حضرت ابن مسیبؒ کا قول ہے:

لا باس ان یتزوج الرجل ولو بسوط

اگر آدمی ایک چھڑی پر شادی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

14۔ حضرت سعید ابن المسیبؒ نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح دو درہموں پر کیا تھا۔

تجزیہ:

1۔ قرآن مجید کی آیت (**ان تبتغوا باموالکم**) کے لفظ ''اموال'' کو عام قرار دینے کا موقف درست نظر آتا ہے کیونکہ قرآن کی کوئی دوسری آیت یا کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ملتی جس نے اس آیت کے حکم کو خاص کر دیا ہو۔ لہٰذا یہاں کوئی بھی شرعی مال مراد لیا جا سکتا ہے اور اس کی کتنی بھی مقدار ہو سکتی ہے۔

2۔ سہل بن سعد الساعدی کی حدیث جس میں نبی اکرم ﷺ نے متذکرہ شخص کو کہا ''فالتمس ولد خاتما من حدید'' یعنی ڈھونڈو اگرچہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو۔ جس کے ڈھونڈنے میں ناکام رہنے پر نبی اکرم ﷺ نے اس شخص کا نکاح قرآن کی ان سورتوں پر کر دیا جو اسے یاد تھیں۔

یہ حدیث ابو حازم نے سہل بن سعد الساعدی سے روایت کی ہے اور ابو حازم کا

اصلی نام مسلمۃ بن دینار المدنی ہے جو صغار التابعین میں شامل ہیں۔

یہ حدیث اسناد کے اعتبار سے حسن ہے ترمذی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اس حدیث کی صحت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ متفق علیہ ہے یعنی اسے بخاری مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اس کے علاوہ مالک نے اپنی الموطا میں اسے روایت کیا ہے۔ مزید یہ کہ بخاری و مسلم کے علاوہ صحاح ستہ کی دیگر کتب سنن ابوداؤد سنن ابن ماجہ جامع ترمذی اور جامع نسائی میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

اس حدیث کے الفاظ ''ولو خاتما من حدید'' مہر کی مقدار کے معمولی ہونے پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ ایک عام انگوٹھی جو لوہے کی بنی ہوئی قیمت کے اعتبار سے بہت معمولی ہوتی ہے۔ ابن المنذر نے کہا ہے کہ یہ احادیث ان لوگوں کے رد کے لیے کافی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ کم از کم مہر دس درہم ہے یا جو یہ کہتے ہیں کہ کم از کم حد ربع دینار یا تین درہم ہے۔

اس حدیث کے بارے میں احناف کا یہ موقف ہے کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دس درہم سے کم مالیت کا بھی مہر ہو سکتا ہے یا یہ کہ مہر کی کم از کم مقدار کوئی حق نہیں ہے۔ بلکہ نبی پاک ﷺ کے قول مبارک (فالتمس ولو خاتما من حدید سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ نے مذکورہ شخص کو فوری طور پر کوئی چیز پیش کرنے کو کہا تھا اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ بیوی کے ساتھ خلوت صحیحہ سے قبل مہر کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور بیوی کو دیا جائے بعض فقہاء کی یہ رائے ہے کہ شوہر اس وقت تک اپنی بیوی کے ساتھ خلوت صحیحہ نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنی بیوی کو کچھ نہ دے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کو حضرت فاطمہؓ سے شادی کے بعد ان سے ملاقات سے روک دیا تھا جب تک وہ اپنی بیوی کو کچھ عطا نہ کریں۔

اس حدیث کی تفصیلات کے بارے میں احناف کی اپنی رائے ہے۔ لیکن ان تفصیلات کے ظاہر سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ زیادہ مہر باندھا جا سکتا ہے لیکن اگر قرآن سے معلوم ہو جائے کہ مرد اتنا زیادہ مہر ادا نہیں کر سکتا تو پھر مہر کی مالیت میں تخفیف کی جا سکتی ہے

بلکہ بتدریج اس حد تک کمی کی جاسکتی ہے جس کی ادائیگی مرد کے لیے آسان ہو۔ اگرچہ اس حدیث کی تفصیلات ایک شخصی واقعہ کی حد تک ہیں اور نبی اکرم ﷺ کا حکم (فالتمس ولو خاتما من حدید) عام نہیں ہے۔ لیکن اس شخصی واقعہ کا حکم اس شخص کے لیے ہوسکتا ہے جس کی مالی حالت اور قرآن حدیث میں مذکور شخص سے ملتے جلتے ہوں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ایسا ضرورت کے تحت کیا گیا تھا کیونکہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان غریب تھے اور ان کے پاس اتنا مال نہیں ہوتا تھا کہ وہ مہر ادا کریں یہی ضرورت اب بھی پیش آسکتی ہے کہ کسی کے پاس دس درہم اس کی مالیت کے مساوی مال نہ ہو جسے وہ بطور مہر ادا کر سکے تو مہر کی مقدار میں تخفیف کر لی جانی چاہیے۔

حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

تیاسروا فی الصداق   مہر میں آسانی پیدا کرو۔

3۔ حضرت ابو سعید الخدری کی حدیث:

لیس علی الرجل جناح ان یتزوج بماله بقلیل اوبکثیر اذا اشهد.

کے بارے میں "الدرایة فی تخریج احادیث الهدایة" میں الفاظ کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ دار قطنی میں حدیث ابی سعید

(لایضر احدکم بقلیل من ماله تزویج ام بکثیر بعد ان یشهد)

کی اسناد ضعیف ہے۔

4۔ عامر بن ربیعہ کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بنی فزارہ کے ایک شخص کے نکاح کو جائز رکھا جس نے دو جوتیوں پر نکاح کیا تھا۔

یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

5۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ کا یہ قول ہے کہ ہم ایک اور دو کپ پسے ہوئے آٹے پر عورت سے نکاح کر لیتے تھے۔ اس کی اسناد میں عبد اللہ بن واقد ابو قتادہ الحرانی ہیں جس کے بارے میں بخاری نے سکوت کرنے کو کہا ہے۔ دار قطنی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ ابن معین نے اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہے اس کے اسناد میں عبد اللہ بن

المواصل المخزومی المکی ہے جو ضعیف راوی ہے۔

7۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کردہ حدیث (ماتراضی به الاهلوان) کے اسناد میں محمد بن عبدالرحمٰن کا نام آتا ہے جس کے بارے میں بخاری نے کہا کہ وہ منکر الحدیث ہے۔ ابن القطان نے کہا اس کی عدالت ثابت نہیں اور بظاہر ضعیف راوی ہے۔

8۔ حضرت علیؓ کے قول (الصداق ماترضی بہ الزوجان) کو جعفر بن محمد بن علی بن الحسین جو کہ آئمہ میں سے ایک ہیں' نے اپنے والد محمد بن علی بن الحسین المعروف امام باقر سے روایت کیا ہے لیکن محمد بن علی بن الحسین نے حضرت علیؓ کو دیکھا نہیں ہے۔

حاصل بحث:

فریقین کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے مہر کی کم از کم مقدار کے بارے میں قرآن اور احادیث سے کوئی قطعی نص نہیں ملتی۔

قرآن مجید کی آیت (ان تبتغو اباموالکم) سے دونوں گروہوں نے اپنے انداز میں استدلال کیا ہے لیکن یہ رائے راجح معلوم ہوتی ہے کہ اس آیت میں لفظ ''اموال'' میں کثیر اور قلیل دونوں مقداریں شامل ہیں۔

جو احادیث مہر کی کم از کم مقدار دس درہم کی حمایت میں لائی گئی ہیں ان کے بعض راویوں پر تنقید ہونے کی بنا پر انہیں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ایک طرف اگر حضرت علیؓ کا ایک قول (لا یکون المھر اقل عن عشرۃ دراہم) دس درہم مہر کے کم از کم ہونے کے ثبوت میں ہے تو دوسری طرف حضرت علیؓ کا ہی یہ قول ملتا ہے کہ مہر وہی ہے جس پر خاوند اور بیوی راضی ہوں (الصداق ماتراضی بہ الزوجان) اگر پہلا قول راوی کے غیر معروف اور ضعیف ہونے کی بنا پر بلحاظ اسناد ضعیف ہے اور اس میں شعبی کا سماع حضرت علیؓ سے ثابت نہیں تو دوسرے قول میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ امام باقر نے حضرت علیؓ کو دیکھا نہیں ہے۔

اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت دس درہم کی حمایت میں ہے تو دوسری طرف انہی سے منسوب قول ہے کہ آٹے کے ایک اور دو کپ پر بھی نکاح ہو جاتا تھا۔

حضرت علیؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ضعیف روایات کے مقابلے میں سہل بن سعد الساعدی کی روایت ہے (التمس ولو خاتما من حدید) ڈھونڈو اگر چہ وہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہو۔اس روایت کو بخاری، مسلم مالک ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی نے نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ عامر بن ربیعہ کی حدیث موجود ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بنی فزارہ کے ایک آدمی کا نکاح دو جوتیوں پر جائز رکھا اور یہ حدیث بھی حسن صحیح ہے۔مزید یہ کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیث ہے کہ انہوں نے ایک عورت کے ساتھ ایک نواۃ یعنی پانچ درہم پر نکاح کیا اور یہ حدیث بھی صحیح بخاری میں موجود ہے۔

عورت کے مہر سے متعلق تمام روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے شریعت اسلامی کا جو مجموعی مزاج ابھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر کی مقدار کے بارے میں کوئی ایک قطعی حکم نہیں ہے بلکہ یہ حالات وظروف کے تحت ہے۔عورت کی معاشرتی حیثیت اور مرد کی مالی طاقت پر منحصر ہے کہ مہر کی مقدار کیا ہو۔اگر فریقین شادی پر رضا مند ہوں تو محض مہر کی مقدار اس نکاح میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔

نبی اکرم ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

خیر النکاح ایسرہ   بہترین نکاح وہ ہے جو آسانی پیدا کرے۔

جو لوگ بیاہ شادی کے موقع پر دوسری غیر ضروری اور فضول رسموں پر لاکھوں روپیہ پانی طرح بہا کر اپنی امارت ظاہر کرنے اور برادری میں اپنی ناک اونچی رکھنے کی کوشش کریں لیکن عورت کا مہر مقرر کرتے وقت انہیں خود ساختہ شریعت یاد آ جائے اور دس درہم کو ''شرعی'' مہر قرار دے کر عورت کو بتیس روپے آٹھ آنے پر ٹرخا دیں، معاشرہ ایسے لوگوں پر سماجی دباؤ ڈالے کہ وہ عورتوں کے معمولی مہر نہ باندھیں دوسری طرف مہر کی مقدار میں تخفیف اور لچک کا رویہ اپنے اندر بہت سے حکمتیں رکھتا ہے۔شریعت کا مقصد یہ ہے کہ ہر بالغ مرد وزن نکاح جیسے مقدس بندھن میں جڑ کر خاندان کی بنیاد رکھیں۔اپنی فطری خواہشات کی تسکین فطری اور جائز طریقوں سے کریں۔بھاری مہر کی وجہ سے مسلمان مرد اور عورتیں شادی سے محروم نہ رہ جائیں اور معاشرے میں نکاح مہنگا اور زنا سستا نہ ہو جائے۔

تعدد ازدواج

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

المتحید الابجدی میں ہے۔

العورة 'کل امر یستحی منه کل شئی یستره الانسان من اعضائه انفةً الخ(جمع)عَوْرات و عوَرات

مصباح اللغات میں ہے۔العورة

ہر امر جس سے شرم کی جائے' انسان کے اعضاء جن کو حیا سے چھپایا جائے۔

اور لغات القرآن میں ہے۔

عورة۔کھلی غیر محفوظ' خالی' علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے قاموس میں اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں۔

(1) سرحد وغیرہ پر خلل پڑنا۔

(2) چھپانے کی جگہ۔

(3) مرد اور عورت کی شرمگاہ۔

(4) وہ وقت جو بے پردہ ہونے کا ہو اور یہ تین اوقات ہیں فجر سے پہلے' دوپہر کے وقت اور نماز عشاء کے بعد۔

(5) ہر وہ بات جس کے ظاہر ہونے سے آدمی شرمائے۔

عورة۔انسان کی شرمگاہ کو کہتے ہیں' جو کنایہ ہے اور اصل میں یہ عار سے ہے کیونکہ شرمگاہ کے کھلنے میں عار محسوس ہوتی ہے اور عورتوں کو ''عورة'' اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ان کے بھی غیر مردوں کے سامنے آنے سے عار آتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عورت قدرت کا وہ حسین شاہکار ہے جسے اسلام نے ماں بہن بیٹی اور بیوی کے روپ میں پیش کیا ہے اسلام سے قبل معاشرہ میں عورت کا جو حال تھا

اس کا سرسری جائزہ ضروری ہے' تا کہ ''تعرف الاشیاء باضدادھا'' کے اصول کے تحت اس پروپیگنڈے کی حقیقت سامنے آ سکے جو اسلام کے حوالہ سے عورت کی بے کسی و بے بسی کے متعلق کیا جاتا ہے قدیم تہذیب میں یونان کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوتا ہے اور یونانی تہذیب کو بڑی شاندار تہذیب گردانا جاتا ہے لیکن اس تہذیب میں عورت اسی طرح مقام مصائب کی ذمہ دار قرار دی جاتی ہے جس طرح یہودیوں کے ہاں حضرت حوا علیہا السلام تمام المناکیوں اور کلفتوں کا باعث ہیں۔

یونان کے بعد روم کا نمبر آتا ہے اور آج بعض لوگ رومی تہذیب کا بڑے فخر سے ذکر کرتے ہیں لیکن اس تہذیب میں مرد اپنے خاندان کا سردار ہوتا ہے اس کو اپنے بیوی بچوں پر اس طرح ''مالکانہ حقوق'' حاصل ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کو قتل تک کرنے کا مجاز ہے اور اس میں کوئی روک نہیں۔

جب بیچاری عورت کا یہ حال تھا تو پھر ایسا وقت آیا کہ عورت جنس بازار میں ایک ایسی چیز قرار پائی جسے کوئی کسی بھی وقت اپنے سفلی جذبات کے لیے برت اور استعمال کر سکتا ہے'

کہ روم کے محتسب اخلاق (84 از قبل مسیح) نے زنا کو حق بجانب قرار دیا۔

اس سے آگے بڑھیں تو مسیحی یورپ میں عورت کا نقشہ یوں نظر آتا ہے۔

عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے' مرد کے لیے معصیت کی تحریک کا سرچشمہ اور جہنم کا دروازہ ہے ائمہ مسیحیت میں ترتولیاں نہایت اہم آدمی ہے وہ کہتا ہے۔

عورت شیطان کے آنے کا دروازہ' شجر ممنوع کی طرف پہنچانے والی' خدا کے قانون کو توڑنے والی اور مرد کو غارت کرنے والی ہے۔

کرائی سوسٹم (یکے از اولیاء کبار مسیحیت) کے بقول عورت ایک ناگزیر برائی' ایک پیدائشی وسوسہ' ایک مرغوب آفت' ایک خانگی خطرہ ایک غارت گر دبائی اور ایک آراستہ مصیبت ہے۔

اس کے بالمقابل اسلام نے زندگی کے اکثر معاملات میں عورت کو برابر کا مقام

دیا۔ سب سے پہلے مرد کے ساتھ اس کی انسانیت کا کھلے بندوں اعلان کیا تقویٰ وطہارت کی دوڑ میں جس طرح مرد کے لیے کھلا میدان چھوڑا ایسے ہی عورت لو اس میدان میں کھلے مواقع فراہم کیے۔

قرآن عزیز میں ہے۔

''اے انسانو! اپنے پروردگار سے ڈرو' جس نے تم کو ایک جان دار سے پیدا کیا اور اسی جاندار سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتوں کو پھیلا دیا۔

دوسری جگہ ہے۔

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک عورت اور مرد سے پیدا کیا ہے اور تمہارے درمیان مختلف شاخیں اور قبائل بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو' اللہ کے نزدیک تو تم سب میں بڑا عزت والا وہ ہے جو تم سب میں بڑا پرہیز گار ہے۔

انسانی حقوق کا سوال آیا تو قرآن نے واضح لفظوں میں کہا۔

او رعورتوں کا حق بھی ایسا ہے جیسا دستور کے مطابق مردوں کا حق عورتوں پر ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔

عورتیں حقوق انسانیت میں مردوں کے برابر ہیں۔

خیر وشر کے اعمال میں قرآن نے بتایا کہ مرد وعورت ہر دو کے لیے ایک ہی پیمانہ ہے۔

اور جو کوئی نیک کام کرتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو۔

تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اس جنت میں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔

علم کے معاملہ میں جامع صغیر کی روایت کے مطابق ہر دو کو پابند کیا گیا۔ معاشرتی بندھن کسی وجہ سے توڑنا پڑے تو اگر مرد کو طلاق کی اجازت ہے تو عورت خلع کی حق دار ہے۔

امور خانہ داری میں مرد کی طرح عورت بھی ذمہ دار ہے مثلاً بچوں کے دودھ کے معاملہ میں البقرہ آیت 233 میں ''فان ارادا'' فرمایا اسی طرح مشہور حدیث نبوی الا کلکم

راع (بخاری، مسلم) میں مرد کی طرح عورت کی ذمہ داریوں کا ذکر ہے اور مالی، دیوانی، فوجداری اور قانونی حقوق میں اس کا مساوی ہونا، جائیداد کا مالک ہونا، ہبہ، رہن بیع کے اختیارات دیوانی عدالت سے رجوع، حدود وقصاص اور تعزیری قوانین میں اپنا حق لے سکنے کی تصریح موجود ہے۔

یہ تفصیلات ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہیں کہ اسلام جس طرح باقی دنیا پر ابر رحمت بن کر برسا اسی طرح اس نے عورت کو اپنی برکات سے نوازا اور ابتدا میں جو اشارہ ہوا اس کے مطابق اسلام نے عورت کو ماں، بہن بیٹی اور بیوی کے مقدس رشتوں میں پرودیا۔ آئندہ گفتگو چونکہ چوتھے رشتہ کے حوالہ سے ہونی ہے اس لیے پہلے تین رشتوں کے حقوق وفرائض سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ معلوم کرلیں کہ مناکحت اور ازدواج کا رشتہ ہے کیوں؟

قرآن عزیز اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اس معاملہ میں بڑے واضح ہیں۔

ایک جگہ اور ارشاد ہے۔

اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس میں سے بیویاں بنائیں تاکہ اس سے آرام واطمینان حاصل کرو۔ اور اس نے تم میاں بیوی کے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی اس بات میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔

ایک جگہ فرمایا۔

وہ (عورتیں) تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

مولانا محمود الحسن (شیخ الھند) فرماتے ہیں۔

لباس اور پوشاک سے غرض اتصال واختلاط ہے یعنی جس طرح بدن سے کپڑے لگے اور ملے ہوتے ہیں۔

اس طرح مرد اور عورت آپس میں ملتے ہیں۔

یہ مسئلہ عورت مرد کے باہمی جائز تعلقات کا جتنا کچھ اہم ہے اس کا اندازہ ان تفصیلات سے ہوگا جو اس ضمن میں قرآن اور احادیث میں موجود ہیں' عائلی قوانین کے ضمن میں قرآن نے نکاح کا ذکر 21 سے زائد آیتوں میں اور بیوی کے ساتھ تعلقات کا 28 آیات میں' عورتوں کے حقوق کا 23 آیات میں اور اس سے متعلق باقی مسائل بچے کو دودھ پلانا' طلاق' خلع ' حق مہر' حیض و عدت اور ظہار (کسی عورت کو ماں کہہ دینا) وغیرہ کا متعدد آیات میں ذکر کیا ہے جبکہ ذخیرہ احادیث میں اس قسم کے عنوانات پر مفصل ابواب اور فصول کا ہر ذی شعور کو علم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ایک حدیث میں نکاح کو نگاہوں اور شرمگاہ کی حفاظت کا ذریعہ قرار دیا۔

نیز آپ نے اسے افزائش نسل کا ذریعہ بتایا اور توجہ دلائی کہ محبت کرنے والی اور کثرت سے بچے جننے والی عورتوں سے شادی کرو تاکہ میں قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کرسکوں۔

نکاح کے عمومی مقاصد پر نظر کرتے ہوئے یہ بات بالکل درست اور صحیح ہے کہ ایک مرد کا تعلق نکاح ایک ہی عورت سے ہونا چاہیے کیونکہ سکون وطمانیت اور باہم محبت ومودت کی حسین ترین شکل یہی ہے اور اسی میں زیادہ سکون ہے' لیکن اسلام نے ایک سے زائد عورتوں سے بیک وقت نکاح کی اجازت دی اور اس کی تحدید ہم تک کردی۔ یہ مسئلہ تعدد ازدواج نہ صرف مخالفین اسلام بلکہ غیروں کی چکاچوند تہذیب سے مرعوب مسلمانوں کے لیے بھی ایک ''دردسر'' کا مسئلہ بن گیا' اور انہوں نے اس ضمن میں ہر وہ بات کہی جس کی شرافت اخلاق اور قانون اجازت نہیں دیتا۔

اس لیے ضروری ہے کہ اس موضوع پر ذرا کھل کر گفتگو کی جائے تاکہ معلوم ہوسکے کہ مسئلہ نفس کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ جن آیات میں ''تعدد'' کا ذکر ہے وہ دو ہیں اور دونوں ہی سورۃ نساء میں واقع ہیں' ایک تو بالکل سورۃ کے ابتداء میں ہے اور دوسری سولہویں رکوع میں ہے۔ پہلی آیت میں ہے:

"اور اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کی بجائے عورتیں جو تم کو پسند ہوں' ان میں سے دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر لو پھر اگر تم کو یہ خوف ہو کہ تم چند عورتوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرو۔

اور دوسری آیت میں ہے:

اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ تم اپنی سب بیویوں میں برابری رکھو (یعنی محبت میں خواہ تم کتنے ہی خواہش مند رہو لہٰذا تم ایسا نہ کرنا کہ ایک طرف تو بالکل مائل ہو جاؤ اور ایک کو ایسا ڈال رکھو جیسے آدھ میں لٹکی ہوئی۔

ان دونوں آیات پر ذرا تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

پہلی آیت میں یتیم لڑکیوں کا ذکر ہے کہ اگر ان کے حقوق کے معاملہ میں ان میں خطرہ اور ڈر ہو کہ انہیں پوری طرح نہ نبھا سکو گے تو کیا ضروری ہے کہ تم انہی سے نکاح کرو؟ آخر اور عورتیں بھی تو موجود ہیں۔ یتیم کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ بے سہارا لڑکی یا لڑکا یتیم کہلاتے ہیں جو بلوغ کی عمر کو نہ پہنچے ہوں اور ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہو۔

وہ بچے جن کے باپ مر گئے ہوں' لڑکیاں ہوں یا لڑکا نابالغ بچوں کا بن باپ رہ جانا جانور کے چھوٹے بچوں کا بن ماں رہ جانا' وہ عورت جس کے بچے یتیم ہوں (یعنی بیوہ عورت)

اس میں بن باپ رہ جانے والے بچوں کے ساتھ ساتھ "بے سہارا عورت کو بھی" یتیم کہا گیا ہے۔

یتیم اپنے بے سہارا ہونے کی وجہ سے خصوصی ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے قرآن میں ہے:

آپ سے یتیموں کا حکم دریافت کرتے ہیں؟ آپ فرما دیجئے بہر صورت ان کے حال کی اصلاح کرنا بہت بہتر ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے:

''اور لوگوں کو یہ خیال کر کے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے کمزور و ناتواں اولاد چھوڑتے تو ان کو ان بچوں کے بارے میں کیسے کیسے اندیشے ہوتے' پس ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور یتیموں سے سیدھی اور سچی بات کہا کریں' بلاشبہ جو لوگ بغیر کسی حقِ شرعی کے یتامی کا مال کھاتے ہیں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور وہ عنقریب دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

قرآن عزیز میں کم و بیش 36 آیات یتیموں کے حق میں موجود ہیں جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے' اور حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے یتیم کی کفالت کرنے والے کے لئے خوشخبری دی کہ وہ میرے ساتھ جنت میں اس طرح قریب ہوگا جیسے ہاتھ کی انگلیاں آپس میں قریب ہیں۔ دوسری حدیث میں یتیم کو اپنی کفالت میں لینے والے کے لیے لازمی جنت کی بشارت دی۔

اور تیسری حدیث میں فرمایا۔

کہ یتیم کے سر پر دستِ شفقت پھیرنے والے کے ہاتھ تلے جتنے بال آئیں گے تو ہر بال کے برابر سے نیکیاں میسر آئیں گی۔ النساء کی پہلی آیت کے متعلق تین قسم کی احادیث موجود ہیں۔ پہلی قسم کی روایات حضرت ام المومنین سیدہ طاہرہ صدیقہ سلام اللہ تعالیٰ علیہا ورضوانہ سے مروی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

کہ یتیم لڑکیاں جو اپنے کسی ولی کی تربیت میں ہوتیں اور وہ لڑکی قرابت کے سبب اس ولی کے باغ اور مال میں شریک بھی ہوتی تو دو صورتیں پیش آتیں' یا تو اس کا مال اور شکل دونوں ہی ولی کو مرغوب ہوتیں یا شکل تو نہ ہوتی البتہ مال لالچ کا ذریعہ بنتا۔ پہلی صورت میں برائے نام مہر پر اس اپنے نکاح میں لے لیتا کہ کوئی دوسرا اس کا پرسان حال تو ہے نہیں اور دوسری صورت میں یہ سوچ کر کہ دوسرے کے ساتھ نکاح سے اس کا مال میرے قبضہ سے نکل جائے گا اور دوسرا میرے مال میں شریک ہو جائے گا اس لیے محض مال کی رغبت سے اس سے نکاح رچا لیتا اور اسے رغبت نہ ہوتی' اس پر یہ حکم خداوندی نازل ہوا۔

دوسری رائے حضرت عبداللہ بن رضی اللہ تعالیٰ عنہما اوران کے شاگرد رشید عکرمہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ہے۔

''کہ دور جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد مقرر نہ تھی ایک شخص کئی کئی عورتوں سے شادیاں کرلیتا ظاہر ہے کہ اس سے مصارف بڑھتے تو پھر اپنے یتیم عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حد مقرر کردی۔

تیسری رائے حضرت سعید جبر اُو قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کی ہے۔

''کہ جاہلیت کے زمانہ میں لوگ یتیموں کے ساتھ نا انصافی پسند نہ کرتے لیکن عورتوں کے معاملہ میں ان کے ذہن عدل سے بالکل خالی تھے جتنی چاہے شادیاں کرتے۔ پھر ظلم کرتے اللہ رب العزت نے اس سے روکا جس طرح یتیموں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے ہو باقی عورتوں کے معاملہ میں بھی ڈرو۔

بہر حال آیت کا شان نزول کچھ بھی ہو اصل مسئلہ ''حقوق کے تحفظ کا ہے جس پر اسلام'' بہت زور دیتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ علماء کے نزدیک تعداد ازدواج کی بنیاد یہی آیت ہے اور یہ طے ہے کہ بیک وقت چار ہی عورتیں ہوسکتی ہیں۔ اس سے زائد نہیں۔ بعض گمراہ فرقوں نے 9 اور 8 تک عورتوں سے بیک وقت شادی کی جو اجازت اس آیت سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کا اختراع ہے بعض فرقے تو عورتوں کی اجازت دیتے ہیں' اس طرح کہ مثنیٰ (2) x ثلث (3) + ربع (4) =9 قرار دیتے ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلمکی بیک وقت 9 بیویوں کی موجودگی کو اپنی مزید دلیل سمجھتے ہیں ان کے بالمقابل بعض دوسرے بدعتی اور گمراہ فرقے 2,2-3,3 اور 4,4 کا مجموعہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ دونوں باتیں نفس قرآن' سنت اور تعامل امت کے خلاف ہیں۔ بات چار ہی کی ہے اور دشمنان اسلام تک اسی تعداد کے حوالے سے بحث ومجادلہ کا راستہ اختیار کرتے اور اعتراض کرتے ہیں۔ اور پھر النساء ہی کی آیت 129 کو اپنے استشہاد کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ جب اللہ رب العزت نے خود فرمایا کہ چاہنے کے باوجود تم عدل نہ کرسکو گے تو پھر اس اجازت کا مطلب؟ معلوم ہوا کہ آیت 129' آیت 3 کی ناسخ ہے اور اب بس ایک ہی

عورت سے شادی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ:

تعداد ازدواج کی اجازت تو ہے اس کا حکم نہیں۔ اور اجازت ضرورت کے تحت ہوتی ہے وہ ضرورت جنگ بھی ہو سکتی ہے اور کچھ اور بھی نیز یہ کہ دنیا کی تمام الہامی کتابیں اور وہ سب پاک نفس حضرات جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدق وراستی کا پیغام لے کر آئے اس کے مجوز ہیں اور اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ رہ گیا دونوں آیتوں کے تعارض کا معاملہ تو ان میں نہ تعارض ہے نہ ایک دوسرے کی ناسخ ہے بلکہ عدل سے مراد ظاہری معاملات نان نفقہ وغیرہ کا عدل ہے نیز باری بھی اس میں شامل ہے اور عدم استطاعت سے مراد قلبی محبت وتعلق ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک سے قلبی محبت زیادہ ہو دوسری سے کم' لیکن یہ بات کہ ظاہری معاملات میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے کہ ایک بیچاری معلقہ ہو کر رہ جائے حرام محض اور شدید گناہ کا باعث ہے۔ خود حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و آلہ واصحابہ وسلم جو ''اعدل الناس'' تھے اپنے اللہ کے حضور یوں عرض پرواز ہیں۔

اللھم ھذا اقسمی فیما آملک فلا تلمنی فیما تملک و لا املک یااللہ

کہ اے اللہ جہاں تک ظاہری تقسیم کا معاملہ ہے اس کا میں مالک ہوں (اور تو جانتا ہے کہ میں اس میں انصاف کرتا ہوں)

رہ گئی وہ چیز جو میرے بس میں نہیں بلکہ تو اس کا مالک ہے (قلبی محبت) تو اس میں مجھے ملامت نہ کرنا'' اور جو شخص ایک سے زائد بیویوں کی موجودگی میں ظاہری عدل سے کام نہیں لیتا اس کے متعلق ائمہ حدیث ترمذی۔ ابوداؤد نسائی۔ ابن ماجہ اور دارمی) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد نقل کرتے ہیں۔

کہ جب کسی آدمی کی دو یا زائد بیویاں ہوں (4 تک) اور وہ ان کے ساتھ عدل ومساوات کا برتاؤ نہ کرے تو قیامت کے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک دھڑ گرا ہوا ہوگا اور اسی اخروی سزا پر ہی منحصر نہیں بلکہ عورت کے ظاہری حقوق اگر ضائع ہوتے ہیں تو

وہ شریعت مطہرہ کے بخشے ہوئے حقوق کے حصول کے لیے متعلقہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے اور انصاف طلب کر سکتی ہے:

بہر طور دونوں آیات اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں کہ ایک سے تعدد ازدواج کی اجازت نہ کہ حکم سامنے آتا ہے تو دوسری سے قلبی محبت میں انسان کے مجبور ہونے لیکن ظاہری عدل کا تاکیدی حکم واضح ہوتا ہے۔ دوسری آیت سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا ذوق یہی ہے کہ ایک بیوی پر قناعت کی جائے کیونکہ وہ انسان کی نفسیاتی کمزوریوں سے واقف ہو کر انہیں متنبہ کرتا ہے کہ ایک کی طرف بالکلیہ جھکاؤ اور اور دوسری کے معاملہ میں اعراض و تغافل کا خطرہ ہے تاہم اس کی بنیاد پر قرآنی حکم کو اپنی عقل کی سان پر کھینچنا اور تعدد کے حکم کو منسوخ قرار دینا سراسر ظلم اور ناانصافی اور قرآن سے بعد کا نتیجہ ہے۔

جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو یہ دنیا ظلمت و تاریکی کا بری طرح شکار تھی معاشرتی طور پر عورت کا جو حال تھا وہ کسی سے مخفی نہیں' عورت جہاں اور مظالم کا شکار تھی وہاں وہ بطور میراث بیٹوں تک کی بھینٹ چڑھ جاتی۔

اسی طرح تعدد ازدواج کا معاملہ تھا' اس کی نہ کوئی حد تھی نہ قید' روایات میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو چار سے زائد بیویاں الگ کرنے کا حکم دیا جو مسلمان ہو گئے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے کہ:

> ''غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا تو اس وقت ان کے پاس دس بیویاں تھیں آپ نے چار رکھ کر باقیوں کو جدا کرنے کا حکم دیا۔

رہ گیا چار کا مسئلہ تو کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی اجازت دی' انہیں سوچنا چاہیے کہ جس معاشرہ میں بے قید آزادی ہو اور عورتوں پر کوئی روک نہ ہو اس میں اس معاملہ کا بالکلیہ بند کر دینا کس انارکی کا باعث بنتا؟

پھر انہیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اسلام ایک ''دین فطرت'' کے محور پر نازل ہوا تھا' انسانی معاشرہ کی ناگزیر ضرورتوں کا لحاظ کرنا اس کے مزاج و روح کا حصہ تھا۔ اگر وہ اس

بات کا دھیان نہ کرتا تو غیر مسلم سوسائٹی آج جن کربناک حالات کا شکار ہے، خود مسلم سوسائٹی اسی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس سوسائٹی کا جو حال ہے وہ اس خبر سے معلوم ہو گا جو حال ہی میں اخبارات میں چھپی۔

نیو یارک ٹائمز کی حالیہ اشاعت میں کہا گیا ہے کہ نیو یارک میں پیدا ہونے والے ہر تین بچوں میں سے ایک ناجائز ہوتا ہے اخبار کے مطابق اب شادی کے بغیر پیدا ہونے والے بچوں کی شرح گزشتہ 20 سال کے مقابلے میں 3 گنا بڑھ گئی ہے۔

اس کیفیت کو دیکھ کر اگر ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ:

قرآن نے مشروط پر تعداد ازدواج کی اجازت اس لئے دی ہے کہ عورتوں کی فاضل آبادی کو یونہی چھوڑ دینے سے معاشرے میں جنسی خواہشات کی کثرت ہوتی ہے اور یہ کہ عرب میں پہلے سے یہ رسم جاری تھی۔

تو بتائیں اس میں اس کا کیا قصور ہے؟

اور پھر جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا، کون سی وہ الہامی کتاب ہے اور کون سا وہ داعی الی اللہ ہے، جس نے اس معاملہ میں اسلام کے خلاف کوئی اقدام کیا ہو؟ اسلام تو سب سے آخر میں آیا، انجیل کی متعدد روایات کس بات پر دلالت کرتی ہیں۔؟

جان ڈیون پورٹ نے لاتعداد آیاتِ انجیل نقل کیں اور آخر میں لکھا کہ۔

ان سے ثابت ہوا کہ تعداد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔

اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حبالہ عقد میں تین بیویاں تھیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے حرم سرا میں چار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھی چار حضرت داؤد علیہ السلام کے نو اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عقد میں سات سو شاہزادیاں اور تین سو حرم تھیں۔

عیسائی دنیا سیدنا عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے حوالہ سے اگر بات کرے تو اسے محسوس

کرنا چاہیے کہ آپ نے تو ایک بھی شادی نہیں کی' اہل اسلام کے مسلم اور متفقہ عقیدہ کے مطابق وہ جب قریب قیامت آسمان سے نزول فرمائیں گے تو جہاں اور کام کریں گے وہاں شادی کی سنت بھی ادا فرمائیں گے' اگر آپ کو فی الوقت ان کی سنت وطریق اپنانے کا شوق ہے تو پھر آپ کیوں کرتے ہیں جبکہ انہوں نے تو ایک بھی نہیں کی۔

آج دنیا میں دو حکومتوں کی اجارہ داری ہے امریکہ کے سب سے بڑے شہر جسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔ نیویارک۔ کے حالات کا اندازہ آپ نے کرلیا کہ وہاں پر ہر تیسرا بچہ ناجائز ہے' دوسری طرف روس کو دیکھیں 1934ء کے شماریات یہ ہیں۔

تنہا ماسکو میں 57000 ولادتوں کے مقابلہ میں 15400 حمل گرائے جاتے ہیں اور روس کے دیہاتوں میں 242979 ولادتوں کے مقابلہ میں 324194 حمل گرائے گئے۔

اس صورت حال کے سبب روسی اخبار ''ازویسٹیا'' چیختا ہے کہ۔

وقت آ گیا ہے کہ ازدواجی زندگی میں خیانت کو قانونی جرم قرار دیا جائے اور لوگوں پر واضح کردیا جائے کہ تعلقات زن وشو میں بے وفائی اشتراکی اخلاق کی رو سے سخت معیوب اور قابل مواخذہ ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ نام نہاد ''اشتراکی اخلاق'' کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے اس'' خیانت'' کو کیسے بند کریں گے' جب آپ'' نے پتھر باندھ دیے اور کتے کھول دیے تو کتوں کی غوطا آرائی اور ان کے کاٹ کھانے کے عمل سے کیونکر چھٹکارا حاصل ہوگا؟

اسلام کو آپ نے ''افیون'' کہہ کر اس کا مذاق اڑایا اور سرمایہ دار جیسے خبیث الفطرت ٹولے کی اصلاح کرنے کے بجائے جب اس کے بغض میں الہامی روایات سے اعراض برتا تو پھر یہی انجام ہوتا ہے؟

نامناسب نہ ہوگا کہ مجموعی طور پر امریکی معاشرے کی بھی ذرا اور قلعی کھول دیجائے۔ تاکہ جو لوگ دانایان فرنگ سے مرعوب ومتاثر ہوکر اسلام کے معاملہ میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہیں ان کی آنکھیں کھل جائیں آنے والا حوالہ اس لئے بھی بڑا اہم

ہے کہ اس میں پورے امریکہ کی عکاسی ہے:

امریکہ اپنی گھریلو زندگی میں جس راہ پر جارہا ہے اس کو اگر ترک نہ کیا گیا تو مذہبی واخلاقی نقطہ نظر سے الگ' سراسر دنیوی نقطہ نظر سے بھی وہ نہایت ہولناک نتائج سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دایان فرنگ میں کتنے ہی ایسے ہیں جو ناگزیر ضرورتوں کے تحت ''تعدد ازدواج'' کو ایک منصفانہ قانون قرار دیتے اور اس کی افادیت کے قائل ہیں۔ اس ضمن میں چند حوالے ضرور ملاحظہ فرمائیں تاکہ جن بے بصیرت لوگوں کے لیے خداوندان یورپ کی ہر بات ''سرمہ بصیرت'' ثابت ہوتی ہے انہیں آپ ان کے آقاؤں کے اقوال سے آگاہ کر سکیں۔

مسٹر جیمس ہنسٹن کے متعلق ہیر یلاک ایلس نے لکھا ہے کہ انہوں نے کئی بار اس بات کا اظہار کیا:

ایک بیوی بڑا پسندیدہ فعل ہے لیکن قانون کی رو سے اسے ضروری قرار دینا صحیح نہیں' اس کی وجہ؟

ہم نے تو حداز دواج کو ایک عالمگیر قانون کی شکل دیگراتنی جنسی بدعنوانیاں پیدا کردی ہیں کہ علانیہ طور سے تعدد ازدواج کا طریقہ رائج کرنے میں فواحش کا یہ سیلاب ہرگز نہ پھوٹتا' جبری تو حداز دواج پیشہ ورانہ عصمت فروشی کی تمام خرابیوں کی جڑ اور اس کا موجب ہے۔

''مغربی تہذیب میں ازدواجی زندگی کا مستقبل' نامی کتاب کا فاضل مصنف ویلسر مارک اپنے ہم وطن اور ہم قوم متعدد دانشوروں کے حوالے سے لکھتا ہے۔

کہ چند در چند وجوہات ایسی ہیں جن کی بنا پر تعدد ازدواج کی قانونا اجازت ضروری ہے۔

اسی کتاب کے حوالہ سے ''ڈاکٹر کوپ'' کی رائے سامنے آئی۔

کہ بعض صورتوں میں تعدد ازدواج جائز قرار دینے سے عورتوں اور مردوں کی مشکلات دور ہو جائیں گی۔

اور مسٹر سدرن نے لکھا کہ:

اگر اکثریت دوسری شادی پسند نہیں کرتی تو نہ کرے اسٹیٹ کو یہ حق نہیں کہ اسے بزور نافذ کرے بلکہ اسے حالات کی مناسبت سے کھلا چھوڑ دے تاکہ بوقت ضرورت لوگ اس سے بہرہ ور ہو سکیں مشہور فرانسیسی مفکر لی بان پیشین گوئی کے انداز میں کہتا ہے۔

آئندہ چل کر فرانس میں تعدد ازدواج کو قانوناً تسلیم کرنا پڑے گا اس سے بہت سی معاشرتی خرابیوں کا قلع قمع ہوگا۔

پروفیسر کرسچین فان اہرن فلیس سے آریائی نسل کی بقا کا ضامن قرار دیتا ہے۔[۴۶]

ان حوالہ جات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ تعدد ازدواج ایک ضرورت ہے۔ اور جب ہم اسلام کے احکام پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی "ضرورت" کے تحت ہی اس کا جواز ثابت ہوتا ہے ورنہ اگر محض جنسی لذت و شہوت رانی مقصود ہو تو اسلام اسے سختی سے منع کرتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِيْنَ وَالذَّوَّاقَاتِ[۴۷]

وہ ضروریات جن کی بنا پر اسلام نے "دوسری شادی" کی اجازت دی ان میں جنگ یتامیٰ کی بیوہ مائیں، بے سہارا بہنوں وغیرہ کی معاونت شامل ہے اور بقول مولانا عبدالسلام ندوی۔

افزائش نسل، خاندانی تعلقات کا استحکام، سیاسی شور وشر کا خاتمہ جیسے معاملات بھی اس ضرورت کے تحت آتے ہیں۔

جنگ کے ضمن میں ہٹلر کی بات قابل توجہ ہے۔ جنگ عظیم اول اور دوم جس طرح انسانی دنیا کے لیے تباہی کا سامان لائیں اس کے بعد کوریا کی جنگ، ویت نام کی جنگ عرب اسرائیل جنگ یا تازہ ایران و عراق جنگ میں جس کثرت سے مرد مرے یا مر رہے ہیں، ان کے بعد اگر "یک زوجگی" کے احمقانہ اصول پر قائم رہیں گے تو اس کا انجام کیا نکلے گا؟ یہی دکھ تھا جس کا اظہار ہٹلر نے میری پکار میں کیا، اس نے لکھا:

جرمنوں کے نسلی اسلاف میں تعدد ازدواج کا رواج تھا اور وہ ان کے حالات میں

بہت ٹھیک تھا اب اس جنگ کے بعد اس قوم کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ تعدد ازدواج کو جائز قرار دینا پڑے گا یا کم از کم یہ کرنا پڑے گا کہ بے نکاحی اولاد کے ماتھے پر سے حرامی ہونے کا کلنک کا ٹیکہ مٹا دیا جائے' جو بچہ اس قوم میں پیدا ہو وہ حلالی ہی شمار ہو۔

انسانی ضرورتوں کے ضمن میں خلیفہ عبدالحکیم نے نپولین کی مثال دی ہے جو غریب گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اپنی فراست سے بادشاہ ہو گیا اور جب شاہی خاندان اسے نفرت سے دیکھتا تو اس نے شاہی گھرانے میں تعلق جوڑنا چاہا۔ پہلی بیوی موجود تھی کلیسائی عیسائیت دوسری بیوی کی راہ میں مانع تھی' مجبور ہو کر اس نے پہلی کو طلاق دی اور شاہی خاندان میں دوسری شادی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ چونکہ ''ضرورت'' کا ہے اس لئے انسانی معاشرہ میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایک کے بعد دوسری شادی کا رسک لیتے ہیں ''نفسیات جنسی'' کے مصنف ''ہیویلاک ایلس'' کے بقول۔

عام حالات میں مردوں اور عورتوں کی تعداد قریب قریب مساوی ہوتی ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ہر مرد کو دو عورتیں نصیب ہوں۔ ضرورت و مجبوری کے تحت جن معاشروں میں ایسا ہوتا ہے وہاں نہایت درجہ محدود آبادی اس صورت حال سے دوچار ہوتی ہیں۔

اور 1957ء کی رپورٹ متعلقہ ہندوستان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ہزار میں 21 مرد ایسے ہوتے ہیں جو دوسری شادی کرتے ہیں' ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے اسباب کچھ تو گزر چکے ہیں اور بعض حکماء نے تین اسباب اور بھی گنوائے ہیں۔

پہلی بیوی سے اولاد نہ ہو۔ تو ایک مرد دوسری شادی کر سکتا ہے اس کے لیے ایک مرد کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ کہ اس کے دنیا سے جانے کے بعد کوئی اس کا نام لینے والا ہو اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں' لیکن ''وارث صالح'' کی خواہش ان میں بھی ہوتی ہے جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعات مندرجہ قرآن سے ثابت ہے اور خاص طور پر ان کی وہ دعا ملاحظہ فرمائیں' جس میں وہ اپنے رب سے کہا کرتے ہیں۔

جب اس نے اپنے رب کو پست اور خفیہ آواز سے پکارا' زکریا نے عرض کی' اے

میرے رب میری ہڈیاں بڑھاپے سے ضعیف ہوگئیں اور سر بڑھاپے کی سفیدی سے چمک اٹھا۔ اور میرے رب تجھ سے دعا کر کے میں کبھی محروم نہیں رہا۔ اور میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ سو تو مجھ کو اپنے پاس سے ایک وارث عطا کر جو میرا بھی وارث ہو اور اولاد یعقوب کا بھی وارث ہو اور تو اس وارث کو اے میرے رب اپنا پسندیدہ اور مقبول بنائیو!

ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیوی دائم المرض ہے وہ تعلقات زن وشو کی متحمل نہیں ایسے میں اگر مرد دوسری شادی کر لیتا ہے اور پہلی کو بھی علی حالہ اپنے عقد میں رکھتا' اس کے دوادارو کا اہتمام کرتا' اس کا نان ونفقہ میں ہر طرح خیال کرتا ہے تو سوچیں یہ سودا مہنگا ہے یا سستا؟

اور بقول بعض حکماء ایک سبب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورت اپنی مخصوص ساخت کی بنیاد پر جلد بوڑھی ہو جائے جب کہ مرد ابھی ایسا نہیں ہوا تو اگر وہ شرعی طریق سے نکاح ثانی کر کے اپنے آپ کو کئی ایک خرابیوں سے بچا لیتا ہے تو اسے اسلام کا احسان ماننا چاہیے۔ نہ کہ اس پر معترض ہونا چاہیے۔

اس پر مجھے ایک بات یاد آئی جس کے راوی ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور کے ڈپٹی ڈائریکٹر متعدد کتب علمیہ کے مصنف او درویش صفت عالم مولانا محمد حنیف ندوی ہیں کہ ادارہ میں امریکن وفد آیا' جب ادارہ کے ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب تھے امریکہ وفد نے مختلف موضوعات پر خلیفہ صاحب سے بات کی ادارہ کے باقی ارکان بھی موجود تھے دوران گفتگو تعدد ازدواج کا مسئلہ بھی آیا امریکن وفد نے وہی سطحی قسم کے اعتراض کیے خلیفہ صاحب نے اپنے ذوق کے مطابق نہایت مسکت جوابات دیئے اور آخر میں ان سے کہا کہ ایک سے زائد تعداد میں داشتائیں اور بے نکاحی عورتیں اپنے پاس رکھنا اور اخلاق و معاشرہ کی بھداڑانا بہتر ہے یا جائز طریق سے 4 عورتوں سے شادی کر لینا؟

خلیفہ صاحب نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ امریکن وفد کے ارکان مبہوت ہو گئے اور ان سے اس کا کوئی جواب نہ بن سکا۔

عورت کی مخصوص ساخت کا پچھلی سطور میں ذکر آیا اس پر بھی چند باتیں نوٹ کرلیں۔

انسانی مشاہدہ اس مسئلے میں بڑا واضح ہے کہ انسانی گاڑی کے ان دو اہم پہیوں (مرد عورت) کی تخلیق میں اللہ رب العزت نے اپنی صنعت کاری کا خوب خوب مظاہرہ فرمایا ہے۔ دیکھیں تو زبان پر بے ساختہ آتا ہے۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین

دورِ حاضر کی کم نصیبی یہ ہے کہ اس نے جنس انسانی کے ان دو حصوں کے معاملات میں ''مساوات'' کی بھونڈی رٹ لگا رکھی ہے' حالانکہ مرد اور عورت کا وظیفہ زندگی' اس کے اعمال حیات اور اس کی ضروریات وفرائض بالکل الگ ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب اچھے خاصے روشن خیال شمار ہوتے تھے لیکن مردوں کے ساتھ عورتوں کی مساوات کے غیر فطری نعرہ کو انہوں نے بھی پسند نہیں کیا تعدد ازدواجی میں لکھتے ہیں۔

مردوں کی معاشی زندگی میں خواہ مخواہ کی مساوات طلبی سے تمام قسم کے کاروبار میں شرکت اور وہ بھی اس انداز کی کہ عورت کو اپنی فطری فرائض سے بہت کچھ کنارہ کشی کرنی پڑے' اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی...... بے ضرورت خواہ مخواہ ہر قسم کی معاشی جدوجہد میں اپنی نسوانی قوتوں کو صرف کرنا اور اپنے نسوانی خواص وفضائل کو کھو بیٹھنا خود عورتوں کے حق میں خسارے کا سودا ہے۔''

یہ عبدالحکیم صاحب کا فرمان ہے۔ سابق صدر فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن و بانی ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ کا جو اپنے مختصر کتابچے ''اقبال اور ملا'' کے حوالہ سے خاصے لتاڑے جاتے ہیں۔ کسی ملائے مکتبی اور بوریہ نشین نے یہ بات نہیں کی۔ اور سچ یہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے عین فطرت کی ترجمانی کی۔ اور اب دیکھیں اس ضمن میں ''دانایان فرنگ'' کیا کہتے ہیں۔

عورت کے تمام اعضاء سر سے پیر تک مرد کے اعضا سے مختلف ہیں۔

عورت کے جسمانی عضلات مرد مختلف اور حد درجہ ضعیف ہیں۔

دو حصہ قوت مرد میں اور ایک حصہ عورت میں ہے' عضلات کی سرعت و حرکت کا بھی یہی حال ہے۔

علامہ پروڈن کہتے ہیں۔

''عورت کا وجدان عقلی قوت' اخلاقی قوت مرد سے کمزور اور مختلف ہیں' پس عورت اور مرد میں عدم مساوات کوئی عارضی نہیں بلکہ عورت کی طبعی خاصیت پر مبنی ہے۔[۵۵]''

ایک فرانسیسی عالم موزیہ نے عورت کے متعلق ایک کتاب لکھی ژول سیمان نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

''عورت کو چاہئے کہ عورت رہے' بے شک عورت کو چاہیے کہ عورت رہے اس میں اس کے لیے فلاح ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے قدرت کا یہ قانون اور اس کی ہدایت ہے۔''

مزید کہتا ہے:

جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہوتی ہے' اس میں شک نہیں کہ وہ ایک عالم بسیط کا فرض انجام دیتی ہے' مگر افسوس کہ عورت نہیں رہتی۔

انتظام الیسا سیہ کا انگریز مصنف لکھتا ہے:

عورت کے معاملہ میں قانون الٰہی اس درجہ صحیح اور محقق ہے کہ اس کی ممانعت میں سینکڑوں باطل خیالات قائم ہوتے رہے مگر بغیر کسی نقصان یا تغیر کے وہ سب پر غالب آتا رہا۔

اور سوشلسٹ فلاسفر پروڈن ''مسئلہ حقوق نسواں'' میں رقم طراز ہے' پس اگر عورت نے سوسائٹی میں وہ اقتدار حاصل کر لیا جس کے لیے تم کوشش کر رہے ہو اور مرد کے مقبوضات میں داخل ہو گئی تو اسے میرے عزیز دوست اچھی طرح سمجھ لو کہ پھر عورت کا معاملہ حد سے زیادہ گزر جائے گا اور صاف صاف یہ ہے کہ وہ استعباد اور غلامی میں گرفتار ہو جائے گا۔

دانشوران فرنگ کے یہ ارشادات و خیالات خدا جانے ہماری قوم کے ان مرعوب انسانوں کی نظر سے گزرے یا نہیں جو عورت کے معاملہ میں حدود و قوانین الٰہی پر سختی و جبر کی

پھبتی کستے نہیں شرماتے ...... اے کاش انہیں احساس ہوتا کہ خالق فطرت نے اپنے بندوں کے لیے جو قوانین واحکام متعین فرماتے ہیں' انہی میں بندوں کی بہتری ہے' ان کی مصالح اور حکم بندوں کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔

عسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وھو شر لکم واللّٰہ یعلم وانتم لاتعلمون .

اگر قلب ونظر تہذیب فرنگ کے سبب بالکل تاریکی میں ڈوب نہیں گئے تو گذشتہ تحریر تعدد ازدواج کے معاملہ میں کافی ہوسکتی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

کہ تعدد حکم نہیں ضرورت کے تحت روا ہے اور تعدد کے بعد جو فساد کا شکار ہوکر عدل نہیں کرتا۔

وہ جہاں صبح قیامت میں فالج زدہ ہوکر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوگا وہاں دنیا میں وہ تعزیری قوانین سے نہیں بچ سکتا۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے حکیمانہ انداز میں کتنی پتہ کی بات کی ہے۔

بہرحال حکم شرعی تو یہی ہے کہ تعداد ازدواج میں نکاح تو ہر حال میں منعقد ہو ہی جاتا ہے خواہ عدل ہو یا نہ ہو' لیکن عدم عدل کے وقت گناہ ہوگا' اور چونکہ اس وقت عدم عدل (خصوصاً) غالب ہے' اس لیے بہتر یہی ہے کہ تعدد اختیار نہ کیا جائے اور ایک ہی پر قناعت کی جائے اگر چہ ناپسند ہو۔"

اور حکیم الامت حضرت الامام الشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی اسی انداز میں فرماتے ہیں۔

لوگ عورتوں کے حسن وجمال کی طرف مائل ہوتے ہیں' اس لیے بہت سی عورتیں چاہتے ہیں لیکن پھر ایک محبوبہ بنا کر باقی کو معلق چھوڑ دیتے ہیں' اس لیے نہ وہ محبوبہ ہوتی ہے نہ بیوی۔

اس قسم کے حالات اگر پیدا ہوجائیں کہ معاشرہ میں عام قسم کی ناانصافی پھیل جائے تو ہمارے خیال میں حکومت وقت بشرطیکہ وہ صالح اور عادلہ ہو کسی نوع کی پابندی بھی

لگا سکتی ہے اور صالح امت کے لیے اس طرح کی پابندیاں کوئی نئی بات نہیں ...... عہد خلافت راشدہ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

> ابو حنیفہ یمانی رضی اللہ عنہ نے مدائن میں ایک یہودیہ سے نکاح کر لیا (اہل کتاب سے نکاح درست تھا) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں اس بیوی کو چھوڑ نے کا لکھا' انہوں نے جواباً پوچھا کہ آیا حرام ہے؟ فرمایا کہ میرا خط پہنچنے سے قبل چھوڑ دو' مجھے ڈر ہے کہ تمہاری پیروی میں (الناس علی دین ملوکھم) دوسرے مسلمان بھی ایسا کریں کہ کتابی عورتوں سے شادیاں رچائیں عام طور پر ایسا ہونے لگا تو مسلمان عورتوں کے لیے یہ آزمائش کافی ہوگی۔

اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی موجودگی میں حضرت علی کا ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنا اور اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا عتاب اس کی دلیل ہے کہ تعدد مباح سہی لیکن مصلحت کے اعتبار سے رکاوٹ درست ہے۔ گویا حکومت صالحہ صالح امت کے لیے ممنوع کو مباح اور مباح کو ممنوع کر دینے کا حق رکھتی ہے لیکن تعدد کا مسئلہ ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا کیونکہ جیسا کہ پہلے معاشرہ میں برائے نام وہ افراد ہیں جو ''ضرورت '' کے تحت ایسا کرتے ہیں۔ ضرورت کی تفصیل ہم عرض کر چکے اور باحوالہ یہ بھی ثابت کر چکے کہ یہ معاملہ انسانی معاشرہ کے لیے باعث رحمت ہے ورنہ اس پر جبری پابندی لگا کر یورپ جو پھل کھا رہا ہے اس کا آپ نے اندازہ لگا ہی لیا کہ کس طرح جنسی تعلقات آوارگی کا شکار ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اور کس طرح ناجائز اولاد کی فوج ظفر موج تیار ہو رہی ہے نامناسب نہ ہوگا اس حصہ کے ''حرف آخر'' کے طور پر اقوام متحدہ کے ڈیموگرافک سالنامہ 1959ء کا ایک اقتباس پیش کر دیا جائے۔ سالنامہ کے ایڈیٹر لکھتے ہیں۔

> اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے' اس کو بھی تہذیب جدید نے بڑے زور وشور کے ساتھ جہالت کا قانون قرار دیا ہے' مگر تجربے نے ظاہر کر دیا ہے کہ اسلام کا یہ اصول انسانی فطرت کا عین تقاضا ہے کیونکہ چند زوجیت (تعدد ازواج) کے قانون کو ختم کرنا دراصل درجنوں غیر قانونی زوجیت کا دروازہ کھولنا ہے۔ اقوام متحدہ کے ڈیموگرافک سالنامہ 1959ء کے مطابق جدید دنیا

میں جوصورت حال ہے اس کے مطابق بچے۔

اندر سے کم اور باہر سے زیادہ پیدا ہو رہے ہیں۔ان ملکوں میں حرامی بچوں کا تناسب 60 فیصد ہے اور بعض ممالک مثلاً پناما میں تو 4 سے 3 بچے اس انداز کے ہیں مسلم ممالک میں یہ تناسب نفی کے برابر ہے۔مثلاً مصر جو سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوا اس میں تناسب ایک فیصدی سے بھی کم ہے ایسا کیوں؟

اس کا جواب ایڈیٹر صاحبان کے بقول یہ ہے کہ۔

چونکہ مسلم ممالک میں چند زوجیت کا رواج ہے اس لیے وہاں ناجائز ولادتوں کا بازار گرم نہیں چند زوجیت کے اصول نے مسلم ملکوں کو اس طوفان سے بچالیا ہے۔[۶۰]

اس تفصیل کے بعد اب اگلا مرحلہ ہے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے بیک وقت کئی نکاح کیے حتیٰ کہ جب آپ نے اس دنیا سے ظاہری طور پر پردہ فرمایا تو آپ کے حرم سرا میں 9 ازواج مطہرات (سلام اللہ تعالیٰ علیہن ورضوانہ) موجود تھیں آپ کے معاملہ میں دشمنان اسلام نے خاصی چیخ چیخ کی اور آپ کی ذات اقدس پر کئی ایک بھونڈے اعتراض کیے اس لیے اس سے پہلے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعدد ازدواجی کے سلسلہ میں دوسرے انداز سے گفتگو کریں آپ کی مبارک زندگی کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔آپ اس دنیا میں 63 برس موجود رہے ان 63 برسوں میں 40 برس وہ ہیں جب آپ منصب نبوت کی ذمہ داریوں کے ذمہ دار قرار پائے تھے اور آخری 23 برس وہ ہیں جب آپ ایک رسول نبی مبلغ مزکی اور رداعی کی حیثیت سے رونق افروز ہیں 40 برس کی ابتدائی زندگی جتنی بے داغ' بے عیب اور پاکیزہ ہے اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔

آپ کے چچا عباس نے دوشعروں میں آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔جب آپ پیدا ہوئے تو ساری زمین روشن ہوگئی۔اور آپ کے نور سے سارا عالم منور ہوگیا آپ صاحب حُسن وجمال ہیں۔آپ کے روئے انور کے طفیل بارش کی دعا کی جاتی ہے۔آپ یتیموں کی پناہ اور بیواؤں کے محافظ ہیں۔

بچپن کے زمانہ میں اپنے اعزاز کے ساتھ تعمیر کعبہ کے عمل میں آپ بھی پتھر

اٹھا رہے ہیں چچا عباس آپ کا تہبند کھول کر سر پر باندھ دیتے ہیں تاکہ پتھروں سے سر محفوظ رہے اچانک تہبند کھل گیا لیکن ایک لمحہ نہ گزرا کہ بچہ بے ہوش ہو گیا ہوش آیا تو زبان پر یہ الفاظ تھے "میرا تہبند اور چچا نے فوراً تہبند باندھ دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک آواز آئی جو اوروں نے بھی سنی۔

کہ یامحمدؐ عورتک۔ اے محمد اپنے ستر کی حفاظت کرو۔

اور پھر 25 برس کی عمر میں نکاح کیا تو ایک 40 سالہ خاتون سے' جو دو مرتبہ بیوگی کا غم اٹھا چکی تھیں۔ وہ خاتون فحش و بے حیائی سے اٹے ہوئے معاشرہ میں طاہرہ کے معزز لقب سے معروف تھیں۔ انہوں نے تجارتی معاملات میں آپ کی عصمت کو دیکھا تو بات نکاح تک پہنچ گئی۔ آپ نے بھی اس کی پرواہ نہ کی کہ میں 25 سال کا جوان رعنا اور یہ 40 سال کی بیوہ خاتون' بلکہ خاموشی سے نکاح کر لیا اور اس طرح کہ جب تک وہ زندہ رہیں دوسری شادی کا تصور تک نہ آیا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ انتخاب کیوں کیا؟ اس کی وجہ وہ خود ارشاد فرماتی ہے۔

انی رغبت فیلک لحسن خلقک و صدق حدیثک

میں نے آپ کو آپ کے اعلیٰ اخلاق اور راستبازی کے سبب منتخب کیا۔

مکہ معظمہ جو لہو لعب کی منڈی تھی اور جہاں "لہو لعب کا کاروبار زوروں پر تھا اس میں یہ شخص رہتا ہے لیکن اس طرح کہ اس کی نوجوانی' اور جوانی بالکل معصوم رہتی ہے اس پر ذرہ برابر داغ نہیں آتا حتیٰ کہ اگر ایک موقع پر ساتھ میں بکریاں چرانے والا ساتھی اس قسم کی ایک محفل کی ترغیب دیتا ہے تو آپ کے جواب سے قبل ہی آپ نیند کا شکار ہو کر غیبی طور پر محفوظ ہو جاتے ہیں اور اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ عطائے نبوت کے بعد جب آپ نے اعلان دعوت اسلام کا اہتمام کیا اور پہاڑی کا وعظ ارشاد فرمایا تو اس وقت روساء مکہ نے ہر طرح کی بدتمیزی کی لیکن آپ کے اخلاق عالیہ اور کیرکٹر کے متعلق کوئی بات نہ کہہ سکے' کہا تو یہی کہ "ہم نے بارہا آپ کو آزمایا تو ہر موقع پر راست باز امین پایا' آپ کی صداقت شعاری اور اخلاقی برتری کی ہم گواہی دیتے ہیں .... لیکن آپ کی دعوت نہ

مانیں گے۔

اس کے ساتھ ذرا دشمنوں کا اعتراف ملاحظہ فرمائیں سر ولیم میور نے ''لائف آف محمد''، لکھی، صوبہ متحدہ کا گورنر انگریز اور غائیت درجہ کا متعصب' لیکن مجبور ہے اور لکھتا ہے۔

کہ آپ کی بیوی' دوست (صدیق اکبر) بھائی علی اور خادم (زید) سب سے پہلے اور پر خلوص ایمان لائے تو اس لیے کہ انہیں آپ سچے نظر آئے۔ آگے لکھتا ہے۔ کہ ایک مکار اور دھوکہ باز شخص باہر والوں کو اپنے فریب اور جھوٹ میں پھانس سکتا ہے لیکن گھر والوں اور قریبی لوگوں کو زیادہ دیر تک دام فریب میں گرفتار نہیں رکھ سکتا۔

اور مسٹر گاڈ فرے ہنگس ''اپالوجی فار محمد'' میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت ابوعبیدہؓ حضرت زبیرؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) جیسے حضرات جو ابتداء میں مسلمان ہوئے' قبول اسلام کو آپ کی صداقت شعاری اور عظمت کی دلیل قرار دیتا ہے کہ یہ لوگ آئندہ چل کر عظیم جرنیل مدبر' منتظم اور حکمران ثابت ہوئے وہ کہتا ہے۔

ایسے بڑے لوگ جو عقل و دانش میں اپنا جواب نہ رکھتے ہوں آسانی سے کسی کے دام فریب کا شکار نہیں ہو سکتے۔''

اور یہی ''گاڈ فرے'' آگے لکھتے ہیں۔ اور اسی میں ''تعدد ازدواج'' کا بھی حل دیتے ہیں کہ۔

''سب عیسائی اس پر متفق ہیں کہ محمدؐ 40 برس تک نہایت پاک طینت نیک چلن اور صادق و امین رہے' پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ایک شخص چالیس سال تک صاد دامن رہ کر اکتالیسویں سال ایک دم فریب کار اور جھوٹا بن گیا؟ بقول گاڈ فرے۔ اس بدل جانے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔

دولت کی خواہش اور عورت کی خواہش دولت و ثروت اس کا مقصد ہوتا تو کعبہ کی تولیت جو اس کا خاندانی منصب تھا' وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن اس نے عثمان بن طلحہ کو کلید کعبہ واپس کر دی رہ گیا

عورت کا معاملہ تو جس 25 سالہ نوجوان نے اپنے سے 15 برس بڑی بیوہ خاتون سے پہلا نکاح کیا ہو اور اس کی زندگی تک نہایت محبت سے اسی کے ساتھ وقت گزارا ہو اس پر یہ الزام کتنا گھناؤنا ہے؟

کیا اس کے بعد بھی محمدؐ کی صداقت پر شبہ ہو سکتا ہے؟

ٹامس کارلائل جو بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی مورخ کے ساتھ ادیب بھی تھے' نے اپنے مجموعہ ہائے لکچر میں لکھا۔

لوگوں نے تاریخ کی اتنی ممتاز شخصیت کو طرح طرح سے بدنام کر رکھا ہے' وقت آ گیا ہے کہ اس بدنامی کو دور ہونا چاہیے۔ ہمیں خود اپنی ناانصافیوں کی تلافی کرنی چاہیے۔ اور عرب کے مصلح' مشرق کے ایک بطل عظیم' ہرگز ان الزامات کے مورد نہیں جو ان پر لگائے گئے وہ نہ چور تھے' نہ ڈاکو نہ دھوکے باز نہ نفس پرست' وہ اپنے وقت کے بہت بڑے اور کامیاب مصلح تھے۔ ملک عرب کی انہوں نے کایا پلٹ دی وہ بڑے مخلص اور نیک نیت تھے۔ انہوں نے وحشیوں کو انسانیت سکھا دی۔ کروڑوں آدمی ان کے تقدس کے قائل ہیں ہمیں بھی ان کا نام عزت اور تکریم سے لینا چاہیے۔

عفت و عصمت اور پاکبازی کا یہ مجسم رسول ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ کفار وقریش مکہ اس کے سامنے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم آپس میں کوئی مصالحت کی شکل نکالیں آپ نے آبائی دین کو برا کہا' ہمارے معبودوں کو جھٹلایا اس قسم کے اقدامات سے آپ کا مقصد حصول دولت ہے تو ہم اتنی دولت اکٹھی کر دیتے ہیں کہ آپ سے بڑا کوئی مالدار نہ ہو۔ مکہ کی سرداری کی خواہش ہے تو اس کے لیے حاضر ہیں' خوبرو حسیناؤں کی تمنا ہے تو یہ بھی آسانی سے ہو سکتا ہے اور کسی جن پری کا اثر ہے یا کوئی جادو کا چکر ہے تو اس کا علاج ہو سکتا ہے۔

جانتے ہو یہ پیغام کون لایا؟ عتبہ بن ربیعہ جو سب سے زیادہ لسان اور زبان طراز تھا آج محمد عربی کے قدموں میں حسینان عرب' عرب کی بادشاہی اور دولت کے خزانے موجود تھے لیکن اس امام معصوم اور خاتم النبیین والمعصومین نے جواب دیا' ایسی کوئی

بات نہیں' یہ اللہ کا پیغام ہے' حق کی دعوت ہے' اسے پہنچانا میرا فرض ہے یہ معمولی چیزیں ہیں آسمان کا سورج اور چاند بھی مجھے میرے مقصد سے الگ نہیں کر سکتا یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید۔

تو ہاں اس امام معصوم نے 25 سال کی بھرپور جوانی میں 40 سالہ بیوہ سے نکاح کیا اور یہ کام کسی نفس پرست کا نہیں ہوتا جب کہ یہ سوسائٹی بھی وہ ہو جس میں کوئی اخلاق قید ہے نہ بندھن اور پھر نبوت کے دسویں سال شوال کے نصف تک یہ عفیفہ طاہرہ اور پاک طینت خاتون زندہ رہیں' اس وقت تک کسی اور عورت سے نکاح نہ کیا۔

اس کے بعد جو نکاح ہوئے ان میں سے ایک حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو ''ام المساکین'' کے لقب سے ملقب ہیں' ہجرت کے تیسرے سال ان سے نکاح ہوا اور وہ محض دو تین ماہ زندہ رہیں باقی نو ازواج مطہرات جو بوقت وفات موجود تھیں ان کے نام اور سنین نکاح یہ ہیں۔

حضرت سودہ بنت زمعہ 10 نبوی

حضرت حفصہ بنت عمر فاروق 3ھ

حضرت ام سلمہ 5ھ

حضرت جویریہ (بنی مصطلق کی شہزادی) 5ھ

حضرت زینب بنت جحش قریشیہ 5ھ

حضرت ام حبیبہ بنت حضرت ابی سفیان اموی 6ھ

حضرت میمونہ 7ھ

حضرت صفیہ ہارونی (خیبر کی رئیس زادی)

حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ بنت ابی بکر صدیق اکبر 3ھ قبل ہجرت مطابق مئی 620ھ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے زندگی کے کامل 25 برس ایک بیوہ عورت کے ساتھ گزار دیئے اور پھر زندگی کے باقی چند برسوں میں جو نکاح کیے تو ایک حضرت عائشہ کو چھوڑ کر باقی سب خواتین سن رسیدہ' بیوہ یا مطلقہ تھیں' جو بجائے خود اس بات

کی دلیل ہے کہ ان نکاحوں کے پس پردہ اور محرکات تھے معاذ اللہ جنسی خواہشات نہ تھیں۔

حضرت خدیجہ کے بعد بھی جو پہلا نکاح ہوا وہ حضرت سودہ کے ساتھ ہوا وہ بذاتِ خود سن رسیدہ تھیں اور پھر 55 سال کی عمر تک کوئی نکاح نہیں ہوا جو ہوئے اس کے بعد ہوئے۔

ارباب اغراض اور معترضین نے اس نکتہ پر کبھی غور نہیں کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے آپ پر شاعر' کاہن اور مجنون وغیرہ کئی تہمتیں تو لگائیں لیکن نفس پرست اور خواہشات کا پجاری جیسے اتہامات کبھی نہ لگائے اگر خدانخواستہ یہ بات کسی درجہ میں بھی ہوتی تو کفار وقریش مکہ جیسے مردم آزار لوگ ضرور یہ بات کہتے اور پوری قوت سے اس کو اچھالتے۔

سوال یہ پیدا ہوگا کہ مان لیا کہ آپ کی ذات اقدس ان الزامات سے بری تھی لیکن جب عام لوگوں کے لئے 4 عورتوں کی تحدید ہے تو آپ کا معاملہ اس کے سوا کیوں ہے؟

اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ زندگی کے متعدد مسائل و معاملات کی طرح یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی اور اس خصوصیت کے کئی اسباب تھے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کے حبالہ عقد میں جو خواتین آسکتی تھیں ان کی تفصیلات یہ ہیں۔

1۔ وہ خواتین جن کا مہر دیا گیا اور وہ آپ کے عقد میں آئیں۔

2۔ جو بطور فے آپ کے عقد میں آئیں۔

3۔ چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں

4۔ کوئی مسلمان عورت نے اپنا نفس آپ کے ہبہ کردے یعنی بے مہر نکاح میں آنا چاہیے اور نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہیں (یہ حکم آپ کے لئے خاص ہے)

قرآن میں ہے:

اے نبی آپ کی یہ تمام بیویاں جن کے مہر آپ ادا کر چکے ہیں' آپ کے لئے حلال ہیں' اور وہ عورتیں جو اللہ نے آپ کو غنیمت میں دلوائی ہیں جو آپ کی مملوکہ ہیں' وہ بھی ہم نے آپ کے لئے حلال کی ہیں اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی

بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو وہ بھی آپ کے لئے ہم نے حلال کی ہیں اور اس مسلمان عورت کو بھی ہم نے حلال کیا ہے جو بلا کسی عوض کے اپنے آپ کو نبی کے لئے ہبہ کر دے بشرطیکہ نبی بھی اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیے یہ حکم یعنی بدون وجوب مہر کے نکاح صرف آپ کے لئے خاص ہے دوسرے مسلمانوں کے لئے نہیں' بلاشبہ ہم نے عام مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے حقوق کے بارے میں جو احکام مقرر کئے یعنی مہر وغیرہ کے وہ ہم کو معلوم ہیں' اے پیغمبر آپ کے ساتھ بعض احکام کی خصوصیت اس لئے ہے تا کہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ رہے' اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

ان چار قسم کی عورتوں میں تنہا وہ چوتھی قسم ایسی ہے جس میں نبی پاک کی خصوصیت ہے بقول سر سید احمد خان مرحوم:

"بے مہر جو عورت اپنے آپ کو آپ کے لیے ہبہ کر دے اس کی آپ کو اجازت ہے عام مسلمانوں کو نہیں۔ اس سے جہاں اس بدگمانی کا قلع قمع ہوتا ہے جو مخالفین اسلام آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف پھیلاتے ہیں وہاں عام مسلمانوں کے حق میں یہ احتیاط بھی ہے کہ آئندہ کوئی تنازعہ نہ کھڑا ہو۔"

مخالفین کا یہ کہنا کہ سورۂ نساء کی وہ آیت جب نازل ہوئی جس میں 4 کی تحدید تھی تو اس کے بعد نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو جن کے پاس چار سے زائد خواتین تھیں حکم دیا کہ چار سے زائد کو طلاق دے دو' تو آپ نے خود اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ اس کا جواب قرآن میں موجود ہے کہ نبی کے عقد میں جو عورت آ گئی اسے روحانی احترام میں ماں کا درجہ حاصل ہو گیا نبی کی طلاق یا موت کے بعد وہ عورت کسی دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی۔ قرآن میں ہے:

"ولا تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا"

اور نہ تم کو (اے مسلمانوں) یہ جائز ہے کہ تم پیغمبر کے بعد ان کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح کرو۔ پیغمبر کو تکلیف دینا۔

اور ان کی بیویوں سے نکاح کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے۔
مـن بـعـدہٖ سے مراد من بعد وفات النبی یا بعد فراق النبی ہے گویا اس میں وفات اور طلاق دونوں شامل ہیں۔

یہ اعتراض کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم کیوں دیا کہ جو عورت نبی کریم سے منسوب ہو جائے وہ پھر دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کا جواب سر سید احمد خان مرحوم دیتے ہیں (اور جاننے والے جانتے ہیں کہ بقول کے وہ ''روشن دماغوں'' کے سردار تھے)

> ''یہ حکم نہایت عمدہ ہے۔ اگر اس کا امتناع نہ ہوتا تو اسلام میں نہایت فتور واقع ہوتا' یہ عورتیں اپنے نئے خاوند کے سبب اور ان کے مطلب کے موافق سینکڑوں حدیثیں اور روایتیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کرتیں جن میں ایک فتنہ عظیم اسلام میں برپا ہوتا اور اسلام میں باعث فتور اور اس کے احکام میں اختلال کا سبب ہوتا۔ اس لئے یہ حکم نہایت ضروری تھا۔

چنانچہ جب آیت تحدید نازل ہوئی تو اس وقت یہ بیبیاں آپ کے حبالہ عقد میں تھیں۔ امت کے لئے چار کی اجازت سے زائد ضرورت و مصلحت اور خصوصیت کی بناء پر اپنے حبالہ عقد میں رکھنے کی اجازت دیکر مزید نکاح نہ کرنے کا پابند کر دیا گیا جیسا کہ الاحزاب کی آیت 52 میں ہے۔ اس میں ارشاد ہے:

> ''ان چار مذکورہ بالا قسموں کے علاوہ اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ موجودہ بیویوں کو چھوڑ کر ان کی جگہ اور عورتوں سے نکاح کر لیں۔''

یعنی نہ تو اس تعداد 9 میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ان کو بدل سکتے ہیں۔ محققین کا کہنا یہی ہے کہ جس طرح عام امت کو چار سے زائد بیویوں کی اجازت نہ تھی آپ کو حضرت خدیجہ کے بعد 9 سے زائد کی اجازت نہ تھی اور یہ اجازت (یعنی 9 تک) اس لیے ملی کہ جب آیات تخییر (الاحزاب 28-29) نازل ہوئیں تو ان قابل احترام خواتین نے دنیا کے مال و متاع کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رفاقت کو اختیار کیا تھا اس لئے ان پر اللہ تعالیٰ نے یہ احسان کیا کہ نبی کے ساتھ ان کی

رفاقت اٹوٹ ہوگئی اور وہ دارین کے اجر عظیم کی مستحق قرار پائیں۔ ان کے ایثار و قربانی کا یہ صلہ اللہ نے انہیں مرحمت فرمایا۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ تعدد میں عدل شرط ہے جو عدل نہیں کر سکتا اس پر لازم ہے کہ وہ ایک پر اکتفا کرے تا کہ حسن معاشرت میں خلل نہ آئے۔ آپ چونکہ معصوم تھے اس لئے آپ کے حق میں نفس مفسدہ کو مناط حکم قرار دے دیا گیا کیونکہ آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ کی خلاف ورزی کا تصور ہی نہیں۔

اگر ذرا وقت نظر سے دیکھیں تو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں جو محدود عرصہ میں ہوئے کئی ایک مصالح نظر آتی ہیں جن سے دین ملت اور قوم کو فائدہ ہوا مثلاً قارئین جانتے ہیں کہ عرب میں قبائلی عصبیت کا کیا حال تھا؟ آپ نے مختلف قبائل کی خواتین سے نکاح کر کے ایک پل کا کام دیا جس کے سبب قبائلی عصبیت کی گرہیں ڈھیلی پڑیں اور انسانی برادری کو قریب آنے اور باہم جوڑ کا موقعہ ملا۔

آپ کی پہلی اہلیہ حضرت خدیجہ بنو عزیٰ سے متعلق تھیں تو اس کے بعد حضرت عائشہ بنو تمیم' حضرت حفصہ بنو عدی' حضرت ام حبیبہ بنو امیہ' حضرت میمونہ بنو غیلان' حضرت سودہ بنو عامر' حضرت زینب بنت جحش' بنو اسد حضرت جویریہ بنو مصطلق' حضرت صفیہ خاندان ہارون علیہ السلام اور حضرت زینب بنت خزیمہ بنو حلال سے متعلق تھیں' ان مختلف نکاحوں سے باہمی قرابتداروں کا وسیع سلسلہ جہاں قائم ہوا وہاں دشمنی و عداوت بھی کم ہوئی بنو امیہ کی دشمنی مسلم لیکن حضرت ام حبیبہ کے نکاح کے بعد وہ ہنگامہ نظر نہیں آتا بلکہ آپ کے والد اور سردار قریش ابو سفیان مدینہ منورہ میں آ کر معاملات صلح کو آگے بڑھانے کی فکر کرتے ہیں حضرت صفیہ کے نکاح کے بعد یہود کی دشمنی کی آگ ماند پڑ گئی اور حضرت جویریہ کے نکاح کے بعد بنو مصطلق کے قیدی آزاد ہو گئے۔ بعض خواتین کے نکاح کے سبب بعض جاہلانہ رسمیں ختم ہوئیں جیسے متبنیٰ کی رسم کہ اس کی جورو حقیقی بیٹے کی جورو کی مانند سمجھی جاتی حضرت زینب بنت جحش کے نکاح سے رسم بد ختم ہوئی' نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو بیک وقت مردوں اور عورتوں کے نبی تھے' ساری دنیا اور صبح قیامت تک کے نبی تھے' ان

کی آمد و بعثت سے قبل عورت مظلوم تھی' آپ نے اس کی مظلومیت ہی کو ختم نہ کیا بلکہ زندگی کی دوڑ میں اسے برابر کا شریک کیا' سوچیں زندگی کے کتنے مسائل تھے' جن کی عورت کو ضرورت تھی لیکن وہ کھلے بندوں بیان نہ ہو سکتے تھے' اس سلسلہ میں ازواج مطہرات سے یہ ضرورت بھی پوری ہوئی اور توسیع و تعلیم دینی کا کارخانہ قائم ہوا ایک حضرت عائشہ ہی کے حوالہ سے 2210 روایات منقول ہیں جبکہ حضرت میمونہ سے 76 حضرت ام حبیبہ سے 65 حضرت حفصہ سے 60 حضرت صفیہ سے 110 اور حضرت سودہ سے 5 روایات منقول ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنھن۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو ان سے ایک دفتر تیار ہو جائے گا تو وہ فقہ و فتاویٰ اور دینی ذکاوت میں اس عظیم درجہ کی مالک تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تعلیم' افتاء ارشاد اور اجتہادات کا عظیم ذخیرہ ہے جس کی ایک جھلک سید سلیمان ندوی مرحوم کی ''سیرت عائشہ'' میں دیکھی جا سکتی ہے کہ کس طرح بڑے بڑے مسائل میں انہوں نے امت کی رہنمائی کی۔ اس کتاب کے آخر میں سید صاحب مرحوم نے امام جلال الدین سیوطی قدس سرہٗ کے رسالہ ''عین الاصابہ'' کو تصحیح و تعلیق کے بعد ملحق کر دیا ہے جس میں امام سیوطی نے حضرت عائشہ کی ان روایات کو جمع کیا۔ جن میں انہوں نے اپنے معاصرین کی غلطیاں اور غلط فہمیاں ظاہر کیں۔

بہر طور تعدد ازدواج اور خاص کر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معاملہ اس قسم کا ہے جو اپنے جلو میں ہزاروں حکمتوں کو لئے ہوئے ہے شرط انصاف ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمہ آفتاب را چہ گناہ

عدم ادائیگی نفقہ پر فسخ نکاح

تحریر: پروفیسر سید شمس الدین

نکاح کی وجہ سے مرد وعورت پر ایک دوسرے کے جو حقوق واجب ہوتے ہیں ان میں ایک اہم ترین حق بیوی کا نفقہ ہے جو تین چیزوں کو شامل ہے: خوراک' پوشاک' اور مکان' قرآن مجید نے مختلف مواقع پر اس کی تصریح کر دی ہے۔

وعلى الولودله رزقهن كسوتهن بالمعروف

(ترجمہ) شوہر کے ذمہ بیویوں کا کھانا اور کپڑا ہے معروف طریقہ پر۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولينفق ذوسعة ومن قدر عليه رزقه فلينفق مما آتاه الله

(ترجمہ) یعنی اور اہل کشائش کو چاہیے کہ اپنی کشائش کے مطابق خرچ کریں اور جن پر روزی تنگ ہو ان کو بھی چاہیے کہ اللہ کی عطا کے مطابق نفقہ دیں۔

اسكنو هن من حيث سكنتم

(ترجمہ) جہاں تم خود رہو تو وہیں ان کو (اپنی بیویوں کو) بھی رکھو۔

احادیث سے یہ ثابت ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہے۔ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا۔

ولهن عليكم رزقهن و كسوتهن بالمعروف .

(ترجمہ) تمہارے ذمہ بھلے طریقے پر بیویوں کا کھانا اور کپڑا ہے۔

حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی نے ان کے بخل کی شکایت کی۔ تو آپ نے اجازت دی کہ ان کے مال میں سے اتنا لے لو جو تمہارے بچے کے لیے کفایت کر جائے۔

حضرت ماریہ نشیری نے دریافت کیا کہ بیوی کا ہم پر کیا حق ہے تو آپ نے حقوق بتاتے ہوئے فرمایا:

تطعمها اذا طعمت وتکسوها اذ کسبت

(ترجمہ) چنانچہ ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ اگر شوہر بالغ ہو اور بیوی ناشزہ (نافرمان) نہ ہو تو تمام اہل علم کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ شوہر اگر نفقہ ادا نہ کرے تو کیا حکم ہوگا۔ آیا بیوی کو طلاق طلب کرنے اور نکاح کے فسخ کرا لینے کا حق ہوگا یا اس پیچیدہ صورت حال سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر کی جائے گی؟ پھر یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ نفقہ نہ ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں۔ نفقہ ادا کرنے پر قادر ہی نہ ہو، قادر ہو اور موجود بھی ہو لیکن ادا نہ کرے۔ شوہر موجود ہی نہ ہو بلکہ غائب ہو۔

اس مسئلے میں عام فقہا جن میں امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام محمدؒ بھی شامل ہیں۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے بیوی کو فسخ نکاح کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ البتہ طریق کار اور شرطوں میں ان کے درمیان کچھ اختلاف بھی ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہؒ محض اس کی وجہ سے فسخ نکاح کی اجازت نہیں دیتے۔ علامہ محمد اسماعیل صنعانی (1182-1059ھ) نے نقل کیا ہے کہ یہی رائے اصحاب ظواہر اور صحابہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ ابوہریرہؓ کی بھی ہے۔

دلائل احناف

احناف کے دلائل اس طرح ہیں: قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

لینفق ذوسعة ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما اتاه الله . لایکلف الله نفسا الاما اتاها

(ترجمہ) یعنی خوشحال کو چاہیے کہ اپنی خوشحالی کے مطابق خرچ کرے اور جو تنگ

دست ہو اس کو چاہیے کہ اللہ نے جو عطا کیا ہے اس کے مطابق خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے مطابق ذمہ داری سونپتا ہے جو اس کو دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وسعت و کشائش کے مطابق ہی مرد پر اللہ کی دی ہوئی روزی میں سے نفقہ واجب ہے اور اسی کا وہ مکلف ہے اس طرح اگر کوئی مفلس اور بالکل ہی تنگ دست ہے تو اس پر نفقہ ہی واجب نہیں ہے۔ اس لئے اس صورت میں اس کا نفقہ نہ ادا کرنا کوئی جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

2۔ حدیث سے ثابت ہے کہ ایک دفعہ ازواج مطہراتؓ نفقہ کا مطالبہ کر رہی تھیں اسی دوران حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ تشریف لائے۔ دوران گفتگو حضرات کو ان کا مطالبہ معلوم ہوا تو حضرت ابو بکرؓ حضرت عائشہؓ کی اور حضرت عمرؓ حضرت حفصہؓ کی سرزنش کرنے لگے کہ تم لوگ حضور ﷺ سے وہ مانگتی ہو جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے ان حضرات کو اس سے منع فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ شوہر اگر نفقہ کی ادائیگی سے عاجز ہو تو اس پر نفقہ واجب ہی نہیں رہتا ورنہ حضور ﷺ ضرور منع فرماتے کہ یہ ان کا حق ہے۔ ان کو مانگنے دو'

3۔ آنحضور ﷺ کے زمانے میں کس قدر افلاس تھا وہ واضح ہے۔ صحابہؓ کے یہاں عام طور پر فاقوں کی نوبت آتی تھی مگر ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ آپ ﷺ نے نفقہ سے عاجز ہونے کی وجہ سے نکاح کسی کا بھی فسخ کیا ہو۔

2۔ دلائل جمہور:

جمہور کے دلائل یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان

(ترجمہ (طلاق صرف دو مرتبہ ہے۔ (یعنی جب دو دفعہ طلاق دے دی جائے) تو پھر عورتوں کو یا تو بطریق شائستہ نکاح میں رہنے دینا چاہیے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

ولا تضاروھن لتضیقوا علیھن (ترجمہ) اور ان کو تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ دو۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کو کسی قسم کا ضرر پہنچانا جائز نہیں۔ جس میں نفقہ سے محروم رکھنا بھی داخل ہے اور ایسی صورت میں یا تو امساک بالمعروف کرنا چاہیے کہ اس کے حقوق ادا کرتے ہوئے اس کو رکھا جائے یا تسریح بالاحسان یعنی گلو خلاصی کر دی جائے۔ لہٰذا جب وہ ''امساک'' پر قادر نہیں ہے تو ''تسریح بالاحسان اس پر واجب ہے اور وہ اس پر آمادہ نہیں ہے تو قاضی اس کی طرف سے طلاق دے دے گا۔

2۔ دار قطنی اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے حضور ﷺ کا (اس شخص کے حق میں جو بیوی کا نفقہ ادا نہ کر سکے) فرمان نقل کیا ہے کہ:

''**یفرق بینھما**'' دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔

3۔ سعید بن منصورؒ نے سعید بن مسیب سے نقل کیا ہے کہ ان سے ایسے اشخاص کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا۔ **یفرق بینھما** پھر جب ابوالزناد نے سعیدؒ سے دریافت کیا کہ کیا یہ سنت ہے؟ تو فرمایا ہاں سنت ہے۔ یہ روایت گو کہ مرسل ہے مگر سعید بن مسیب کی مرسل روایات تقریباً تمام ہی محدثین وفقہاء کے ہاں قابل استدلال ہیں۔

حافظ ابن حزم نے اس کی یہ توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنت سے حضرت عمرؓ کی سنت مراد ہے مگر یہ عرف واستعمال کے بالکل خلاف ہے ''سنت'' کا مطلق لفظ صاف بتلاتا ہے کہ حضرت سفیانؒ نے اس کو آپ ﷺ کی اور آپ کے عہد کی سنت قرار دیا ہے۔

4۔ حضرت عمرؓ کا عمل عبداللہ ابن عمرؓ سے امام شافعیؒ اور بیہقی نے اس طرح نقل کیا ہے:

کتب عمر الی امراء الاجناد ادعو افلانا ناسا انقطعوا عن المدینۃ ورحلوا عنھا اما ان یرجعوا الی نسائم واما ان یبعثوا بنفقتھن الیھن واما یطلقوا ویبعثوا بنفقۃ ما مضی وبذالک

یکون للمراۃ حق فی محاسبۃ الزوج بالنفقۃ الماضیۃ فان امتنع الزوج عن الانفاق فالزوجۃ بالخیار ان شاءت بقیت علی نکاحھا و ان شاءت طلب التفریق

(ترجمہ) حضرت عمرؓ نے امرائے لشکر کو لکھا کہ فلاں فلاں شخص کو کہو (جو مدینہ سے چلے گئے تھے اور وہاں سے کوچ کر چکے تھے) کہ یا تو اپنی بیویوں کے پاس واپس آئیں یا ان کا نفقہ بھیجیں اور یا طلاق دے دیں اور گزرے ہوئے دنوں کے نفقہ کا حساب بھی کر لیں۔ لہٰذا اگر شوہر نفقہ کے ادا کرنے سے رک جائے تو بیوی کو اختیار ہوگا اگر چاہے تو اس نکاح کو باقی رکھے یا علیحدگی کا مطالبہ کر دے۔

5۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

لا ضرور لا ضرار (نہ نقصان اٹھاؤ نہ پہنچاؤ)

یہ فقہ کا عام اور بنیادی قاعدہ ہے اس کا بھی تقاضا ہے کہ دفع ضرر کے لئے قاضی مرد کو طلاق پر مجبور کرے یا اس کی طرف سے طلاق دے دے۔

6۔ اگر کوئی شخص غلام کا نفقہ ادا نہ کر سکے تو احناف بھی کہتے ہیں کہ اس پر واجب ہے کہ اسے فروخت کر کے اپنی ملکیت سے نکال دے۔ تو بیوی کے حق میں تو بدرجہ اولی یہ بات واجب ہوگی کہ اس کو طلاق دے کر آزاد کر دیا جائے۔

7۔ نامردی کی وجہ سے احناف کے یہاں بھی بیوی فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے حالانکہ اس کی ضرورت وقتی بھی ہے اور بھوک کے مقابلے میں قابل برداشت بھی۔ اس کا تقاضا ہے کہ نفقہ سے محرومی کی صورت میں بدرجہ اولیٰ فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق ہے۔

احناف کے دلائل پر ایک نظر:

احناف نے جو دلائل پیش کیے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان کے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ قرآن کی جس آیت (انطلاق سے) کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ مرد اگر نفقہ پر قادر نہ ہو تو بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ واجب نہ ہوگا۔ لیکن عورت کو طلاق کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا یا نہ ہوگا؟ یہ بالکل علیحدہ

مسئلہ ہے اور قرآن نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

حدیث سے بھی صرف اس قدر ثابت ہے کہ ازواج نے نفقہ کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ عدم قدرت کی وجہ سے ناواجبی تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے شیخین کی صاحبزادیوں کو ڈانٹنے پر خاموشی اختیار فرمائی خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو تنبیہ کر رہے تھے اور باپ کو اس کا حق حاصل ہے۔ ہاں اگر ازواج مطہراتؓ علیحدگی کا مطالبہ کریں اور پھر بھی آپ سکوت اختیار فرماتے تو یہ استدلال بجا ہوتا۔

اسی طرح یہ کہنا کہ نفقہ میں تنگی کی وجہ سے کسی صحابی کا نکاح فسخ نہیں کیا گیا بھی اس وقت دلیل بن سکتا ہے جب یہ بات ثابت ہوتی کہ بعض صحابیوں کی بیویوں نے طلاق کا مطالبہ کیا ہو اور آپ ﷺ نے مسترد کر دیا ہو۔ جب بیویوں نے مطالبہ ہی نہیں کیا اور اس کا ثبوت نہیں ہے تو اس کی وجہ سے فسخ نکاح کا ثبوت کیونکر مل سکتا ہے؟

موجودہ حالات کا تقاضا:

لیکن دلائل سے قطع نظر فقہاء احناف رحمۃ اللہ نے ایسی عورتوں کے لیے جو متبادل حل پیش کیا ہے موجودہ حالات میں وہ قریب قریب ناقابل عمل ہے۔ جہاں اسلامی حکومت ہو' عدل وانصاف کا کم مدتی اور آسان نظام موجود ہو' اسلامی بیت المال ہو' جس کا ایک مقصد مستقل مقروضوں کی اعانت اور ان کے قرضوں کی ادائیگی میں مدد اور محتاجوں کے لیے سرکاری خزانہ سے کفالت کی گنجائش ہو' پھر اسلامی حکومت یا شریعت کے نفاذ کی وجہ سے اخلاقی برائیاں اور اس کے محرکات کم سے کم ہوں تو وہاں اگر عورت کو شوہر کے نام پر قرض لینے کو کہا جائے تو یہ بات قابل عمل بھی ہے اور قابل فہم بھی۔

لیکن جہاں نہ اسلامی حکومت ہے اور نہ اسلامی بیت المال ہے پیسوں اور روپیوں میں انسانی عفت وعصمت کا برسر عام سودا ہوتا ہو۔ سود کی لعنت سے قرض حسنہ کی بجائے پیسوں سے پیسے حاصل کرنے کی ہوس پیدا کر رکھی ہے۔ مقروض کے لیے تعاون کی کوئی خاص صورت نہ ہو۔ اور بے سہاروں کی کفالت کا کوئی نظام نہ ہو اور عدالت سے

انصاف حاصل کرنے کے لیے نہ صرف زر کثیر بلکہ صبر ایوب بھی مطلوب ہو۔ وہاں بھی اگر عورتوں کا نکاح ان کے مطالبہ کے باوجود شوہر سے فسخ نہ کیا جائے تو یہ اس کی جان کے لیے بھی مہلک ہے۔ اور اس کی عفت وعصمت کے لیے بھی خطرہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ خصوصاً ہندوستان جیسے ممالک میں اس مسئلہ میں جمہور فقہاء کے مسلک پر عمل کیا جائے۔ اور سیدنا عمرؓ کی نظیر کو پیش نظر رکھا جائے۔

مالکیہ کا مسلک:

البتہ دیکھنا چاہیے کہ اس سلسلہ میں طریق کار کیا اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے مسلک کی تفصیلات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

امام مالکؒ کے مسلک کی تفصیل اس طرح ہے:

شوہر گزرے ہوئے ایام کا نفقہ دینے پر قادر نہ ہو مگر حالیہ دنوں کا نفقہ دیتا رہے تو بیوی کو حق نہیں کہ وہ فسخ نکاح کا مطالبہ کرے۔

ولها الفسخ ان عجز عن نفقة حاضرة لا ماضية

(ترجمہ) اگر نکاح کے وقت عورت شوہر کی تنگدستی، فقر ومحتاجی اور نفقہ ادا کرنے کی عدم استطاعت سے واقف ہو یا اس کو واقف کرا دیا گیا ہو۔ پھر بھی اس مرد سے نکاح کرلے تو اب بھی اس کو حق نہیں کہ شوہر کی تنگدستی کی بنا پر نفقہ کا مطالبہ کرے۔

لعلم تعلم حال العقد فقره.

مطلب یہ ہے کہ عورت کا معیار زندگی کچھ بھی ہو لیکن مرد معمولی قسم کی غذا اور کپڑا بھی مہیا کر سکے تو عورت فسخ نکاح کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔

ان قدر على القوة ولو من خشن الماكول وهي علية الدر او خبز بغير ادم وعلى ما بواردى العورة ولو من غليظ الصوف (وان) كانت (غنية 9 شانها لبس الحرير.

یوں قاضی کے پاس جب شوہر کا نفقہ ادا کرنے سے عاجز ہو جانا ثابت ہو جائے اور شوہر موجود ہو تو قاضی اپنی صوابدید سے اس کو کسب معاش اور ادائیگی نفقہ کے لیے

ایک مہلت دے۔ اگر اب بھی وہ نفقہ ادا نہ کر سکے تو قاضی اسے حکم دے کہ یا تو نفقہ ادا کرو۔ یا پھر فی الفور اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ اگر شوہر طلاق دینے سے گریز کرے تو خود قاضی اس کی طرف سے طلاق دے دے:

فان البت عسره تلوم له باالا جتهادو الا امر بهااو باالطلاق بلا تلوم فان طلق او انفق و الا طلق عليه بقول الحاكم فسحت نكاحه.

اگر شوہر موجود نہ ہو نہ عورت کے لیے نفقہ چھوڑ کر گیا ہو نہ خود عورت نے نفقہ معاف کیا ہو اور نہ شوہر کی طرف سے نفقہ کی ادائیگی کا وکیل ہو تو اگر اتنا دور ہے کہ آتے آتے دس دن لگ جائیں گے تو قاضی نکاح فسخ کر دے گا اور اگر شوہر قریب ہی ہو تو اسے طلب کرے گا۔ خود آؤ یا نفقہ بھیجو یا پھر طلاق دے دو۔ اور اگر شوہر اس کی حکم عدولی کرے تو عام اصول کے مطابق خود قاضی کو اختیار حاصل ہو جائے گا کہ وہ طلاق دے دے:

اگر شوہر صرف اس قدر نفقہ ادا کرنے پر قادر ہو کہ بیوی جی لے اور موت و ہلاکت سے اپنے کو بچا لے مگر آسودہ و مطمئن نہ ہو سکے تو اس نفقہ کا بھی اعتبار نہیں اور قاضی اس کا نکاح فسخ کر دے گا:

(كان وجد ماسيد الرمق) اى مايحفظ الحياة خاصة دون شبع معتاد وستوسط فانه طلق عليه اذلا صبر لها عادة على ذالك.

البتہ اگر مدت کے دوران ہی شوہر بیوی کا مروج طریقہ پر نفقہ ادا کرنے پر قادر ہو گیا تو اسے بیوی کو لوٹا لینے کی گنجائش ہوگی۔ مدت گزر جانے کے بعد یہ حق باقی نہیں رہے گا:

(وله) لزوج الذى طلق عليه لعسرة (رجعتها)ان وجد فى العدة بساراً يقوم بواجب مثلها عادة.

اگر شوہر نے نفقہ ادا کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ وہ اس سے عاجز تھا لیکن قاضی کے سامنے وہ اپنی مجبوری ثابت نہ کر سکا تو قاضی فی الفور اس کی طرف سے طلاق دے

دے گا:

یدعی العجز عن النفقة ولم یثبت عجزہ فی ھذہ الحالة یطلق علیه القاضی حالا علی المعتمد.

اور اگر وہ قدرت کے باوجود نفقہ ادا نہ کرے اور خود اس کا معترف ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ اس کو قید کر دیا جائے یہاں تک کہ نفقہ ادا کرنے لگے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس سے طلاق دلوائی جائے تاہم اگر وہ ان سے کسی کو قبول نہ کرے تو پھر قاضی نکاح کر دے گا:

(فاذا الم یجب علیه بشئی طلق القاضی علیه فوراً

شوافع کا مسلک:

امام شافعیؒ کے ہاں احکام اس طرح ہیں:

شوہر آخری درجہ کا نفقہ۔ لباس اور رہائش گاہ بھی فراہم نہیں کرسکتا ہو۔

ان یعجز عن اقل نفقة

موجودہ دنوں اور آنے والے دنوں کا نفقہ بھی ادا نہ کر سکے۔ گزشتہ دنوں کا بقایا ادا نہ کر سکے تو اس کی وجہ سے نکاح کا فسخ نہ ہو گا۔

ان یکون عاجزاً عن النفقة الحاضرة والمستقبلة اماالعجز عن النفقة المتجمدة فلا فسخ به.

بیوی کا نفقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو۔ اس کے خادم کا نفقہ ادا نہ کر سکے تو موجب فسخ نہیں۔

ان یکون عاجزاً عن نفقة الزوجه.

ان شرطوں کے ساتھ شوہر کی عسرت کی بنا پر قاضی عورت کا نکاح فسخ کر دے گا۔

اگر شوہر خوشحال ہو لیکن قصداً نفقہ ادا نہ کرے تو نکاح فسخ نہ کیا جائے گا۔ بلکہ عدالت جبراً اس سے نفقہ وصول کرے گی۔

اگر شوہر غائب ہو تو اس کے خوشحال اور تنگ دست ہونے کا اعتبار ہو گا۔ اگر تنگ دست ہے تو قاضی نکاح فسخ کر دے گا۔ اور خوشحال ہو اور اس کی جائیداد موجود ہو تو چاہیے

اس کا پتہ نہ چلتا ہو پھر بھی نکاح فسخ نہیں ہوگا' بلکہ اس کے مال میں سے نفقہ ادا کیا جائے گا۔

وذا كان الزوج غائبا ولم يثبت العسارة بينة يكون كالحاضر الممتنع فليس لها طلب فسخ نكاحه سواء انقطع خبره اولم ينقطع على المعتمد.

البتہ عورت کی نکاح سے قبل شوہر کے حالات سے واقفیت اور ناواقفیت کا اعتبار نہیں۔اگر وہ واقف ہو پھر بھی نکاح کے بعد نفقہ سے محرومی کی وجہ سے اسے طلاق کا مطالبہ کرنے کا حق ہوگا۔اس لیے کہ ممکن ہے کہ اس نے اس توقع پر نکاح کیا ہو کہ آئندہ وہ کسب معاش کرنے لگے گا۔

ولا بشرط عدم علمها بفقره عندالعقد فاذا علمت ورضيت به ثم عجز عن الانفاق كان لها الفسخ'

اور خود امام شافعیؒ کے الفاظ میں ولو علمت عسره لانه يمكن ان يوسر۔

شوافع مسلک کی ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر قاضی عورت کے حلقے میں نہ رہتا ہو تو وہ شوہر کو نفقہ حاصل کرنے کے لیے تین دنوں کی مہلت دے کر خود بھی اپنے آپ کو طلاق واقع کر سکتی ہے۔

فاذالم يكن في جهتها قاضي ولا محكم امهلته ثلثه ايام وفسخت العقد في صبحة الرابع بنفسها.

حنابلہ کا مسلک:

امام احمدؒ کے ہاں اکثر مسائل شوافع کے مطابق ہیں۔عورت کے نکاح سے پہلے شوہر کی عسرت سے واقفیت بلکہ اس پر راضی ہونے کے باوجود عورت طلاق کا مطالبہ کرنے کی مجاز ہے۔شوہر کو نفقہ فراہم کرنے کی مہلت ان کے ہاں بھی تین دن ہے۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جو شوہر صانع یا تاجر وغیرہ ہو اور وقتی تنگی یا بیماری میں مبتلا ہو اس کے لیے کچھ زیادہ دنوں کی مہلت دی جائے گی۔البتہ عورت کا نکاح فسخ کرنے کا مجاز صرف قاضی ہی ہوگا۔

وان عسر الزوج بنفقتها او ببعضها من نفقة العسر لا بمازاد منها او عسر بالكسرة او ببعضها او بالكسنى او المهر بشرط خيرات على التراخي بين الفسخ من غير انتظار وبين المقام وتمكينه ......ولو كانت موسرة فان اختارت المقام اور رضيت بعسرته اوتزوجته عالمة به اوبشرط ان لاينفقن عليها او اسقطت النفقة المسقلة ثم بدالها الفسخ فلهاذالك.

مہلت کی مدت:

شوہر کو نفقہ ادا کرنے پر قدرت کے لیے کس قدر مہلت دی جائی گی اس سلسلہ میں علامہ صنعانی نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ کے ہاں ایک ماہ۔ امام شافعیؒ کے ہاں تین دن، حمادؒ کے ہاں ایک سال بعض حضرات کے یہاں ایک ماہ اور دو ماہ کی مدت ہے۔ نیز اوپر امام احمدؒ کے ہاں بھی تین دنوں کی مہلت کا ذکر ہو چکا لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ قاضی کی صوابدید پر منحصر ہونا چاہیے۔ جیسا کہ علامہ ابولبرکات الدردیر نے الشرح الصغیر میں اور حادی نے اس کے حاشیہ میں لکھا ہے اور اوپر اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

صنعانی جو خود شافعی ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں۔

قلت لادليل على التعين بل مايحصل به التضرر.

(ترجمہ) میں کہتا ہوں کہ متعین کرنے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ وہ تمام عیوب اسی میں شامل ہیں جن سے ضرر پیدا ہو۔

کلمہ آخر:

مختلف مذاہب کی تفصیلات موجودہ حالات و مال اور شریعت اسلامی کی روح کو سامنے رکھنے سے اس طرف ذہن جاتا ہے کہ فقہ مالکی پر اس مسئلہ میں ہندوستان میں عمل کیا جائے۔ البتہ اس مسئلہ میں عورت پہلے سے شوہر کی تنگ دستی سے واقف ہو اس رائے کو اختیار کیا جائے جو شافعی اور حنابلہ کی ہے۔ اور اس کی وجہ سے نکاح فسخ ہوا کرے۔ اس

لیے کہ نفقہ عورت کا مستقل حق ہے جو یومیہ واجب ہوتا ہے۔ اگر ایک بار وہ اس سے اپنی بے وقوفی یا مستقبل کی توقع پر دستبردار بھی ہو جائے تو اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ آئندہ بھی اس اقدام حیات سے محروم ہی رہ کر زندگی بسر کرتی رہے۔

نابالغ بچوں کی شادی روکنے کا ایکٹ

جناب ڈاکٹر محمود الحسن عارف

پاکستان میں مروجہ قوانین میں سے جو قوانین خصوصی طور پر توجہ اور اصلاح طلب ہیں' ان میں ایک نابالغ بچوں کی شادی روکنے کا ایکٹ (مسلم عائلی قوانین دفعہ 12 مجریہ 1991ء بھی شامل ہے جس کی رو سے نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیوں کی ممانعت کی گئی ہے اور شادی کے لیے مرد کی عمر کم از کم اٹھارہ سال اور لڑکی کی سولہ سال مقرر کی گئی ہے خلاف ورزی کی صورت میں ان کے سرپرستوں کے لیے قید اور جرمانے کی سزا تجویز کی گئی ہے۔

یہ قانون صریحاً قرآن وسنہ اور اجماع امت کے منافی ہے جس کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ''شریعت اسلامیہ'' میں ''جواز'' سے مراد وجوب نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ شریعت کی طرف سے اس اجازت سے یہ ضروری اور لازمی نہیں ہے کہ والدین لازماً اپنے بچوں کی کم عمری میں شادیاں کردیں' ہاں البتہ بعض خصوصی اور استثنائی حالات میں شریعت کی طرف سے عطا کردہ اس اجازت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم ان شرعی نصوص پر روشنی ڈالنا مناسب سمجھتے ہیں' جن کی روشنی میں چھوٹی عمر میں والدین کو اپنے بچوں اور بچیوں کی شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مختصراً ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1۔ نکاح وطلاق کے احکام:

قرآن حکیم میں نکاح وطلاق کے احکام کسی جگہ صراحت اور تفصیل کے ساتھ اور کسی جگہ ایجاز واجمال کے ساتھ بیان کیئے گئے ہیں مثلاً سورۃ البقرہ' سورہ النساء اور سورۃ

الاحزاب اور سورۃ الطلاق میں ان میں سے کسی جگہ بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ نکاح وطلاق کے لیے زوجین کا بالغ ہونا شرط ہے اور اگر ایسا کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری یا بہتر ہوتا تو اس کے متعلق قرآن کریم میں ضرور صراحت کی جاتی۔

2۔اسی طرح قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالّٰئِیْ یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتهن ثلثة اشهر و الّٰئِیْ لم یحضن .

اور وہ عورتیں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں ان کی عدت تین مہینے ہے اور اس طرح ان کی جنہیں ابھی حیض نہیں آیا۔

اس آیت میں ان لڑکیوں کی عدت بیان کی گئی ہے جن کو ابھی ایام آنے شروع نہیں ہوئے ظاہر عدت کا سوال تو تب ہی پیدا ہوتا ہے جبکہ پہلے نکاح اور طلاق ہو چکی ہو۔ اس سے معلوم ہوا قرآن حکیم کی نگاہ میں بلوغ سے قبل بھی نکاح جائز ہے اور وہ شریعت کی نگاہ میں معتبر بھی ہے۔اسی بنا پر قریب قریب تمام مفسرین نے اس آیۃ کریمہ سے یہی مفہوم اخذ کیا ہے۔چنانچہ امام ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری القرطبی (م 1273/671ء) اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن (مطبوعہ بیروت 1966/1386ء) میں فرماتے ہیں۔

قوله تعالىٰ وَالّٰئِیْ لم يحضن يعنى الصغيره فاذارات الدم فى زمن احتماله عند النساء انتقلت الى الدم لوجود الاصل ...... وهذا الجماع.

قرآن حکیم کے ارشاد وَالّٰئِیْ سے چھوٹی لڑکیاں مراد ہیں جب انہیں ایام آنے شروع ہو جائیں تو پھر ان کی عدت تین ماہ کے بجائے تین "ایام" ہوں گے اور اسی پر اجماع ہے۔اسی طرح ایک دوسرے مفسر قرآن حافظ ابن کثیر (م 774ھ 1372ء) اپنی تفسیر تفسیر ابن کثیر میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وللذا الصغار الا ئى لم يبلغن سن الحيض ان عدتهن ثلاثة اشهر.

اور اسی طرح ان چھوٹی لڑکیوں کی عدت کہ جو سن "ایام" تک نہیں پہنچیں تین ماہ ہے جبکہ

علامہ محمود الالوسی (م 1270ھ/1853ء) اپنی تفسیر روح المعانی میں رقمطراز ہیں:

والمراد باللّٰئِیْ لم یحضن الصغار الک فی لم یبلغن سن الحیض.

ارشاد باری تعالیٰ ہے: لم یحضن سے مراد وہ لڑکیاں ہیں جو ابھی سن ایام کو نہیں پہنچیں۔

چونکہ یہ آیت اس مسئلے میں نص صریح کی حیثیت رکھتی ہے اسی لیے تمام قدیم وجدید مفسرین مثلاً الطبری البیضاوی' البغوی وغیرہ نے بھی اس آیت کے تحت یہی حکم بیان کیا ہے کہ اس سے مراد وہ چھوٹی لڑکیاں ہیں جن کو ابھی ایام آنے شروع نہیں ہوئے اور یہ عدت کا سوال اس کے بعد پیدا ہوتا ہے جبکہ اس کے نکاح کا جواز ثابت ہو۔

عربی تفاسیر کی طرح اردو زبان کے بھی اکثر مفسرین نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی تفسیر ماجدی میں لکھتے ہیں:

"یہاں یہ بتا دیا کہ ان دونوں قسم کی بیویوں کی عدت طلاق کی عدت پورے تین مہینے ہے۔ ایک فقہی استنباط اس آیت سے یہ بھی ہوا کہ لڑکیوں کا نکاح قبل بلوغ یا کم سنی میں بھی جائز ہے۔

اسی طرح عہد حاضر کے نامور مفسر سید ابو الاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں:

"حیض خواہ کم سنی کی وجہ سے نہ آیا ہو یا اس وجہ سے کہ بعض عورتوں کو دیر میں آنا شروع ہوتا ہے...... اس جگہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق عدت کا سوال اس عورت کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خلوت کر چکا ہو' کیونکہ خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدت ہے ہی نہیں (الاحزاب 49) اس لیے ایسی لڑکیوں کی عدت بیان کرنا جنہیں حیض آنا شروع نہ ہو صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے' بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت بھی جائز ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو اسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا۔

3۔ احادیث میں نکاحِ صغیر کے واقعات:

قرآن حکیم کی اس صراحت کے ساتھ ساتھ احادیث سے بھی اس مسئلے کی پوری طرح تائید وتوثیق ہوتی ہے چند روایات حسب ذیل ہیں۔

1۔ تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا آپ سے نکاح سات سال کی عمر میں قبل از بلوغ ہوا اور رخصتی آٹھ یا نو سال کی عمر میں بعد از بلوغ عمل میں آئی۔ امام بخاری (م 256ھ 868ء) نے بخاری شریف میں ایک مستقل باب اسی عنوان پر قائم فرمایا ہے۔

باب انکاح الرجل ولده الصغار لقوله تعالىٰ وَالّٰئِیْ لم یحضن فجعل عدتها ثلثة اشهر قبل البلوغ.

باب کہ مرد اپنی چھوٹی اولاد کی شادی بحالت بچپن کر سکتا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے وَالّٰئِیْ لم یحضن سے ظاہر ہے جہاں قبل از بلوغ لڑکیوں کی عدت (بصورت طلاق) تین ماہ بیان کی گئی ہے۔

اور اس باب میں امام بخاری نے حضرت عائشہؓ سے درج ذیل روایت نقل کی ہے

ان النبی صلی الله علیه وسلم تزوجها وهی بنت ست سنین وادخلت علیه وهی بنت تسع.

کہ حضور سے ان کا نکاح 6 سال کی عمر میں ہوا اور رخصتی 9 سال کی عمر میں عمل میں آئی۔ اسی طرح امام مسلم النیشاپوریؒ (206۔261ھ/820۔874ء) مسلم مسلم شریف میں باب:

تزویج الاب البکر الصغیرة.

باپ اپنی چھوٹی کنواری اولاد کا نکاح کر سکتا ہے۔
اُم المومنین حضرت عائشہؓ کی روایت نقل فرماتے ہیں۔

تزوجنی رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم لِست سنین وبنی بی وانا بنت تسع سنین.

حضور سے میرا نکاح 6 سال کی عمر میں اور رخصتی 9 سال کی عمر میں عمل میں آئی۔
اسی مضمون کی روایتیں ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ اور سنن نسائی میں بھی ملتی ہیں۔

2۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے صاحبزادے حضرت سلمہ کا نکاح خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صغیر سنی میں سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی چھوٹی لڑکی سے کر دیا تھا الفاظ حدیث یہ ہیں:

فزوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم بنت حمزة وهما صبيان فلمه يجتمعا حتى ماتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمہ کا نکاح حضرت حمزہ کی بیٹی سے اس وقت کر دیا تھا جبکہ وہ دونوں ابھی بچے تھے پھر دونوں جمع نہیں ہو سکتے تا کہ ان کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔

3۔ حضرت قدامہ بن قطعون نے اپنا نکاح حضرت زبیر کی لڑکی سے اس کی پیدائش کے دن کر لیا تھا اور کہا تھا کہ اگر میں مر جاؤں تو یہ میری وارث ہوگی۔

4۔ حضرت عمر نے اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح عروہ بن زبیر سے کیا۔

5۔ حضرت عروہ بن زبیر نے اپنی بھتیجی کا نکاح اپنے بھانجے سے کیا جبکہ وہ دونوں نابالغ تھے۔

6۔ ایک عورت نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے نکاح کیا اور اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح (جو پہلے شوہر سے تھی مسیب بن نخبہ سے کر دیا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کو جائز قرار دیا۔

7۔ امام ابوبکر الجصاص رازی (م 370ھ/980) اپنی کتاب احکام القرآن میں حضرت علیؓ ' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت زید بن ثابتؓ ' حضرت ام سلمہؓ ' حضرت حسنؓ حضرت طاؤس' حضرت عطاؒ اور دوسرے حضرات کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ کم عمر بچوں کا نکاح جائز ہے۔

اسی بنا پر آج تک اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ کمسنی کی شادی جائز ہے' چنانچہ علامہ ابوبکر جصاص رازی ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

وفی ھذہ الایة دلالة ایضاً علی ان لاب تزویج ابنتلہ الصغیرة من حیث دلت علی جواز تزویج سائر الا ولیآء از کان ھو اقرب الاولیاء ولانعلم فی جواز ذالک خلافاً بین السلف والخلف من فقھاء الامصار.

اور اس مذکورہ آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ باپ اپنی نابالغ اولاد کا عقد کرسکتا ہے کیونکہ اس میں تمام اولیاء کو تزویج کا حق دیا گیا ہے اور باپ سب قریب ولی ہے۔اور اس مسئلے میں کسی جانب سے بھی کوئی اختلاف مروی نہیں۔علماء سلف وخلف کا اس پر اجماع ہے۔

گویا اس مسئلے پر بیشک قومی اجماع تو نہیں ہے مگر سکوتی (خاموش) اجماع امت موجود ہے' اسے لیے کہ کسی بھی مجتہد اور امام نے اس کی مخالفت نہیں کی پھر جب کوئی مسئلہ قرآن وحدیث میں بالصراحت مذکور ہو اس پر انکار جرأت کون کرسکتا ہے۔

اسی بنا پر امت کے تمام علماء اور فقہاء نے اس کی اجازت واباحت کا قول کیا ہے علامہ المرغینانی صاحب ہدایہ اپنی کتاب ہدایہ اولین میں لکھتے ہیں۔

ویجور نکاح الصغیرة الصغیر واز زوجھا الولی بکراً کانت الصغیرة او ثیبا.

اور چھوٹے لڑکے یا لڑکی کیا نکاح خواہ وہ کنوارے کا ہو یا رنڈوے کا جائز ہے۔ بشرطیکہ ولی اس کا انعقاد کرے۔

فقہ حنفی کے ایک مستند فقیہ امام السرخسیؒ نے بھی اپنی کتاب شرح المبسوط میں ایک مستقل باب بعنوان "نکاح الصغیر والصغیرة" باندھا ہے اور اس کے تحت اس کے جواز پر بحث کرتے ہوئے اسے جائز اور صحیح قرار دیا ہے۔

فقہ حنفی کی ایک اور معتبر کتاب الدرالمختار شرح تنویر الابصار میں لکھا ہے:

وللولی انکاح الصغیر والصغیرة ولو ثیبا.

ولی اپنی نابالغ اولاد کا خواہ وہ ثیب ہی ہو نکاح کرسکتا ہے۔

بعینہ یہی بیان علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق شرح کنز الدقائق میں نقل کیا ہے "

لکھتے ہیں:

وکل ھؤلاء (اولیا لھم ولایة الاجبار علی البنت والذکر فی حال صغرھما وحال کبرھما ازا جنا.

اور یہ اولیاء یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنی نابالغ یا غیر عاقل (مجنون) اولاد کا ان کے بچپن یا ان کی حالت جنون میں نکاح جبراً کر سکتے ہیں۔

فقہ حنفی کی معتبر اور مستند کتاب فتاویٰ عالمگیریہ میں ان اولیاء کی فہرست دی گئی ہے جن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی نابالغ اولاد کا نکاح کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں فقہاء اور مختلف فتاویٰ کی عبارتیں بالتفصیل نقل کی گئی ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس نامور فقیہ علامہ عبدالرحمٰن الجزیری صاحب الفقہ علی المذاہب الاربعہ نے اس پر تمام فقہاء کا اتفاق نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

'نابالغ لڑکے یا لڑکی کا جبراً نکاح کر دینے کے لیے صرف ولی مجبر (باپ' دادا) ہی خاص ہے۔ نیز مرد یا عورت اگر پاگل ہیں تو ان کا نکاح بھی ان کی رضا کے بغیر ہی) کر سکتا ہے۔

4۔ دیگر فقہی مسالک کا مسلک:

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اس مسئلے پر قریب قریب تمام فقہی مسالک کا اتفاق واجماع ہے کہ نابالغ بچوں کا نکاح کم عمری میں درست ہے البتہ اولیاء کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام احمد بن حنبل فقط باپ کو اور امام شافعیؒ باپ اور دادا کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنی نابالغ اولاد کا ان کی رضا کے بغیر بھی عقد کر سکتے ہیں۔

چنانچہ معجم الفقہ الحنبلی میں فقہ حنبلی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

ویجوذ للاب ان یزوج ابنته البکر الصغیرة من کفومع کراھتھا وامتناعھا ولیس لغیر الاب اجبار کبیرة ولا صغیرہ ولو کان جدا.

اور باپ اپنی نابالغ کنواری اولاد کی اپنے کفو میں شادی کر سکتا ہے باوجود لڑکی کی کراہت

ناپسندیدگی کے لیکن باپ کے علاوہ کسی اور کو خواہ وہ دادا ہی ہو فسخ کا حق نہیں پہنچتا۔

نامور مصری فقیہ الجزیری نے بھی فقہ حنبلی فقہ مالکی اور فقہ شافعی کی تفصیلات فراہم کی ہیں اور بیان کیا ہے کہ ان سب سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے حسب ذیل نکات ثابت ہوتے ہیں۔

1۔ نکاح صغیر و صغیرہ (نابالغاں) کا جواز قرآن حکیم سے ثابت ہے۔

2۔ اس پر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر صحابہ کرامؓ کا تعامل موجود ہے' جس سے اس کا جواز ناقابل انکار طور پر ثابت ہوتا ہے۔

3۔ تابعین چاروں فقہی مسالک اور تمام محدثین کا اس پر اتفاق و اجماع ہے۔

4۔ اس پر تاریخ کے ہر دور میں عمل ہوتا رہا ہے۔

5۔ جو مسئلہ قرآن حدیث اور اجماع و تعامل امت سے ثابت ہو اسے ممنوع قرار دینے کا کسی بھی حکومت کو حق حاصل نہیں۔ اس بنا پر جسٹس تنزیل الرحمان (سابق چیئرمین نظریاتی کونسل چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت آف پاکستان) نے بجا طور پر مجموعہ قوانین اسلام پر لکھا ہے۔

"پاکستان نافذ الوقت قانون کے تحت نابالغوں کی شادی کرنا ممنوع اور قابل سزا جرم ہے۔ نابالغوں کی شادی کا مطلقاً ممنوع قرار دینا مصالح شرعیہ کے خلاف ہے۔ اس ضمن میں ضروری ہے کہ نافذ الوقت قانون میں مناسب ترمیم کی جائے اور نابالغوں کی شادیوں کی اجازت دی جائے...... مختلف اسلامی ممالک کے رائج الوقت قوانین میں بھی اس قسم کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ مصر میں نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح اس کا ولی کر سکتا ہے۔"

6۔ قرآن اور حدیث اور اجماع سے ثابت شدہ کسی حکم کی تنسیخ یا ترمیم کرنا براہ راست دین میں مداخلت ہے' جو کسی اسلامی مملکت میں رائج الوقت قانون کے شایان شان نہیں ہو سکتی۔

7۔ کمسنی کی مذکورہ شادیوں کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ ہی اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ اس مسئلے کو عوام الناس کی صوابدید اور ان کے طبعی و خاندانی حالات پر چھوڑ

دیا گیا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں لیکن آرڈیننس کے الفاظ نے لوگوں کو پابند کر دیا ہے کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے جو صریحاً اسلامی احکام کے متصادم ہے۔

5۔اس اسلامی حکم کی حکمتیں:

سطور بالا میں جسٹس تنزیل الرحمان صاحب کے حوالے سے مذکورہ عبارت میں مصالح شرعیہ کا ذکر آیا تھا' چنانچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر اسلام میں جو کمسنی کی شادیوں کو جائز قرار دیا گیا ہے اس کی اپنی حکمت و مصلحت ہے۔اس پر بحث کرتے ہوئے ملک کے ایک مقتدر عالم دین مولانا محمد تقی عثمانی (سابق جج وفاقی شرعی عدالت آف پاکستان) نے حسب ذیل مصالح بیان کی ہیں:

1۔ ایک شخص ہے جو دیکھ رہا ہے کہ اس کا لڑکا یا لڑکی اخلاقی اعتبار سے بری طرح بگڑتے جا رہے ہیں اور اگر جلدی ان کی شادی نہ کر دی گئی تو ان کو سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا۔اس وقت اس کے سامنے ایک مناسب رشتہ بھی موجود ہے' ان حالات میں اس کی مصلحتوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جلد از جلد اپنی اولاد کی شادی کر دے۔لیکن وہ قانون کی وجہ سے مجبور ہے کہ جب تک لڑکا اٹھارا سال کا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ اس کی شادی نہیں کر سکتا۔

2۔ ایک شخص کسی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہے اور اسے زیادہ عرصے جینے کی امید نہیں۔اس کی ایک پندرہ سالہ لڑکی ہے۔اس کا یا تو کوئی وارث نہیں۔یا ہے تو اس سے کسی بہتر سلوک کی توقع نہیں ان حالات میں وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی لڑکی کا ہاتھ کسی شریف آدمی کے ہاتھ میں دے کر سکون کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو لیکن وہ آپ کے قانون کی بنا پر مجبور ہے کہ اس لڑکی کو دنیا میں لاوارث اور بیکس چھوڑ کر جائے اور وہ لڑکی اپنے باپ کے مرنے کے بعد دردر کی ٹھوکریں کھاتی پھرے اور خود غرض لوگوں کی حرص و ہوس کا شکار ہو۔

3۔ ایک بیوہ عورت ہے جس کا کوئی والی وارث نہیں اس کی ایک بالغ یا نابالغ لڑکی ہے۔اب اس کے لیے خود اپنا پیٹ پالنا اور اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کرنا ہی ایک مستقل مسئلہ ہے چہ جائیکہ وہ اپنے ساتھ ایک اور لڑکی کا بار برداشت کرے۔اس کے لیے

اس لڑکی کو اپنے پاس رکھنا معاشی مشکلات کا بھی موجب ہے اور اسے یہ خطرہ بھی ہے کہ اس نے اس کی شادی جلد ہی نہ کر دی تو ممکن ہے وہ کسی غنڈے کے ہتھے چڑھ جائے اب آپ ہی بتائیے کہ اس کے پاس اس کے سوا اور کون سا راستہ ہے کہ وہ اپنی لڑکی کا کسی بھلے مانس سے نکاح کر کے اس کے سپرد کر دے۔ لیکن وہ ایسا اس لیے نہیں کر سکتی کہ آپ کے قانون میں ابھی وہ نکاح کے قابل نہیں۔

4۔ ایک دیہاتی کاشتکار ہے اس کی ایک جوان لڑکی ہے وہ رات دن دیکھتا ہے کہ اس کا مالک اور اس کے کارندے اپنی شرارت طبع کی وجہ سے لڑکیوں کو اپنی حرص و ہوس کا شکار بناتے ہیں اسے خطرہ ہے کہ اگر میں زیادہ دنوں تک اس لڑکی کو اپنے پاس رکھوں گا تو اس کی حفاظت نہ کر سکوں گا۔ اس لیے وہ مجبور ہے کہ اس کی شادی جلد ہی کہیں کرا دیں۔ لیکن دوسری طرف جب وہ آپ کے قانون کو دیکھتا ہے تو ہاتھ مل کے رہ جاتا ہے اور بے بسی کے بہانے کے سوا وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

دیہات میں کمسنی کی شادیوں کا سب سے بڑا سبب یہی تھا اور کاشتکار لوگ اسی طریقہ سے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرتے تھے۔ ورنہ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ مزارعین کی ناموس ہمیشہ زمینداروں کی انسان دشمنی سے خطرے میں رہتی ہے۔ اب اس قانون کے بعد وہ اپنے آپ کو قطعی بے بس پائیں گے۔

5۔ ان مشکلات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا ہماری قوم کے اخلاقی زوال کی رفتار تیز سے تیز ہوتی جائے گی اور کمسنی کے جرائم میں ایسا اضافہ ہوگا جو ملک اقوام کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوگا۔ زنا اور اغوا کے واقعات بڑھ جائیں گے اور ہر شخص یہ دیکھ لے کہ نکاح پر پابندی لگانے سے زنا کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ اس کے متوقع نتائج بڑے عبرت ناک ہوں گے۔

اسی طرح جسٹس تنزیل الرحمان نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے۔

''نکاح کی جملہ مصلحتوں میں سے ایک مصلحت مرد وعورت میں موافقت ہے اور یہ مقصد کوئی شئی اس قدر پورا نہیں کرتی جتنا (ہم سر خاندان سے نکاح' اور کفو ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا اگر ولی بالغ ہونے کا انتظار کرے تو کفو کے ہاتھ سے نکل جانے کا

> اندیشہ ہے کہ وقت پر اس جیسا نہ ملے اس لیے نکاح کی حاجت نابالغیت میں بھی پیدا ہو سکتی ہے اور جب حاجت پیدا ہوتی ہے تو ولایت قائم ہو جاتی ہے۔ مگر قانون کا نفاذ دو عملی کا موجب بنا۔

مملکت خداداد پاکستان میں اس قانون نے ملک کے عوام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے' ایک طرف ان کے مذہب (اسلام) کی لازوال تعلیمات ہیں جن سے جواز نکاح نابالغان کا ثبوت ملتا ہے اور دوسری طرف رائج الوقت ملکی قانون ہے کہ جس کی بنا پر ایسی تمام شادیاں منسوخ اور کالعدم سمجھی جاتی اور ایسی شادیاں نہ تو رجسٹر ہوتی ہیں اور نہ ہی حکومت کے اداروں کو ان کی خبر ہوتی ہے' اس چیز نے ملک کے عوام میں دو عملی پیدا کر دی ہے چنانچہ درخواست گزار کے ذاتی مشاہدے میں ہے کہ دیہات کے عوام نے اس قانون کو اب تک قبول نہیں کیا اور یہ کہ اب بھی اس ملک کی آبادی کی اکثریت میں یہ طریقہ نکاح رائج ہے۔ اس لیے مطالبہ ہے کہ اس رائج الوقت قانون کو منسوخ کیا جائے۔

مفاسد اور اس کا انسداد:

اس کے جواز کے خلاف اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ بسا اوقات اس جواز سے کچھ لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس میں ان کی بد نیتی شامل ہوتی ہے۔ اس قسم کی صورت حال کے تدارک پر بحث کرتے ہوئے مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:

> اس دفعہ کا منشا ان خرابیوں کا انسداد ہے جو نکاح صغر سنی میں عام طور پر مرتب ہوتی ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سی برادریوں میں جو صغر سنی کی حالت میں نکاح کا رواج ہے' اس سے بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں بہت سی لڑکیوں کی پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہر برائی کو صرف قانون اور سزا کے ذریعے روکنے کا اصول صحیح نہیں اور تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برائی کو روکنے کے لیے کافی بھی نہیں۔

1۔ بہت سی برائیاں جو انسانی معاشرے میں پیدا ہوتی ہیں ان کا صحیح علاج بجز ذہنی اصلاح اور اخلاقی تربیت کے اور کچھ نہیں ہوتا' اس معاملے میں بھی اگر نشر و اشاعت کے

تمام وسائل سے عوام کو ان مفاسد سے آگاہ کیا جائے اور جن برادریوں میں ان کا رواج ہے ان کو اجتماعی طور پر سمجھایا جائے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اس غلطی سے باز آ جائیں لیکن قانونی طور پر اس کی قابل سزا جرم قرار دینے میں قانون شریعت سے تصادم ہو جاتا ہے اس سے اجتناب کیا جائے۔

2۔ شریعت اسلام نے انہی مفاسد کی اصلاح کے لیے یہ قانون پہلے سے بنایا ہوا ہے کہ اگر نابالغ لڑکے یا لڑکی کے اولیا صغر سنی میں ان کا نکاح کر دیں تو جب یہ لڑکا لڑکی بالغ ہوتے ہیں تو فوراً اس نکاح کے فسخ کا اعلان کر کے اسلامی عدالت کے ذریعے نکاح فسخ کرا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ یہ نکاح نابالغ کے باپ یا دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہو اور باپ دادا کے نکاح میں بھی اگر ان کی بدنیتی یا خودغرضی کا ثبوت ہو جائے تو ان کے کئے ہوئے نکاح کو بھی فسخ کیا جا سکتا ہے۔ (شامی)

(سہ ماہی منہاج لاہور جولائی' اکتوبر 1995 جلد۔ 13 شمارہ 3-4)

جہیز کی شرعی حیثیت

حافظ محمد سعد اللہ جونیئر ریسرچ آفیسر مرکز تحقیق

جہیز کی لغوی تعریف:

لفظ جہیز دراصل عربی زبان کے لفظ ''جہاز'' کا امالہ ہے جس کا اطلاق اس ساز و سامان پر ہوتا ہے جس کی (مسافر کو دوران سفر یا دلہن کو نئے گھر بسانے یا میت کو قبر تک پہنچانے کے لیے) ضرورت ہوتی ہے۔

مفردات للراغب اصفہانی میں ہے۔

الجهاز مايعد من متاع وغيره والتجهيز حمل ذالک اوبعثه.

جہاز اس سامان وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو (کسی کے لیے) تیار کیا جاتا ہے اور تجہیز کا معنی ہے اس سامان کو اٹھانا یا بھیجنا۔

دائرۃ المعارف میں ہے **عبادة عن مجموع ادوات للصيام جعل من الاعمال** جہاز اس ساز و سامان کے مجموعے سے عبارت ہے جو کسی کام کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

المنجد میں ہے۔

الجهاز للبيت اوللمسافر وللعروس يايحتاج اليه.

جہاز گھر یا مسافر یا دلہن کے لیے وہ سامان ہے جس کی احتیاج ہوتی ہے۔ المنجد کی اس تعریف سے ملتی جلتی تعریف لغت کی دیگر معروف کتب مثلاً لسان العرب 'اقرب الموارد اور دائرۃ المعارف لفرید وجدی وغیرہ میں قدرے تغیر کے ساتھ منقول ہے جسے خوف

طوالت کی وجہ سے ترک کیا جاتا ہے۔

اسی مادہ سے باب تفعیل (جَھَّزَ تجھیزا) عموماً مستعمل ہے جس کے معنی ہیں "سامان تیار کرنا" "مہیا کرنا" خواہ وہ کسی مسافر کے لیے ہو یا کسی دلہن کے لیے یا کسی میت کے لیے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ.

اور جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کا سامان تیار کر دیا۔ یا ایک حدیث نبوی میں آیا۔

من جهز غازيافى سبيل الله فقد غزا .

جس شخص نے اللہ کے راستے میں کسی جہاد کرنے والے کو (سامان حرب سے) لیس کیا وہ گویا خود جہاد میں شریک ہوا۔

جہیز کی مروجہ اصطلاحی تعریف

جہیز کے معنی اسباب اور سامان کے ہیں اصطلاحاً اس سروسامان کو کہتے ہیں جو لڑکی کے نکاح میں اس کے ہمراہ دیا جاتا ہے جہیز دینے کی رسم بہت پرانے زمانے سے چلی آ رہی ہے ہر ملک اور علاقے میں جہیز مختلف صورتوں میں دیا جاتا ہے لیکن وہ عام طور پر زیورات نقدی کپڑوں اور روزانہ استعمال کے برتنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سید سابق کے الفاظ میں اصلاحی تعریف کچھ یوں ہے۔

الجهاز هو الاثاث الذى تعده الزوجة هى واهلها ليكون معهافى البيت اذردخل بهاالزوج.

جہاز (جہیز) وہ سامان ہے جسے عورت خود اور اس کے ورثاء تیار کرتے ہیں تاکہ جب وہ بیاہ کر خاوند کے گھر جائے تو یہ سامان اس کے ساتھ ہو۔

رسم جہیز...... ہندو معاشرت کی پیداوار

تمدن وفریب، معاشرت اور ثقافت میں جب ترقی ہوتی ہے تو دولت وثروت کی فراوانی ہونے لگتی ہے۔ بچے کے پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک نئے نئے رسوم اور طریقے ایجاد ہوتے ہیں یا یوں سمجھیئے کہ مہد سے لحد تک بیسیوں رسومات ہونے لگتی ہیں اور مرنے کے بعد بھی اس کا سلسلہ باقی رہتا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کے پیدا ہونے سے اس کے مرنے تک جو مراسم انجام دے کر رہبری فرمائی وہ چند ہیں اور انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ بچہ پیدا ہونے پر اس کے کانوں میں اذان دینا، گھٹی ڈالنا، اچھا نام رکھنا پھر اس کا عقیقہ کرنا (اگر گنجائش ہو ورنہ یہ بھی ضروری نہیں) اذان نام اور عقیقہ کے بعد اس کی مناسب تعلیم وتربیت اور بالغ ہونے پر نکاح کا حکم ملتا ہے۔ نکاح کے لیے چند شرائط اور مختصر سے احکام ہیں۔ مثلاً عقدِ نکاح میں فریقین کی جانب سے دین داری کو ترجیح دینا، کفو کا خیال رکھنا، منکوحہ کو ایک نظر دیکھ لینا عقد پر کھجور یا شیرینی تقسیم کرنا اور نکاح کے بعد حسب توفیق دعوت ولیمہ۔ بس یہ تھے اسلام یا مسلمانوں کے سیدھے سادھے سماجی مراسم لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا دولت وثروت میں اضافہ ہونے لگا نیز مذہب اسلام کا دائرہ دور دور تک پھیل گیا تو سماجی مراسم میں بھی دیگر اقوام سے معاشرت کی وجہ سے اضافہ ہوتا گیا۔

ہندوستان میں زیادہ تر مغل فرمانروا شہنشاہ اکبر اور دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں ملانے اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے اور یگانگت کی فضا قائم کرنے کے لیے بہت سی ہندی رسومات کو اپنا لیا تھا۔ یک جہتی پیدا کرنے کی خاطر ایسے رسومات اختیار کرنے لگے جن کا اسلامی تہذیب یا مسلمانوں میں پہلے سے کہیں وجود نہیں تھا مثلاً نکاح اور شادی کے موقعہ پر رسم مہندی رتجگا، مانجھا، جلوہ اور بری وغیرہ وغیرہ۔ انہی رسومات میں ایک رسم مروجہ جہیز کی تھی، ہندو چونکہ لڑکیوں کو اپنی جائیداد میں سے حصہ نہیں دیتے تھے اس لیے شادی کے وقت اکٹھا ہی جو کچھ میسر ہو سکا ''جہیز'' کے نام سے لڑکی

کے حوالے کر دیا۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی آہستہ آہستہ یہ رسم مسلمانوں میں بھی جڑ پکڑنے لگی حتیٰ کہ شادی کا ''جزو لاینفک'' بن گئی اور غریب والدین کے لیے مستقل دردسر بن گئی جس نے اب آسان دین کے آسان احکام میں اتنی تنگی پیدا کر دی ہے کہ بظاہر چھٹکارے کی کوئی صورت ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

مروجہ جہیز کوئی شرعی حکم نہیں

دین اسلام ایک مکمل دین ہے۔ جس نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی فرمائی ہے۔ قرآن وحدیث نے اساسی اور رہنما اصول بیان فرما دیئے ہیں پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز عمل ہمارے سامنے ہے۔ بعد میں ہمارے ائمہ مجتہدین اور فقہاء عظامؒ نے کوئی ایسا مسئلہ نہیں چھوڑا جس کی قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلات نہ بتادی ہوں۔ حتیٰ کہ متوقع اور فرضی پیش آمدہ مسائل کے بھی حل بتا دیئے ہیں۔ مسائل اور ضروریات انسانی میں نکاح اور شادی انسان کی طبعی' فطری اور بنیادی ضرورت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسلام' جو ایک فطری دین ہے' اس سلسلے میں اپنے ماننے والوں کی رہنمائی نہ فرمائے۔ انسانی نسل اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے نکاح چونکہ ایک لابدی چیز تھی۔ اس لیے شریعت اسلامیہ نے اسے کماحقہ اہمیت دی' نکاح ازدواجی زندگی کا کوئی ایسا لازمی اور ضروری پہلو نظر نہیں آتا جس میں شریعت نے واضح ہدایات نہ دی ہوں' نکاح اور نکاح پر متفرع ہونے والے جملہ احکامات قرآن مجید میں بڑی تفصیل سے بیان ہوئے دورِ جاہلیت میں چونکہ عورتوں کی عام حیثیت انسان سے گر کر ڈھور ڈنگر کی بن چکی تھی اس لیے قرآن اور صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلامؑ نے ازدواجی زندگی میں عورتوں کے حقوق اور بہترین معاشرت پر انتہائی زور دیا۔ رحمان کے رحیم نبیؐ نے اپنے طرز عمل سے عورتوں کے جملہ حقوق کا تعین فرمایا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اسلام کا دائرہ کار وسیع ہو جانے مسلمانوں کے

مختلف ممالک میں پھیل جانے اور غیر مسلم اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنے کی وجہ سے بعض رسومات ان میں دانستہ یا نادانستہ پیدا ہوگئی تھیں۔ جن میں سے ایک رسم جہیز بھی ہے۔ اس کے مسلمانوں میں آ جانے کی وجہ سے متاخرین فقہاء کے فتاویٰ میں جہیز کے سلسلے میں چند جزوی احکامات ملتے ہیں ورنہ قرآن مجید میں، کتب احادیث میں، متقدمین فقہاء کی کتابوں میں مروجہ جہیز کا وجود نہیں۔ صحاح ستہ، معروف کتب احادیث اور چاروں ائمہ فقہا کی امہات الکتب میں ''باب الجہیز'' کے عنوان سے کوئی باب نہیں اگر یہ کوئی شرعی حکم ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جہاں نکاح سے متعلق دیگر احکامات مثلاً نان نفقہ، مہر بہتر معاشرت، طلاق عدت وغیرہ تفصیلاً بیان ہوئے وہاں ''جہیز'' کا بیان نہ ہوتا۔

سنن نسائی جلد دوم باب جہاز البنت کے ماتحت آنے والی حدیث سے ''مروجہ جہیز'' کو شرعی حکم سمجھنا غلط ہے۔ (اس کا بیان انشاءاللہ آگے آئے گا) مروجہ جہیز محض ایک رسم اور عرف ہے۔ اور فقہاء نے اسے رسم اور عرف کے زمرے میں ہی شمار کیا ہے۔ السید سابق لکھتے ہیں:

وقد جری العرف، علی ان تقوم الزوجة واهلها باعداد الجهاز وتاثیث البیت وهو اسلوب من اسالیب ادخال السرور علی الزوجة بمناسبة زفافها.

یہ ایک عرف ہے کہ بیوی اور اس کے گھر والے جہیز اور گھر کا ساز و سامان تیار کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ عورت کے نئے گھر میں جانے کی مناسبت عورت کو خوش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

سید سابق ایک روایت سے استدلال کرنے کے بعد پھر لکھتے ہیں۔

وهذا مجرد عرف جری علیه الناس.

یہ صرف ایک عرف (عادت) ہے جو لوگوں کے اندر جاری ہے۔

جس طرح دیگر کئی ایک رسوم اور عرفوں کو جن میں کوئی شرعی قباحت یا ممانعت نہ تھی قبول کر لیا گیا، اسی طرح اس عرف (جہیز) کو بھی اپنا لیا گیا ورنہ یہ کوئی شرعی حکم یا نکاح

کا کوئی لازمی جزو نہیں ہے۔

جہیز دینا خاوند کی ذمہ داری ہے

بیوی کی جملہ جائز ضروریات اور اخراجات کا شرعاً ذمہ دار خاوند ہے۔

ہدایہ میں ہے:

النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت او كافرةً اذا سلمت نفسها الىٰ منزله فعليه نفقتها وكسوتها و سكناها والاصل فى ذالك قوله تعالىٰ لِيُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَةٍ مِّنۡ سعته.

بیوی مسلمان ہو یا کتابیہ اس کا ہر قسم کا خرچہ خاوند پر واجب ہے جبکہ وہ (بیوی) اپنے آپ کو خاوند کے سپرد کر دے اور اس کے گھر منتقل ہو جائے اس خرچہ میں اس کی خوراک' لباس اور رہائش کے لیے مکان داخل ہے۔ اور اس حکم کی بنیاد باری تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ وسعت والے کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے۔

بیوی ہوتے ہوئے سکنیٰ (رہائش کے لیے مکان) کا دینا تو واجب ہے ہی بعد از طلاق بھی دوران عدت بیوی کے لیے سکنی مہیا کرنا لازمی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَسۡكِنُوۡهُنَّ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ.

ان (مطلقات) کو اپنی حیثیت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو۔

ظاہر ہے جب رہنے کا مکان خاوند کے ذمہ ہے تو ایک مکان میں رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے اور اٹھنے بیٹھنے' کھانے پینے اور سونے کے لیے جن اشیاء کا استعمال میں لانا ضروری ہے اور جن کو ہماری اصطلاح میں ''جہیز'' کہا جاتا ہے۔ وہ بھی خاوند ہی کے ذمہ واجب ہوں گی۔ الاحوال الشخصیہ میں عصر حاضر کے مشہور فقیہ محمد ابوزہرہ ''متاع البیت'' کے عنوان سے فقہاء حنفیہ کی رائے بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

رای الحنفية' وهو ان اعداد البيت على المزوج كان النفقة بكل انواعها من 'مطعم وملبس ومسكن عليه واعداد البيت

من المكسن فكان بمقتضى هذا الاعداد على الزوج اذاالنفقة بكل انواعها تجب عليه والمهرليس عوض الجهاز لانه عطا ونحلة كماسماه القرآن فهوملك خالص لهاو هو حقها على الزوج بمقتضى احكام الزواج وليس ثمه من مصادر الشريعة مايجعل المتاع حقا على المرئة ولايثبت حق من حقوق الزواج من غير دليل .

ترجمہ: حنفی فقہاء کی رائے یہ ہے کہ گھر (اور گھریلو سامان) کی تیاری خاوند کے ذمہ ہے کیونکہ ہر قسم کا خرچہ مثلاً کھانا' لباس اور رہائش کی جگہ دینا اس پر واجب ہے۔ اور گھریلو ساز و سامان (جسے عرف عام میں جہیز کا نام دیا جاتا ہے) رہائش کے مکان میں داخل ہے۔ پس اس اعتبار سے گھریلو ساز و سامان کی تیاری خاوند پر واجب ہوئی۔ حق مہر جہیز کا عوض نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ صرف اور صرف عطیہ ہے جیسا کہ قرآن مجید نے اس کا نام نحلۃ (عطیہ) رکھا۔ وہ خالصۃً بیوی کی ملک ہے اور خاوند پر اس کا حق ہے۔ مصادر شریعت میں سے کوئی ایسی دلیل نہیں جس کی بنیاد پر گھریلو ساز و سامان کی تیاری کو عورت کا حق قرار دیا جاسکے۔ اور بغیر کسی دلیل کے کبھی کوئی حق ثابت نہیں ہوتا۔

مالکی فقہاء کے نزدیک اگرچہ جہیز کے سامان کی تیاری عورت کے ذمہ ہے تاہم اس میں بھی یہ وضاحت ہے کہ وہ یہ سامان پیشگی رقم مہر سے بنائے گی نہ کہ اپنے ذاتی مال یا والدین کے مال سے۔ اگر خاوند کی طرف سے پیشگی کوئی رقم رخصتی سے قبل اس کے پاس نہ بھیجی جائے تو اس پر سامان جہیز لازم نہیں ہیں۔ **فان لم تكن قد قبضت شئيا من المعصر فليس عليهاجهاز۔**

اگر اس عورت نے پیشگی مہر میں سے کوئی چیز نہ لی ہو تو جہیز اس پر واجب نہیں۔

فقہ مالکی کی ایک دوسری معروف کتاب میں یوں ہے۔

فان لم تقبض شيئا قبل البناء لم يلزمها تجهيز.

اگر بیوی نے رخصتی سے قبل کوئی چیز نہ لی ہو تو اس پر سامان جہیز لازم نہیں۔

سید سابق نے اسی چیز کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں

واما المسؤل عن اعدا البیت اعداداً شرعیا' وتجهيز كل ما يحتاج له من الاثاث والفرش والادوات فهو الزوج ' والزوجة الاتسال عن شئی من ذالک حتی ولو کانت زیادة المهر من اجل الاثاث' لان المهر انما تستحقه الزوجة 'فالمهر حق خالص لها'ليس لابيها ولالزوجها' ولالا حد حق فيه.

ترجمہ: گھر کی شرعی تیاری اور گھر کے لیے ہر اس چیز کا مہیا کرنا جس کی احتیاج ہوتی ہے مثلاً سامان' بستر سے اور برتن وغیرہ کا مسئول (ذمہ دار) خاوند ہے۔ ان اشیاء ضرورت میں سے کسی بھی شے کے متعلق عورت سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر مہر کی رقم سامان بیت کی نیت سے زیادہ رکھی جائے تو بھی عورت پر سامان بیت لازم نہیں کیونکہ مہر کی رقم اس عورت سے فائدہ اٹھائے جانے کے مقابلے میں ہے نہ کہ سامان جہیز کی تیاری کے لیے مہر صرف اور صرف اس کا حق ہے جس میں نہ اس کے والد اس کے خاوند اور نہ ہی کسی اور شخص کا حق ہے۔

عین شادی کے موقعہ پر جہیز لازم نہیں

یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ سامان جہیز شرعاً خاوند کے ذمہ واجب ہے۔ جب بیوی اس کے گھر جائے گی تو اس کی جملہ جائز ضروریات (نہ کہ تعیشات) کا وہ ضامن ہوگا۔ مگر اس پر یہ لازم نہیں کہ عین شادی کے موقعہ پر (جیسا کہ ہمارے معاشرے میں رواج ہے) سامان جہیز لا کر لوگوں کے سامنے رکھے اگرچہ اس کا گھر پہلے ہی سامان سے بھرا پڑا ہو دور نبویؐ میں سوائے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی کے موقعہ کے کوئی ایسی شادی نظر نہیں آتی کہ عین شادی کے موقعہ پر خاوند کی طرف سے سامان جہیز دیا گیا ہو حضرت فاطمۃ الزہراء کے سامان جہیز کی تیاری کی پیشگی ضرورت بھی صرف اس لیے آئی تھی کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر کفالت تھے۔ اور ان کا

الگ کوئی مکان یا گھریلو ساز و سامان نہ تھا۔ ورنہ آنجنابؐ کی باقی تینوں بنات طاہرات کی شادیوں کے موقعہ پر ایسا نہیں ہوا نہ ہی آنجنابؐ کی اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ نکاح کے موقعہ پر کسی قسم کا جہیز دیا گیا ہے۔ شرعی طور پر گھریلو ساز و سامان جب پہلے ہی سے خاوند کے ذمہ ہے اور اسے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے لامحالہ یہ اشیاء بیوی کو مہیا کرنا ہیں تو عین شادی کے موقعہ پر ان کا دکھانا عبث ہے۔ آخر زندگی بھر میں بیوی نے جو کچھ کھانا ہے' پہننا ہے دوا کرنا ہے' وغیرہ وغیرہ وہ تو کوئی نہیں دکھاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی کا ایک واقعہ ہے۔

عن خيثمة قال زوج النبى صلى الله عليه وسلم امرءة ثم جهزها الىٰ زوجها ولم يعطها شيئاً.

حضرت خثیمہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کا نکاح کر دیا پھر اسے تیار کر کے اس کے خاوند کی طرف بھیج دیا حالانکہ اس خاوند نے اسے کوئی چیز نہ دی تھی۔

اس طرح بعد کے ادوار میں بھی کہیں تذکرہ نہیں ملتا کہ عین شادی کے موقعہ پر سامان جہیز دینے کا رواج رہا ہو۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہما ایک عرب قبیلے کے پاس آئے اور انہیں پیغام نکاح دیا۔ انہوں نے پوچھا تم کون ہو؟ ان دونوں صحابہ نے جواب دیا کہ ہم گمراہ تھے اللہ نے ہمیں ہدایت نصیب فرمائی ہم مملوک تھے اللہ نے ہمیں آزاد فرمایا اور ہم مفلوک الحال تھے اللہ نے ہمیں غنی بنایا اگر تم ہم سے اپنی لڑکیوں کی شادی کر دو تو الحمد للہ اور اگر نہ کرو تو سبحان اللہ۔ ان لوگوں نے کہا کہ (گھبراؤ نہیں) تمہاری شادی کر دی جائے گی۔ اور سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

اس واقعے میں کہیں جہیز لانے کا ذکر نہیں۔ اور ہوتا بھی کیوں جہیز (سامان بیت) تو خاوند کی ذمہ داری ہے ہی پھر اس کے ذکر کرنے کا کیا تک؟ اگر کوئی آدمی عورت کے نان نفقہ اٹھانے کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ شادی کا مکلف ہی نہیں۔

عین شادی کے موقعہ پر جہیز کے لازمی نہ ہونے کے سلسلے میں حلیۃ الاولیاء لابی

نعیم اصفہانی میں مندرج ایک واقعہ سب کے لیے باعث سبق ہے، جس کا ماحاصل یہ ہے کہ مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیبؒ کے پاس ایک آدمی آیا جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ کئی دن غائب رہا اور کافی عرصے کے بعد آیا تو حضرت سعید نے غائب رہنے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی فوت ہوگئی تھی لہٰذا مصروف رہا۔ حضرت سعید نے اس سے پوچھا ''کیا تو نے کوئی دوسری شادی کر لی ہے؟'' اس نے بتایا کہ ''میں فقیر آدمی ہوں مجھے کون رشتہ دے گا؟'' حضرت سعید نے دو درہم مہر کے عوض وہیں اس کا نکاح اپنی بیٹی سے کر دیا۔ وہ آدمی جب گھر چلا گیا تو شام کو خود اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر چھوڑ آئے۔ حضرت سعید نے اپنی بیٹی کا یہ رشتہ خلیفہ وقت کو بھی نہیں دیا تھا۔

اس واقعے سے بھی یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ شادی کے موقع پر خاوند یا بیوی کی طرف سے سامان جہیز دیا جانا ضروری نہیں۔ اور نہ ہی یہ کوئی نکاح اور شادی کا لازمہ ہے۔ ورنہ سعید مسیب جیسا متبع سنت تابعی اس کی خلاف ورزی نہ کرتا۔

لڑکی یا اس کے والدین سے جہیز کا مطالبہ ناجائز ہے

یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ سامانِ جہیز خاوند کی ذمہ داری ہے اور وہ جملہ ضروری گھریلو اشیاء کے مہیا کرنے کا پابند ہے۔ لہٰذا خاوند کو اس بات کا قطعاً حق نہیں۔ کہ وہ بیوی یا اس کے والدین سے جہیز کا مطالبہ کرے یا انہیں مجبور کرے۔ المحلی لابن حزم میں ہے:

ولا یجوز ان تجبر المراۃ علیٰ ان تتجهز الیه بشی اصلاً لا من صداقها الذی اصدقها ولا من غیرہ من سائر مالها والصداق کله لها تفعل فیه ماشاءت لا اذن للزوج فی ذالک ولا اعتراض وهو قول ابی حنیفة والشافعی وابی سلیمان وغیرهم.

ترجمہ: عورت کو اس بات پر مجبور کرنا جائز نہیں کہ وہ خاوند کے پاس سامان جہیز لائے۔ نہ ہی اس مہر کی رقم سے جو خاوند نے اسے دی ہے اس کے دوسرے اپنے مال سے مہر سارے کا سارا اس کی ملکیت ہے اس میں وہ جو چاہے کرے خاوند کو اس

میں کسی قسم کے دخل دینے کا حق نہیں۔ یہ قول امام ابوحنیفہ امام شافعی اور ابی سلیمان وغیرہ کا ہے۔

کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ میں ہے:

فاذا تزوجها على الف جنيه مهرا' وكانت العادة ان مثل هذا المهر يقابل بجهاز كبير يليق بحالهما ولكنها لم تفعل فانه لاحق للزوج في مطالبتها بالجهاز ......فانه جب على الرجل ان يعد للمرئة محلا يشتمل على حاجيات المعيشة.

ترجمہ: اگر کوئی آدمی ایک ہزار مہر پر کسی عورت سے نکاح کرے اور عادت یہ ہو کہ اتنا مہر ایک بڑے جہیز کے مقابلے میں ہوتا ہو مگر وہ عورت ایسا نہ کرے (جہیز نہ لائے) تو خاوند کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ اس سے جہیز لانے کا مطالبہ کرے۔ آدمی پر واجب ہے کہ وہ عورت کے لیے ایسی رہائش کی جگہ تیار کرے جو ضروریات زندگی پر مشتمل ہو۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الصحيح انه لايرجع على ابى المرء ة لبشئى لان المال فى التكاح غير مقصود.

ترجمہ: صحیح یہ ہے کہ خاوند بیوی کے باپ سے کسی شے کا مطالبہ نہ کرے کیونکہ مال نکاح میں مقصود نہیں ہے۔

الاحکام الشرعیہ میں ہے۔

ليس المال بمقصود فى النكاح فلا تجبر المرة على تجهيز نفسها من مهر ها ولا من غيره ولا تجبرا بوها على تجهيز هامن ماله فلوزفت بجهاز قليل لا يليق بالمهر الذى دفعه الزوج اوبلا جهاز اصلافليس له مطالبتها ولا مطالبة ابيها لبشئى منه ولا تنقيص شئى من مقدار المهر الذى ترا ضيا عليه.

ترجمہ: نکاح میں مال مقصود نہیں لہٰذا عورت کو اپنے مہر کی رقم یا کسی دوسری رقم سے اپنے لیے سامان جہیز لانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کے والد کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی گرہ سے جہیز دے۔ اگر عورت اتنا کم جہیز لائے کہ وہ اس مہر کی مقدار کے شایان شان نہ ہو جو خاوند نے اسے دیا ہے یا سرے سے جہیز لائے ہی نہ تو خاوند اس بات کا مجاز نہیں کہ وہ اسے یا اس کے والد سے جہیز میں سے کسی چیز کا مطالبہ کرے اور نہ ہی اسے یہ حق ہے کہ وہ اس مہر کو کم کرے جس پر فریقین (میاں، بیوی) راضی ہو چکے)

نکاح تجارت نہیں

نکاح شریعت کی نگاہ میں محض شہوات کی تسکین کا ذریعہ نہیں۔ اس عقد سے متعدد دینی دنیاوی ظاہری باطنی جسمانی روحانی معاشی معاشرتی اور عمرانی فوائد مقصود ہیں۔ قرآنی مفہوم میں نکاح اولاً میاں بیوی کے درمیان اور پھر میاں بیوی کے خاندانوں کے درمیان تسکین محبت و مودت، شفقت اور رحمت اور تعلق و نسبت کا ایک مؤثر سبب ہے۔ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے سب شادیاں اسی نقطہ نگاہ سے فرمائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سوا آپ کی تمام ازواج مطہرات بیوہ تھی۔ اسلامی نقطہ نظر سے اس پاکیزہ رشتہ کو تجارت کا درجہ دے دینا یا ذریعہ آمدن بنا لینا جائز نہیں۔ تمام کتب احادیث میں کتاب النکاح کے اندر ایسی بہت سی روایات ہیں جن میں رحمتہ و عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال و منال اور دولت و ثروت کے حصول کے طمع میں نکاح کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔ صرف ناپسند ہی نہیں بعض احادیث میں منع فرمایا ہے مثلاً ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں۔

لاتنکحوا النساء لحسنهن ولا تنکحوهن لاموالهن

عورتوں کے ساتھ محض ان کے حسن و جمال کی وجہ سے نکاح نہ کرو اور نہ ہی محض ان کے اموال کے لالچ میں ان سے نکاح کرو۔

پھر یہ کہ نکاح سے مقصود نسل انسانی کی بقاء اور تناسل ہے نہ کہ مال و دولت۔ مال

دولت حاصل کرنے اور بہت سے ذرائع ہیں۔ الاحکام الشرعیۃ کی شرح میں لکھا ہے۔

الغرض من الزواج التناسل الاالمال .

ازدواجی تعلق سے مقصود تناسل ہے نہ کہ مال۔

لہٰذا لڑکے والوں کو یہ جائز نہیں کہ وہ لڑکی والوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھائیں اور ان کی اس مجبوری کی وجہ سے منہ مانگا سامان جہیز وصول کریں۔ اور نہ ہی لڑکی والوں کے لیے جائز ہے کہ وہ لڑکے والوں کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں فتاویٰ شامی میں ہے۔

ومن السحت مایا خذہ الصہر من الختن بسبب بنتہ .

سسر اپنی بیٹی کے سبب سے اپنے داماد سے جو کچھ لیتا ہے وہ حرام ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

لڑکی والے لڑکی کو دیتے وقت اگر کوئی چیز وصول کریں تو خاوند کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ان سے اس چیز کی واپسی کا مطالبہ کرے کیونکہ وہ رشوت ہے۔

نکاح میں قابل لحاظ چیز......دین

نکاح کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد چونکہ تناسل حصول اولاد اور پھر اولاد کی مناسب تعلیم و تربیت اور اچھے افراد معاشرہ پیدا کرنا ہے۔ اس لیے نکاح میں شرعاً سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز دینداری اور اخلاق ہے۔

حدیث نبوی ہے:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنکح المرءۃ لاربع لمالھا ولحسبھا ولجمالھا ولدینھافاظفر بذات الدین تربت یداک متفق علیہ.

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (عموماً) چار وجوہ سے عورت کے ساتھ نکاح کیا جاتا ہے۔ نمبر 1 اس کے مال کی وجہ سے

نمبر 2 اس کے حسب نسب کی وجہ سے۔ نمبر 3 اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور نمبر 4 اس کے دین کی وجہ سے۔ اے ابوہریرہ! تیرے ہاتھ خاک آلودھوں دین والی عورت کے ساتھ نکاح کر کے کامیابی حاصل کر۔

اسی طرح لڑکی والوں کے لیے ہدایت ہے کہ وہ انتہائی جدید تعلیم یافتہ، کسی اعلیٰ منصب پر فائز، ملک سے باہر ملازم، سرمایہ دار، جاگیردار، اور کاروباری لڑکے ہی کو نہ تلاش کرتے رہیں حتیٰ کہ اس تلاش میں اپنی بچیوں کی شادی کی عمر کو گنوادیں بلکہ دینداری اور حسنِ اخلاق کو مدنظر رکھیں اگر کسی متدین اور با اخلاق لڑکے کے لیے ان سے لڑکی کا رشتہ مانگا جائے تو فوراً ایسے رشتہ کو قبول کریں تاکہ معاشرہ میں جنسی بے راہروی جنم نہ لے۔

ارشاد نبویؐ ہے۔

اذا خطب اليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه ان لاتفعلوا تكن فتنة في الارض ونساء عريض.

اگر تمہاری طرف کوئی ایسا آدمی پیغام نکاح بھیجے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے اپنی لڑکی کا نکاح کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے۔ (اور صاحب مال اور صاحب جاہ لڑکوں کی تلاش میں اپنی لڑکیوں کو بٹھائے رکھو گے) تو زمین میں فتنہ اور بہت فساد پھیل جائے گا۔

ملا علی قاری نے شرح السنہ کے حوالے سے لکھا ہے۔

روى ان رجلا جاء الى الحسن وقال ان لى بنتا وقد خطبها غير واحد فمن تشير علىٰ ان ازوجها قال زوجها رجلا يتقى الله فانه ان احبها اكرمها وان ابغضها لم يظلمها.

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی حضرت حسن کے پاس آیا اور عرض کی میری ایک بیٹی ہے جس کے واسطے بہت سے آدمیوں نے پیغام نکاح بھیجا ہے کس آدمی کے ساتھ آپ نکاح کا مشورہ دیتے ہیں؟ امام حسن نے فرمایا تو اپنی بیٹی کا نکاح ایسے آدمی سے کر دے جو اللہ سے ڈرتا ہو۔ (متقی ہو) کیونکہ اگر وہ اس سے محبت رکھے

گا تو اس کی عزت و تکریم کرے گا اور اگر (بالفرض) کبھی اس پر ناراض ہوا تو اس پر زیادتی نہ کرے گا۔

ان روایات سے واضح ہوا کہ نکاح میں اصل قابل اعتبار چیز دینداری ہے نہ کہ صرف مال و دولت اور حسن و جمال۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرمودات کو پیش نظر رکھتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں اگر بلاوجہ اور خواہ مخواہ تاخیر نہ کی جائے تو بہت سی معاشرتی اور جنسی برائیاں ختم ہو سکتی ہیں اس مادہ پرست جسم پرست اور چہرہ پرست معاشرے میں سارا حسن بال کھال اور خد و خال تک رہ گیا ہے حالانکہ کتنے ہی سادہ چہروں کے پیچھے خوش اخلاقی وفا شعاری' اطاعت گزاری اور تحفظ ناموس کا ایک خزانہ حسن مخفی ہوتا ہے۔

جہیز باعث تسکین نہیں

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عورت اگر خاوند کے گھر اپنے ساتھ سامان جہیز بھی لائے تو یہ ''سکون کا سامان ہوگا'' اور دوسرے ارشاد باری تعالیٰ۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً.

اور اسی کی نشانیوں میں ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کر دی کہ مراد کے زیادہ قریب ہے۔ حالانکہ والدین کی طرف سے سامان جہیز کو لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا کی مراد کے قریب قرار دینا محض ایک مفروضہ ہے جس کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ صرف مال و دولت یا ساز و سامان سے کم ہی قلبی یا ذہنی سکون نصیب ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس دنیا کی ریل پیل ہوتی ہے مگر زندگی میں اطمینان و سکون نامی چیز سے محروم ہوتے ہیں۔ میاں بیوی کا اگر جوڑ نہیں' ان کے خیالات و نظریات ایک جیسے نہیں یا جہاں عورت کو اس کی حیثیت کے مطابق مرتبہ و مقام نہیں دیا جاتا تو وہاں محض سامان جہیز اس کے نباہ کا

ذریعہ نہیں بن سکتا۔ ہمارے اس معاشرے میں بیسیوں ایسی مثالیں ہیں کہ عورت لکھ پتی اور کروڑ پتی آدمی کو چھوڑ کر ایسے آدمی کے ساتھ گزارہ کر لیتی ہے جو اتنا امیر کبیر نہیں ہوتا ایک خیال یہ بھی ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ جہیز لڑکی کو دیا جائے گا سسرال میں اس کی قدر و منزلت بڑھے گی۔ حالانکہ بسا اوقات حد سے زیادہ جہیز دینا لڑکی کے حق میں اُلٹا بھی ثابت ہوتا ہے۔ شکی سسرال کی عورتیں جہیز کی زیادتی کو منفی رنگ میں لیتی ہیں۔

پنجابی کی ایک مثل ہے۔

''جنی وہ اوفی وکھ'' (جتنا زیادہ جہیز دو گے اتنی زیادہ خاک اڑے گی)

ایک اور پنجابی کہاوت ہے۔

آون ننگیاں وس چنگیاں' آون بھر کے وسن ڈر کے' (بغیر جہیز کے آنے والی بہوئیں خوب مزے سے ہنستی بستی ہیں جب کہ زیادہ جہیز لانے والی ڈر کے رہتی ہیں)

لہٰذا سامان جہیز کو ''سکون کا سامان'' اور ارشاد قرآنی لتسکنو الیھا کی مراد کے زیادہ قریب سمجھنا محض ایک مفروضہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔

مروجہ جہیز سنت نہیں

مروجہ جہیز یعنی شادی کے موقعہ پر والدین کا اپنی گرہ سے سامان جہیز خرید کر لڑکی کے ساتھ بھیجنے کو عموماً سنت نبوی تصور کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس مغالطہ کا باعث وہ روایت ہے کہ جسے امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں حاکم اپنی مستدرک میں اور امام نسائی اپنی سنن وغیرہ میں قریباً ایک جیسے الفاظ کے ساتھ لائے ہیں۔ سنن نسائی کے الفاظ یہ ہیں۔

عن علی رضی اللہ عنہ قال جھز رسول اللہ فاطمة فی خمیل وقربة وسادة حشو ھا اذخر.

(حضرت علی المرتضیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب فاطمہ

الزہرا کو تیار کیا ایک چادر مشکیزے اور ایک تکیے میں جس میں اخر گھاس بھرا ہوا تھا)

اس روایت سے "مروجہ جہیز" کو سنت نبویؐ سمجھنا بوجوہ غلط ہے۔

اولاً: اس روایت میں موجود لفظ جَهَّــزَ کو "جہیز دینا" کے معنی میں استعمال کرنا لغتہً غلط ہے۔ جہز کا مصدر تجہیز ہے اور تجہیز کے معنی مطلق تیاری کے ہیں۔ مثلاً

1۔ جب ایک جماعت کے لیے رخصت سفر مہیا کیا جائے تو کہیں گے۔ جهز القوم۔

2۔ اسی طرح جہز الغازی کا مطلب ہے غازی کے لیے سامان حرب مہیا کرنا۔

3۔ جہز فلانا کے معنی ہیں فلاں کے لیے رخصت سفر تیار کرنا۔

4۔ جہز العروس کے معنی ہیں دلہن کا سامان مہیا کرنا۔

5۔ جہز المیت کا معنی ہے مردے کے کفن وغیرہ کا سامان مہیا کرنا۔

اس تصریح سے واضح ہوگیا ہے کہ جہز تجہیز کے معنی ہیں کسی مقصد کے لیے کسی کو تیار کرنا' اس تیاری کے ساز و سامان کو عربی میں جہاز کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَلَمَّا جَهَّزَ هُمْ بِجَهَا زِ هِمْ .

اور جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان (بھائیوں) کا سامان (راشن) تیار کر دیا اب یہاں یہ معنی تو نہیں لیا جا سکتا کہ جب حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو جہیز دیا۔ اسی طرح کئی ایک احادیث ہیں جن میں جہز کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر وہاں "جہیز" کا معنی لینا ٹھیک نہیں مثلاً۔

1۔ سنن ابن ماجہ میں ہے۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اتى عليا وفاطمة وهى فى خميل لهما و الخميل القطيفة البيضاء عن الصوف قد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم جهز هما بها .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ہاں تشریف لائے وہ دونوں اس وقت اون کی سفید چادر میں تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو اس چادر کے ساتھ تیار کیا تھا۔

اب اگر جہز کا معنی جہیز لیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ نے بیٹی کے علاوہ اپنے داماد کو بھی جہیز دیا۔ جو عقلاً اور نقلاً غلط ہے۔

عن عائشه و ام سلمة قالتا امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ان نجهز فاطمة حتىٰ ند خلها على علي فعمدنا ففر شاه ترابالينا من اعراض البطحاء .

(حضرت عائشہؓ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم فاطمۃ الزہراء کو تیار کر کے علیؓ المرتضیٰ کے پاس داخل کر دیں چنانچہ ہم اس تیاری کے ضمن میں گھر کی طرف متوجہ ہوئیں اسے سرزمین بطحا کی نرم مٹی سے پلستر کیا۔ اس کے بعد گھر کی دوسری تیاری کا تذکرہ ہے۔

اب اس روایت میں بھی جہز کا معنی "جہیز" دینا کسی قیمت پر نہیں لیا جا سکتا۔

3۔ غزوۂ خیبر کے موقعہ پر ام المومنین حضرت صفیہ بنت حی کے ساتھ دوران سفر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا تذکرہ یوں ہے۔

حتى اذا كان بالطريق جهز تهاله ام سليمه فاهد تهااليه من الليل .

جب آپؐ نے رستے میں قیام کیا تو حضرت ام سلیمؓ نے آپؐ کے لیے حضرت صفیہ کو تیار کیا اور رات کے وقت آپ کے پاس بھیج دیا۔

اب یہاں بھی جہز کا معنی "جہیز دینا" نہیں لیا جا سکتا۔

المختصر جہز کا معنی جہیز دینا نہیں بلکہ مطلق ہر قسم کے رخت کے لیے ہے صرف دلہن کے لیے نہیں لطف تو یہ ہے کہ اصطلاح "جہیز" کے لیے عربی زبان میں کوئی لفظ ہی موجود نہیں۔ ہاں اب جہیز کے لیے ایک عربی لفظ ایجاد ہوا ہے اور وہ ہے "البائنۃ" لیکن یہ لفظ مولد ہے۔ اور مولد کے معنی یہ ہیں یہ لفظ قدیم عربی لغت میں موجود نہ تھا اب اسے ضرورت کے ماتحت پیدا کیا گیا ہے یا بنایا گیا ہے اب سوچنے کی بات یہ ہے جس مفہوم کے لیے عربی میں کوئی لفظ ہی موجود نہیں وہ سنت رسول کیسے ہو گیا؟

ثانیا:

مروجہ جہیز کو سنت نبویؐ سمجھنا اس لیے بھی صحیح نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر تینوں صاحبزادیوں کو اتنا سامان بھی نہیں دیا گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمین اور عادل مصنف ذات سے یہ بات بعید ہے کہ آپ اپنی اولاد مبارکہ میں کسی قسم کا ترجیحی سلوک روا رکھیں۔ جہاں تک ظاہری معاملات کا تعلق ہے ان میں کسی لڑکی یا لڑکے کو دوسری اولاد پر ترجیح دینا خلاف شرع ہے۔ آپؐ ہی کا ارشاد ہے۔

ساروا بین اولاء وکم فی العطیة فلو کنت مفضلا احدا الفظت النساء.

تم عطیہ دینے میں اولاد کے درمیان برابری کرو۔ اگر کسی کی تفصیل یا ترجیح جائز ہوتی تو میں عورتوں کو فضیلت دیتا۔

ترجمہ: ”حضرت نعمان بن بشیر کہتے ہیں میرے والد (بشیر) نے مجھے بطور ہبہ کوئی چیز عطا کی میری والدہ نے ان سے کہا کہ اس ہبہ پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بناؤ چنانچہ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور عرض کی یا رسول اللہ اس لڑکے کی ماں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اسے بطور ہبہ کچھ دوں چنانچہ میں نے اس کے نام ہبہ کر دیا اب کہتی ہے کہ میں اس ہبہ پر آپ کو گواہ بناؤں آپؐ نے دریافت فرمایا کیا تمہاری کوئی اور اولاد بھی ہے؟ والد صاحب نے عرض کیا ہاں۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم نے تمام کو اسی طرح ہبہ کیا ہے جس طرح اس لڑکے کو کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تب مجھے اس پر گواہ نہ بنا کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ تمام اولاد کا تجھ پر یہ حق ہے کہ تو ان میں برابری کرے۔“

معلوم ہوا کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا جہیز (اگر اسے جہیز کا نام دیا جا سکے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی عطیہ نہ تھا ورنہ آنجناب باقی صاحبزادیوں کو بھی ضرور عنایت فرماتے۔

ثالثاً:

جس طرح قرآن کا بعض، بعض کی تفسیر اور وضاحت کرتا ہے اسی طرح بعض احادیث بھی بعض کی وضاحت اور تفصیل بیان کرتی ہیں۔ سنن نسائی کی مذکورہ بالا حدیث میں حضرت علی المرتضیٰؓ کے حوالے سے حضرت فاطمہؓ کو سامان تیاری دینے کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جس سے یہ شبہ پڑتا ہے کہ یہ سامان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس سے دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں دیگر بہت سی روایات ہیں جن میں یہ بات صراحت سے مذکور ہے کہ یہ مختصر سامان اسی رقم سے خریدا اور تیار کیا گیا تھا جو حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنی زرہ بیچ کر بطور مہر پیشگی آنجنابؐ کی خدمت اقدس میں پیش کر دی تھی۔

زرقانی ؒ شرح المواہب اللدنیہ میں ہے:

''آخر میں (علی المرتضیٰؓ) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ کیا آپؐ فاطمہ کو مجھ سے بیاہنا پسند فرمائیں گے؟ آپ نے پوچھا کیا تمہارے پاس (مہر کے لیے) کچھ (مال) ہے؟ میں نے عرض کیا میرا گھوڑا ہے یا زرہ۔ فرمایا گھوڑے کی تو بہر حال تمہیں ضرورت رہے گی۔ رہی زرہ تو اسے فروخت کر دو۔ چنانچہ میں نے عثمان بن عفانؓ کے ہاتھ چار سو اسی درہم میں فروخت کر دی۔ اس کے بعد عثمانؓ نے وہ زرہ بھی واپس کر دی۔ حضرت علیؓ وہ زرہ اور رقم لے کر حضورؐ کی خدمت میں آئے حضورؐ نے عثمانؓ کے حق میں دعائے خیر فرمائی جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔ پھر میں (علیؓ) رقم لے کر آیا اور حضورؐ کی گود میں رکھ دی۔ حضورؐ نے اس میں سے ایک مٹھی بھر کر فرمایا کہ بلالؓ! اس رقم کی خوشبو خرید کر ہمارے پاس لاؤ۔ ابن ہثیمہ نے حضرت علیؓ کی زبانی جو روایت بیان کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: ان چار سو اسی درہم کی تہائی خوشبو میں صرف کی جائے...... پھر حضورؐ نے لوگوں کو حکم دیا کہ ان (فاطمہ) کا سامان مہیا کریں۔ چنانچہ ان کے لیے ایک بنی ہوئی چارپائی اور ایک چرمی تکیہ جس میں کھجور کی کھال بھری تھی تیار کیے گیے۔

ایک شیعہ عالم کی روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ

حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ جب زرہ بیچ کر رقم آپ کی جھولی میں ڈالدی تو آپؐ نے اس میں سے دو مٹھی بھر کر حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کیں اور فرمایا اس رقم سے فاطمہؓ کے لیے کپڑے اور گھر کا سامان خریدو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضرت عمار بن یاسرؓ اور دیگر صحابہ بازار گئے۔ باقی صحابہؓ مختلف اشیاء حضرت ابوبکرؓ کو دکھاتے اور مشورہ طلب کرتے جس چیز کو حضرت ابوبکرؓ پسند فرماتے وہ خرید لی جاتی۔ چنانچہ اس طرح ایک قمیض اور ایک اوڑھنی' ایک خیبری سیاہ چادر' ایک بنی ہوئی چارپائی' بستر کے دو گدے' ایک صوف کا کپڑا' ایک چمڑے کا مشکیزہ دودھ کے واسطے لکڑی کا ایک مٹی کا ایک کوزا۔ یہ سامان جب آپ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے یوں دعا فرمائی۔

بارک اللہ لاھل البیت۔

(باری تعالیٰ اہل بیت کے لیے برکت عطا فرمائے)

علاوہ ازیں شیعہ سنی ہر دو مکاتب فکر کی کتب مثلاً ذخائر العقبیٰ فی مناقب ذوی القربیٰ بطری التاریخ لامام بخاری' کتاب السنن لسعید بن منصور' مناقب ابن شہر آشوب کشف الغمہ لعلی بن عیسیٰ اربلی' بحار الانوار الملا باقر مجلس وغیرہ میں یہ امر بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ یہ سارا سامان حضرت علی المرتضیٰؓ کی پیش کردہ رقم مہر سے خریدا گیا تھا نہ کہ حضورؐ کے اپنے مال سے۔

انہیں روایات میں مناقت لاخطب خوارزم کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جن سے اچھی طرح مترشح ہوتا ہے کہ یہ سامان "مروجہ سامان جہیز" نہ تھا بلکہ ایک ضرورت تھی جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ حضرت علی المرتضیٰ کہتے ہیں کہ حضورؐ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے ابوالحسن! جاؤ اور اپنی زرہ بیچ کر رقم میرے پاس لا۔

حتی اھیی لک و لا بنتی فاطمۃ مایصلحکما۔

(تاکہ میں تمہارے لیے اور اپنی بیٹی فاطمہ کے لیے وہ سامان تیار کروں جس کی تمہیں ضرورت ہوگی۔)

رابعاً:

قرآن وسنت اور کتب فقہ میں ازدواجی زندگی کی پوری تفاصیل موجود ہیں۔
قرآن نے ہدایات دیں اور صاحب قرآن علیہ التحیۃ والتسلیم نے معاشرے میں ان کی عملی تفسیر فرمائی۔ عہد نبویؐ اور پھر خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ازدواجی زندگی سے متعلق مختلف مسائل سامنے آئے اور ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل بتادیا گیا مثلاً جائز ناجائز رشتے' نکاح طلاق' ظہار' ایلا' لعان' خلع' مفقود النجر' حلالہ' مہر' عورت حضانت' رضاعت تجدید نکاح' عقد ثانی' نان نفقہ وغیرہ' ان تمام مسائل میں جو چیز نظر نہیں آتی وہ مسئلہ جہیز ہے۔ پھر یہ کہ قرون اولیٰ کی شادیوں میں اس کا کہیں وجود نظر نہیں آتا۔
قرآن وسنت' کتب فقہ اور قرون اولیٰ کی شادیوں میں جہیز کا نہ پایا جانا بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ سنت نہیں۔ ورنہ وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ متبع سنت تھے۔

مروجہ جہیز کی معاشی ومعاشرتی خرابیاں:

عموماً رسوم کی ابتداء نیک جذبات' باہمی تعاون اور اعلیٰ مقاصد کے ماتحت کی جاتی ہے لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں بتدریج اسراف' نمائش' تکلف اور ناروا پابندیاں آتی چلی جاتی ہیں جو پورے معاشرے کے لیے کئی ایک مسائل کھڑا کردیتی اور آخر کار اس کے لیے زنجیر پا بن جاتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال رسم جہیز کا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں کے رئیسوں' نوابوں جاگیرداروں' سود خوروں اور رشوت ستانوں نے اپنی بے محنت اور ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کی نمائش اپنی بیٹیوں کی شادیوں پر جہیز کی شکل میں اس طریقے سے کی کہ ان کی دیکھا دیکھی متوسط الحال طبقے کے لوگ بھی ان کے نقش قدم پر چل نکلے اور اب مشرق وسطیٰ اور یورپین ممالک سے آنے والی دولت نے اس نشہ کو دو آتشہ کردیا۔ جہیز کی شکل میں اپنی دولت کی نمائش اور اظہار برتری کی ایک دوڑ لگ گئی ہے ہر شخص دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں ہے۔ جہیز صرف اشیائے ضرورت تک محدود نہیں رہا بلکہ جہیز کے نام پر

سامان تعیش (مثلاً کار' کوٹھی' بنگلہ' فریج' ٹی وی' وی سی آر' اے سی وغیرہ وغیرہ) کے انبار لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ احمد عبدالرحمٰن البنا الساعاتی نے مسند احمد کی مختصر شرح میں جہیز کے معاملے میں موجودہ معاشرے کی سچی تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

وقد اسرف الناس في زماننا فيما لا حاجة اليه من امر الجهاز بقصد التفاخر والمباهاة حتى ان الفقير ليبيع امتعة بيته ويستدين ليجهز اسبنة وهذا احرام فعله.

ہمارے زمانے کے لوگ جہیز کے معاملے میں ایسے اسراف اور فضول خرچی میں پڑ گئے ہیں جس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور مقصود صرف اپنی بڑائی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ فقیر اور غریب آدمی اپنی بیٹی کو جہیز دینے کے لیے اپنے گھر کے سامان تک بیچ دیتا ہے اور قرض کا بار عظیم اٹھاتا ہے حالانکہ اس کا یہ فعل حرام ہے...... اب ذرا آگے بڑھیے اگر ایسا نہیں کرتا ہے تو برادری میں اس کی ناک کٹتی ہے۔ برادری میں اپنا جھوٹا بھرم قائم رکھنے کے لیے' ناک کو اونچا رکھنے کے لیے' اپنے آپ کو مد مقابل سے زیادہ دولت مند دکھانے کے لیے' سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اور لوگوں سے داد حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا' حلال حرام کی تمیز کیے بغیر دونوں ہاتھوں سے دولت کمائی جاتی ہے' بازار رشوت گرم ہوتا ہے' سود خوری کی عادت پڑتی ہے.......... اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کی جاتی ہے' اصل دکھا کے نقل دی جاتی ہے۔ ترازو میں ڈنڈی ماری جاتی ہے۔ میٹر ریڈنگ میں گھپلہ کیا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ بات یہیں تک نہیں رہتی جہیز مہیا کرنے کے لیے لڑکی کو ملازمت کرنی پڑتی ہے۔ وہ عورت جس کا مقام ''وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (اپنے گھروں میں ٹھہری رہو) تھا اس کو دفاتر میں' بینکوں میں' شاپنگ سنٹرز میں غیر محرموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بسوں میں دھکے کھانے پڑتے ہیں آفیسرز کی جھڑکیاں کھانی پڑتی ہیں۔ اور ان میں بعض بے چاری مجبور ہیں اگر ایسا نہیں کرتی ہیں تو سامان جہیز نہیں بنتا اور اگر سامان جہیز نہیں بنتا تو انہیں بطور بیوی کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ بہت سی ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کے ارمانوں کا محض جہیز نہ ہونے کی وجہ سے خون ہوتا رہتا

ہے۔علاوہ ازیں سامان جہیز مہیا کرنے کے لیے اور لوگوں میں اپنا نام اونچا کرنے کے لیے قرض جیسا عظیم بار اٹھایا جاتا ہے۔اور یہ قرض ایسا بار ہے جس سے اللہ کی راہ میں جان دینے والا اور جس کے خون کے قطرے کے زمین پر گرنے سے پہلے ہی سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں وہ بھی بری الذمہ نہیں ۔اور پھر ہمیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین محب الفقرا والغرباء والمساکین ذات نے بھی مقروض کی نماز جنازہ پڑھنے سے گریز فرمایا ہے۔

بسا اوقات جہیز کے لیے قرض اٹھانے والا والد اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور بعد میں اس کی اولاد مدت العمر اس بوجھ تلے کراہتی رہتی ہے۔

والدین کا جہیز دینا درجہ مباح میں ہے

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شادی پر لڑکی کو والدین کا جہیز دینا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔نہ ہی یہ لازمہ نکاح ہے اور نہ ہی یہ سنت ہے۔جہیز کا جملہ سامان مہیا کرنے کا ذمہ دار خاوند ہے۔گھریلو ساز و سامان تو الگ رہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کے لیے خوشبو بھی مہر کی رقم سے منگوائی' یہ سب کچھ تعلیم امت کے لیے تھا ورنہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو احد پہاڑ کو سونا بنا کر فاطمہؓ کے جہیز میں دے دیتے۔اس کے باوجود جب یہ رسم (والدین کا شادی کے موقعہ پر سامان جہیز دینا) ہمارے معاشرے میں آ گئی ہے۔صرف آ ہی نہیں گئی بلکہ جڑ پکڑ چکی ہے دوسرے یہ کہ فطری اور پدری تقاضوں کے مطابق کوئی والد نہیں چاہتا کہ وہ اپنی نور نظر اور لخت جگر کو ہمیشہ کے لیے گھر سے رخصت کرتے وقت بطور نشانی ساتھ کچھ نہ دے تو اس رسم کو چند قیود کے ساتھ ''الاصل فی الاشیاء الالباحۃ'' کے تحت مباح کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔اور ہمارے بعض متاخرین فقہاء نے اس کو اپنی کتابوں مثلاً فتاویٰ عالمگیری اور فتاویٰ شامی وغیرہ میں جگہ دی ہے۔لیکن اس کو حضرت فاطمۃ الزہرا ؓ کی پاک ذات کی طرف منسوب کر کے جو ایک مذہبی تقدس دیا جاتا ہے اور اس مذہبی تقدس کی آڑ میں جو نمود و نمائش اور اظہار دولت کیا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو نیچا

دکھانے اور برتری حاصل کرنے کی جو سعی نامشکور کی جاتی ہے وہ بہر کیف غلط ممنوع خلاف شرع اور خلاف قرآن وسنت ہے۔

چند حدود وقیود:

جس ہندو معاشرے سے یہ رسم آئی تھی وہ تو اس کے بھیانک انجام کو دیکھ کر پابندیاں لگا رہے ہیں اور ہم مسلمان ہو کر اس کو تحفظ اور دوام بخش رہے ہیں۔ ہم نے اسے شادی کا ایک ایسا لازمہ تصور کر لیا ہے جس کے بغیر شادی ہی نہیں ہو سکتی۔ اور جس کی وجہ سے معاشرہ میں کئی ایک معاشی، معاشرتی اور اخلاقی برائیاں جنم لے رہی ہیں اندریں حالات سدِ ذرائع کے طور پر اس سلسلے میں چند پابندیاں ضروری ہیں۔

1۔ جہیز جو عربی لفظ ''جہاز'' کا امالہ ہے اس کے لغوی معنی اور ترکیب میں مایحتاج الیہ (جس کی ضرورت ہوتی ہے) کا مفہوم داخل ہے۔ لہٰذا جہیز میں یہ بات ضروری ہے کہ بقدرے ضرورت وحاجت سامان ہونا چاہیے۔ احمد البناء الساعاتی نے لکھا ہے۔

وفی الباب دلالة علی الا قتصاد فی الجهاز و عدم التوسیع فیه وان یکون علی قدر الحاجة.[50]

(اس باب میں اس بات پر دلالت ہے کہ جہیز میں میانہ روی اختیار کی جائے، خواہ مخواہ اس میں وسعت نہ کی جائے اور یہ کہ بقدر حاجت ہو۔)

بلا ضرورت زیادہ ساز وسامان شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے۔ ایسے سامان کی کیا ضرورت اور کیا فائدہ جس کے استعمال کی زندگی بھر نوبت نہ آئے۔ اور وہ صرف کمروں کی زینت بنا رہے۔ نہ دین کا فائدہ اور نہ دُنیا کا فائدہ۔ اور پھر اس مقصد کے لیے بلا ضرورت اتنا قرض اٹھانے کی کیا ضرورت کہ انسان بعد میں ساری زندگی قرض کے بوجھ تلے کراہتا رہے۔

2۔ شادی کے موقعہ پر سامان جہیز برادری یا اہل محلہ کو دکھانے پر قطعی پابندی لگا دی جائے یہی دکھاوا فساد کی بنیاد ہے۔ اسی سے مسابقت کا جذبہ اور رجحان پیدا ہوتا

ہے۔ والدین آخر اپنی بیٹیوں کو صرف شادی کے موقعہ پر ہی تو نہیں دیتے وہ تو ساری زندگی حسب توفیق اپنی بیٹیوں کو ہدایا و تحائف دیتے رہتے ہیں۔ شادی کے بعد جو کچھ دیا جاتا ہے وہ تو کبھی نہیں دکھایا گیا۔ جب معاملہ یوں ہے تو پھر شادی کے موقعہ پر یہ ساز وسامان دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ پابندی لگ جائے تو پھر اس چیز کی بھی ضرورت نہ رہے گی کہ اتنی مالیت کا جہیز ہو سکتا ہے ورنہ قانوناً جرم ہوگا۔

3۔ جہیز زیورات، کپڑے، فرنیچر، اثاث البیت ظواہر معیشت ہیں۔ اسلام میں معاشی مساوات تو نہیں مگر ظواہر معیشت اور ظاہری بود و باش میں مساوات ضروری ہے۔ اجنبی آدمی کو صحابہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کرنا پڑتا تھا کہ تم میں نبی کون ہے؟ ایک صحابی نے اپنے مکان پر بالا خانہ بنوایا تو اس صحابی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض فرمالیا۔

یہی حال خلفائے راشدین کا تھا۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے موجود ہونے کے باوجود خلیفہ المسلمین اور دیگر عام آدمیوں میں کوئی ظاہری اور نمایاں فرق نہ تھا۔ کوفہ و بصرہ کے شہر آباد کیے گئے تو ہدایت دی گئی کہ تین کمروں سے زیادہ کمروں والا مکان نہ بنایا جائے۔ لہٰذا ظواہر معیشت میں مساوات قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سامان جہیز ہی نہیں بلکہ تقریب نکاح میں شامل مستورات کے زیورات اور ملبوسات میں بھی میانہ روی کو رواج دیا جائے اور لوگوں کے سامنے زیب و زینت اور اکڑفوں سے بچا جائے۔ کیونکہ یہ شیوہ قارون ہے اور قرآن کی زبان میں "و لا تبغ الفساد فی الارض" کے مترادف ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں دنیا کے سامنے تو اپنی ناک اونچی رکھنے کی فکر ہے مگر میدان محشر میں اپنے آقا و مولیٰ کے روبرو ناک اونچی رکھنے کی فکر نہیں۔ وما علینا الا البلاغ

(سہ ماہی منہاج لاہور، جلد 4 شمارہ 3 جولائی 1986ء)

اسلام کے قانون وراثت میں عورت کا حصہ

(ایک جائزہ)

شگفتہ بانو' لیکچرر شعبہ اسلامیات
گورنمنٹ کالج برائے خواتین' باغبانپورلاہور

اسلام نے انسانوں کو جو عادلانہ نظام زندگی عطا فرمایا ہے اس کی خصوصیت میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشرہ کے تمام افراد کی ضروریات اوران کی حیثیات کا خیال رکھا گیا ہے' اسلام معاشرے' کے ہر ایک فرد کے ساتھ مکمل طور پر عدل وانصاف کرنے کا قائل بھی ہے اوراس کا محرک ومؤید بھی۔

اسی ضمن میں اسلام کے قانون وراثت کوبطور مثال پیش نظر رکھا جاسکتا ہے۔ اسلام سے قبل ''عورتوں'' کے لیے وراثت میں حصہ پانے کا تصور بھی موجود نہ تھا۔ بلکہ عورتوں کو حصہ دینے کے بجائے لوگ خود ان کو''مال وراثت'' سمجھ کر ان پر قابض ہوجایا کرتے تھے'

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یا ایھا الذین امنوا لا یحل لکم ان ترثو النساء کرھاً

اے اہل ایمان تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے دراث بن جاؤ۔

اسلام کے قانون وراثت میں ''خواتین'' کو جہاں حصہ دیا گیا ہے وہاں ان کی کفالت اور نان ونفقے کی ذمہ داریاں مردوں کے کندھوں پر عاید کی گئی ہیں۔ اس لیے ان کا حصہ مردوں کے مقابلے میں نصف رکھا گیا ہے۔ اسلام کے قانون وراثت کا یہ پہلو دلچسپ

بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ہم ذیل میں اس کے مختلف پہلوؤں کا ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

1۔وراثت کا لغوی مفہوم:

وارثت کا لفظ ''ارث'' سے مشتق ہے۔ارث کے لغوی معنی ''بقیہ شئی'' کے ہیں۔

چنانچہ وارث کو وارث اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مورث کی موت کے بعد باقی رہتا ہے۔اسی لیے خدا کا ایک نام ''الوارث'' بھی ہے کیونکہ وہ تمام مخلوقات کی فنا کے بعد باقی رہے گا اور لوگ جو کچھ چھوڑیں گے ان سب کا مالک ہوگا۔چنانچہ امام ابن منظور الا فریقی لکھتے ہیں:

الوارث: صفة من صفات الله عزو جل وهو الباقي الدائم الذى يرث الخلائق ويبقى بعد فنائهم والله عزو جل يرث الارض ومن عليها وهو خير الوارثين اى يبقى بعد فنا لكل ويعنى من سواه فيرجع ماكان ملك العباد اليه وحده لاشريك له

''الوارث اللہ عزوجل کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور وہ باقی وقائم رہنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ زمین اور جو کچھ اس پر ہے سب کا وارث ہے اور وہ سب سے بہتر وارث ہے یعنی کل فنا کے بعد باقی رہنے والا اور اس کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور بندوں کی تمام ملکیت اسی وحدہ لاشریک کی طرف لوٹنے والی ہے۔

علامہ وحید الزمان فرماتے ہیں:

ورث یا اولة یا ورثة یا ورله یا تراث.

کا مطلب ہے ترکہ ملنا' تراث ومیراث ترکہ:توریث وارث بنانا یعنی میت کے مال میں سے اس کو کچھ دلانا' ایراث' وارث بنانا توراث ایک دوسرے کا وارث ہونا ہے۔

2۔اصطلاحی مفہوم:

قانون شریعت کی رو سے وارثت سے مراد کسی شخص کی وفات پر اس کے مال

منقولہ وغیر منقولہ کی اس کے وارثوں کی طرف منتقلی ہے' جو حصول ملکیت کے جائز اور قانونی اسباب میں سے ایک قوی سبب ہے:

" الوراثة والارث انتقال قضية الملك عن غيرك من غير عقد ولا مايجرى مجرى العقد وسعتى بذاك المنتقل عن الميت فيقال للقضية المورثه ميراث

الوارثة کے معنی عقد شرعی (بیع وشراء) یا جو عقد شرعی کے قائم مقام ہے' کے بغیر کسی چیز کے ایک شخص کی ملکیت سے نکل کر دوسرے کی ملکیت میں چلے جانے کے ہیں' اس سے میت کی طرف سے جو مال ورثاء کی طرف منتقل ہوتا ہے اس کو میراث کہا جاتا ہے۔

مجموعہ قوانین اسلام کے مرتب ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

وراثت ایک غیر اختیاری انتقال ملکیت ہے' جس کے ذریعہ ایک متوفی کا ترکہ اس کے ورثاء کے حق میں بطریق خلافت (جانشینی) منتقل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ذکاء اللہ صاحب بھی تقریباً یہی معنی ومفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حق وراثت سے مراد وہ حق ہے' جو کسی ایک شخص کو دوسرے شخص کی جائیداد میں یا اس کی جائیداد سے متعلق اس بنا پر پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص صاحب جائیداد کا رشتہ دار یا معاھد ہے۔

دوسرے الفاظ میں اصطلاح میں وراثت سے مراد ہے' کسی شخص کی وفات کے بعد اس کے احوال واملاک کا ترکہ اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جانا۔

اہل فقہ کی اصطلاح میں اس علم کو "علم الفرائض" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نام اسے نبی اکرم ﷺ نے خود عطا فرمایا تھا' جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے:

الحقوا الفرائض باهلها میراث ان کے حقداروں کو پہنچا دو۔

3۔ قبل از اسلام عورت کا وراثت میں حصہ:

قانون قدرت میں اگرچہ مرد اور عورت میں فرق نہیں کیا گیا' عورت بھی اسی

نظام تخلیق سے پیدا ہوتی ہے' جس نظام کے تحت مرد کی تخلیق ہوتی ہے' لیکن جاہلیت کے دور میں مردوں اور عورتوں میں بہت سے مسائل و معاملات میں فرق تھا۔

اس زمانے میں عورت کو وراثت کا حقدار تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ اہل عرب کا کہنا تھا کہ وراثت کا حقدار صرف وہی ہے جو تلوار اٹھائے' یعنی لڑنے کی طاقت رکھتا اور گھوڑے پر سوار ہوسکتا ہو۔ ہر دشمن کا مقابلہ کر کے اس کا مال غنیمت جمع کر سکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ صنف ضعیف یعنی بچے اور عورتیں اس اصول پر پورا نہ اتر سکتی تھیں۔ اس لیے وراثت سے محروم رہتی تھیں' اردو دائرہ معارف اسلامیہ کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

"وراثت کا سبب صرف قتال کے قابل ہونا تھا اور ظاہر ہے کہ چھوٹے بچے اور نساء (عورتیں) قتال کے قابل نہ تھیں اس لیے انہیں ورثہ سے محروم رکھا جاتا تھا۔

مفتی محمد شفیع کے بقول:

"ان کے اصول وراثت کی رو سے صرف جوان بالغ لڑکا ہی وارث ہوسکتا تھا۔ لڑکی مطلق وارث سمجھی جاتی تھی خواہ بالغ ہو یا نابالغ۔ لڑکا بھی اگر نابالغ ہوتا تو وہ بھی مستحق وراثت نہ تھا۔

نہ صرف یہ کہ بیوی اپنے شوہر کی وارث نہ تھی' بلکہ خود حصہ میراث تصور کیجاتی تھی۔ چنانچہ مفتی صاحب مزید لکھتے ہیں:

"عورت جس کے نکاح میں آ گئی وہ اس کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث جس طرح اس کے متروکہ مال کے وارث ہوتے تھے۔ اس طرح اس کی بیوی کے بھی مالک اور وارث جانے جاتے تھے۔ چاہیں تو خود اس سے نکاح کر لیں یا کسی دوسرے سے مال لے کر اس کا نکاح کر دیں۔ شوہر کا لڑکا جو دوسری بیوی سے ہوتا وہ خود بھی باپ کے بعد اس کو نکاح میں لا سکتا تھا۔

اسی طرح ماں اور بیٹی بھی وراثت کی حقدار نہ تھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ قبل از اسلام عرب میں مال کا حقدار صرف لڑکا تھا۔ ماں باپ کو بطور وصیت کچھ مل جاتا تھا۔ مزید فرماتے ہیں کہ میراث کے احکام اترنے کے بعد کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ اچھی

بات ہے کہ عورت کو چوتھا اور آٹھواں حصہ دلایا جا رہا ہے' حالانکہ ان میں سے نہ کوئی لڑائی کر سکتی ہے نہ مال غنیمت لا سکتی ہے۔ اچھا تو تم اس آیت سے خاموشی برتو' ہو سکتا ہے رسول اللہ ﷺ کو یہ آیت بھول جائے یا ہمارے کہنے کی وجہ سے آپ ان احکام کو بدل دیں۔ پھر انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ لڑکی کو اس کے باپ کا آدھا مال دلوا رہے ہیں' حالانکہ وہ گھوڑے پر بیٹھنے کے قابل ہے نہ دشمن سے لڑنے کے۔ آپ بچے کو ورثہ دلوا رہے ہیں بھلا وہ کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

4۔ اسلام کا تصور وراثت اور عورت:

اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے ہر قانون کی طرح وراثت کا قانون بھی ہر پہلو سے کامل ترین قانون ہے جس میں کہیں بھی خواتین کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور آیات میراث کے نزول کا سبب بھی خواتین کو ان کا حق دلانا تھا' چنانچہ مفسرین نے آیات میراث کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ:

نبی اکرم ﷺ کے عہد میں ایک صحابی حضرت اوسؓ بن ثابت کا انتقال ہوا۔ انہوں نے دو لڑکیاں' ایک نابالغ لڑکا اور ایک بیوی وارث چھوڑی۔ مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچا زاد بھائیوں نے آ کر مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کر لیا اولاد اور بیوی میں سے کسی کو بھی کچھ نہ دیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک عورت مطلقاً مستحق وراثت نہ تھی خواہ بالغ ہو یا نابالغ اس لیے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو محروم ہو گئیں لڑکا بوجہ نابالغ ہونے کے محروم کر دیا گیا۔ لہٰذا پورے مال کے وارث دونوں چچا زاد بھائی ہو گئے۔''

حضرت اوسؓ بن ثابت کی بیوی نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچا زاد بھائی جو پورے ترکہ پر قبضہ کر رہے ہیں ان دونوں لڑکیوں سے شادی بھی کر لیں تاکہ ان کی فکر سے فراغت ہو' مگر انہوں نے یہ بھی قبول نہ کیا حضرت اوسؓ بن ثابت کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی اور اپنے بچوں کے بے کسی اور محرومی کی شکایت کی۔ اس وقت تک چونکہ قرآن مجید میں آیات میراث نازل ہوئی تھی' اس لیے نبی اکرم ﷺ نے جواب دینے میں توقف

کیا۔آپ کو اطمینان تھا کہ وحی الٰہی کے ذریعہ اس ظالمانہ قانون کو ضرور بدلا جائے گا۔چنانچہ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر نصیباً مفروضاً

مردوں کے لیے حصہ ہے اس مال میں سے جو چھوڑ گئے والدین اور قرابت والے اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے والدین اور قرابت والے ترکہ تھوڑا ہو یا بہت، معین حصہ ہے۔

اس اقتباس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ دور جاہلیت کی ان رسموں کی جڑیں کتنی گہری تھیں۔

اسلام قانون وراثت ورثاء کو تین درجات میں تقسیم کرتا ہے جن میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ترکہ میں سے حصہ پاتی ہیں۔۔وہ تین درجات یہ ہیں:

1۔ذوی الفروض:

فروض یا فرائض فریضہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ''معینہ'' اس طرح ذوی الفروض سے مراد معینہ حصہ دار ہیں۔

هم اصحاب هذه الانصباء التي بينها الشرع

بقول صاحب اسباب التركات والمواریث ان کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے حصے شریعت نے بیان کیے ہیں:

مولوی فیروزالدین صاحب لکھتے ہیں:

''یہ وہ وارث ہیں جن کا حصہ قرآن حکیم یا حدیث یا اجماع امت سے مقرر ہوچکا ہے۔''

ان کی کل تعداد بارہ ہے، چار مرد اور آٹھ عورتیں، مرد حسب ذیل ہیں۔

باپ، دادا، اخیانی بھائی، اور خاوند۔

عورتیں حسب ذیل ہیں:

بیوی' بیٹی' پوتی' اور اس کے بچے' عینی بہن' پھوپھی' خالہ' ماں اور دادی (نانی)

2۔ عصبات:

عصبات عصبہ کی جمع ہے عصبہ کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

العاصب فی المیراث من لیس لہ فرض مسمی.

یعنی علم المیراث میں عاصب اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کا میراث میں کوئی معین حصہ موجود نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں عصبات ایسے رشتہ دار ہیں' جو ذوی الفروض سے بچا ہوا حصہ پاتے ہیں' چنانچہ اگر اصحاب الفروض میں سے کوئی حصہ دار موجود نہ ہو تو وہ سارے ترکے کا وارث ہوتا ہے۔

عصبات دو طرح کے ہیں عصبات نسبیہ' یعنی ایسے رشتے دار جو نسب کی طرف منسوب ہوتے ہیں' مثلاً بیٹا' باپ' عینی یا علاتی بھائی' چچا' چچازاد بھائی' عصبات سببیہ یعنی ایسے عصبات جن کے ساتھ ولاء العتاقہ (آزاد کرنے کی صورت میں) یا ولاء الموالات ہو۔

ذوالفروض کو مقرر حصہ دینے کے بعد جو بچ رہتا ہے وہ عصبات کا حق ٹھہرتا ہے'

3۔ ذوی الارحام:

''میت کے وہ تمام قرابت دار ذوی الارحام کہلاتے ہیں جو نہ ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات جیسے ماموں خالہ وغیرہ۔

دوسرے لفظوں میں یہ وہ رشتے دار ہیں جن کے حصے قرآن' حدیث و اجماع میں متعین نہیں' مثلاً میت کی بیٹیوں کی اولاد بہنوں کی اولاد بھائیوں کی اولاد ماموں' خالہ اور پھپھیاں' چنانچہ میت کے وارثوں میں سے کوئی ذی فرض موجود نہ ہو تو ان کے بچے ہوئے ترکے کو ذوی الارحام میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

ان تینوں درجات میں عورتیں شامل ہیں۔ اب آیات قرآنی کی روشنی میں

عورتوں کے حصہ وراثت کو دیکھتے ہیں۔ اسلام نے ماں، بہن بیوی، بیٹی الغرض ہر کسی کا حصہ مقرر فرمایا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

1۔ ماں:

ذوالفرض میں شامل ہے اس کو کسی طرح وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی اصل جائیداد میں سے حصہ ضرور پائے گی۔ اگرچہ افراد کی کیفیت مختلف ہونے سے حصہ کم و بیش ہو سکتا ہے، لیکن ملے گا ضرور۔ جیسے کہ اگر متوفی کی اولاد ہو تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، ارشادی باری تعالیٰ ہے:

ولا بويه لكل واحد منهما السدس مماترك ان كان له ولد

اگر متوفی کی اولاد ہو نہ تو والد کو ایک حصہ ملے گا۔

فان لم يكن له ولد وورثه ابراد فلامه الثلث

اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین اس کے وارث ہوں، تو اس کی ماں کو ایک تہائی حصہ ملے گا۔

فان كان له اخوة فلامه السدس.

اگر متوفی کے کئی بھائی ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

2۔ بیوی:

بیوی کا شمار بھی اصحاب الفروض میں کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کی خالص املاک کا آٹھواں حصہ پانے کی حقدار ہے اور اگر مرد ایک سے زائد بیویاں چھوڑ کر مرے تو یہ آٹھواں حصہ ہی تمام بیویاں آپس میں بانٹ لیتی ہیں اور اگر آدمی بے اولاد مرے تو بیوی کا حصہ ایک چوتھائی بنتا ہے، قرآن حکیم میں ہے۔

ولهن الربع مما تركتم ان لم يكن لكم ولد فان كان لكم ولد فلهن الثمن مما تركتم

''اور ان بیویوں کا چوتھائی حصہ ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو ان کا تمہارے ترکہ میں سے آٹھواں حصہ ہے۔''

3۔ بہن:

کہیں عصبہ کے طور پر اپنا حصہ پاتی ہے اور کبھی ذوالفرض میں شامل ہو کر ترکہ کا آدھا حصہ پاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان امرو هلک لیس له ولد وله اخت فلها نصف ماترک وهو یرثها ان لم یکن لها ولد. فان کانتا اثنتین فلهما الثلثن مماترکن کانوا اخوة رجالا ونساء فللذکر مثلا حظ الانثیین

یعنی اگر کسی مرد کا انتقال ہو جائے جو بے اولاد ہے اور اس کی ایک بہن ہو تو ترکہ میں اس کی بہن کا آدھا حصہ ہے۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ترکہ میں ان کا دو تہائی ہوگا۔ اگر بہن بھائی ہوں تو مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

وان کان رجل یورث کلالة او امراة وله اخ او اخت فلکل واحد منهما السدس. فان کانوا اکثر من ذلک فهم شرکاء فی الثلث

"یعنی اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ترکہ بٹتا ہو جو کلالہ (وہ شخص جس کے والدین، اولاد، دادا، پوتا کوئی زندہ نہ ہو صرف بہن بھائی ہوں) اور ماں کی طرف سے اس کا بھائی یا بہن ہے تو ان میں سے ایک کو چھٹا پھر اگر وہ بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔"

یہاں بہن نے بطور عصبہ اپنا حصہ پایا ہے۔

اسی جگہ ارشاد ہے:

یوصیکم اللّٰه فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساء فوق اثنتین فلهن ثلثا ماترک وان کانت واحدة فلها النصف

"یعنی اللہ تمہیں حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے

برابر ہے پھر اگر صرف لڑکیاں ہیں اگر چہ دو سے اوپر تو ان کو ترکہ سے دو تہائی اور اگر ایک لڑکی ہو تو اس کا آدھا ملے گا۔

یعنی متوفی (تارک جائیداد) کی بیٹیاں اپنے بھائی یا بھائیوں کے ساتھ بطور عصبہ وارث ترکہ ہوں گی۔ بیٹی بھائی کی نسبت آدھے حصے کی وارث ہے۔

ان حیثیتوں کے علاوہ بھی عورت دوسری حیثیتوں' مثلاً بحیثیت پدری بہن' اخیافی بہن' پوتی' دادی' نانی' خالہ اور پھوپھی کے طور پر بھی حالات کے مطابق حصہ پاتی ہے۔

مختصراً یہ کہ اسلام نے عورت کو وراثت میں محروم نہیں رکھا' بلکہ ہر پہلو سے اس کا خیال کیا ہے اور حالات و وقت کے مطابق مختلف حیثیتوں میں کم و بیش اس کو حصہ دلایا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل مرد کو تو کسی نہ کسی صورت میں جائیداد سے حصہ مل جاتا تھا۔ لیکن عورت محروم رہتی تھی۔

عورت کا حصہ مرد سے آدھا کیوں؟

اب ہم اسلام میں عورت کے حصہ کا مرد سے آدھا ہونے پر کیے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔ دراصل یہ ہماری کم علمی ہے کہ اسلامی نظام وراثت کا نام آتے ہی اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورت کے ساتھ جنسی تخصیص روا رکھی گئی ہے یا یہ کہ عورت کو آدھے مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مرد کو دو حصے دیئے جائیں اور عورت کو ایک' جب کہ عورت زیادہ قابل رحم ہے اور زیادہ مستحق مال ہے۔ وہ مردوں کی طرح تجارت و زراعت نہیں کر سکتی۔ شوہر کی دست بستہ غلام ہے۔ بچوں کی پرورش کرنے والی ہے' علاوہ ازیں حمل کی گرانی' پیدائش کی تکلیف اور رضاعت کی محنت اسے بالکل ناتواں کر دیتی ہے۔ اس لیے اس پر ہونا تو یہ چاہیے تھا اور اگر زیادہ نہیں تو کم از کم برابر تو ضرور ہی ہونا چاہیے تھا۔

ان سارے اعتراضات کی وجہ دراصل ہماری کم علمی اور ہمارے ہاں عورت کی موجودہ ابتر معاشی حالت ہے اور اس حالت کا سبب اسلامی نظام میراث نہیں' بلکہ ہمارا معاشرہ ہے۔ ہمارے معاشروں میں آج تک عملی زندگی میں عورت کے حق وراثت کو تسلیم

ہی نہیں کیا گیا ہے' عموماً عورتوں کو ان کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے خصوصاً بیٹیاں پرایا دھن سمجھی جاتی ہیں' لہٰذا انہیں بوقت شادی جہیز کی صورت میں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا جاتا ہے اور انہیں خاندانی جائیداد اور وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا' حالانکہ ایسا کرنے والا صریحاً خدا اور رسولؐ کے احکام کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے ارشاد ربانی ہے۔

وما كان لمؤمن ولا مومنة اذا قضى الله ورسوله امراً ان يكون لهم الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالاً مبيناً

اور کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ جب اللہ و رسولؐ کچھ حکم فرما دیں تو انہیں اپنے معاملہ کا کچھ اختیار رہے اور جو کوئی نہ مانے گا اللہ اور اس کے رسول کا حکم وہ بے شک صریح گمراہی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس نظام کی مصالح اور حکمتوں کو کما حقہ سمجھنا' یہ ہماری ناقص و ناتواں عقل سے باہر ہے۔ بایں ہمہ ہمارے خیال میں اس حکم کی مصالح حسب ذیل ہیں۔

1۔ اسلام میں عورت کا حصہ میراث نصف مقرر کرنے میں خدا تعالیٰ کی حکمت عظیم کارفرما ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو دوگنا حصہ اس کی ذمہ داریوں کی وجہ سے دیا ہے کیونکہ زندگی کی زیادہ تر معاشی' تعلیمی اور تربیتی ذمہ داریاں بنیادی طور پر مردوں پر ہیں۔ جن سے عورت بالکل مستثنیٰ ہے بلکہ خود عورت کا اپنا معاشی بار بھی شادی سے پہلے اپنے سرپرست پر رکھا گیا ہے اور شادی کے بعد خاوند یا اس کی اولاد پر' ایسی صورت میں دونوں کو مساوی حصے دینا کسی طرح قرین انصاف نہ تھا' چنانچہ سید محمد قطب اس بارے میں لکھتے ہیں:

"اسلام کا قانون یہ کہ للذکر مثل حظ الانثیین (مرد کا حصہ عورت سے دگنا ہے) بالکل فطری اور منصفانہ تقسیم ہے کیونکہ عورت پر مالی اخراجات کا بوجھ نہیں ہوتا' دوسرے انداز سے دیکھیے کل ورثہ کا ایک تہائی عورت کو صرف اپنی ذات کے لیے ملتا ہے' جبکہ باقی دو تہائی مرد کو دیا جاتا ہے' تاکہ وہ اپنی بیوی' بچوں اور خاندان کی ضروریات پوری کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وراثت کا بیشتر حصہ کس کو ملتا ہے عورت کو یا مرد کو؟

مرد سارے خاندان کی معاشی ذمہ داریاں پوری کرنے کا پابند ہے' اگر وہ بیوی کو نان ونفقہ دینے سے انکار کردے یا آمدنی کے لحاظ سے اس کو خرچ کم دے تو بیوی ذاتی طور پر مالدار اور صاحب حیثیت ہونے کے باوجود بھی اس کے خلاف مقدمہ دائر کر کے نان ونفقہ کا مطالبہ کرسکتی ہے' اس لیے مرد کو سارے گھرانے کا سربراہ ہونے کی وجہ سے جو ذمہ داریاں پوری کرنی پڑتی ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اسے وراثت میں دگنا حصہ دیا جاتا ہے۔

2۔ میراث میں آدھے حصہ کی تلافی بھی اسلام کرتا ہے وہ اس طرح کہ ایک تو بیوی کو شوہر سے مہر دلواتا ہے جو کہ بلاشرکت غیر یصرف اس کا ذاتی حق ہے دوسرا یہ کہ شادی میں جو مال وزیور اور تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں اس کی مالک بھی وہ عورت خود ہی ہوتی ہے۔ اس طرح اگر اس کے پاس کوئی جائیداد وغیرہ ہے تو وہ صرف اس اکیلی خاتون کا حق ہے کوئی اسے اس کے خاوند یا بچوں پر خرچ کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا جبکہ مرد قانوناً اپنے حصہ کے مال ودولت کو دوسروں پر خرچ کرنے کے لیے مجبور ہے۔ محمد قطب لکھتے ہیں:

''اگر کوئی عورت صاحب جائیداد ہو تو اس کا خاوند اس کی مرضی کے بغیر اس سے یہ جائیداد نہیں لے سکتا ہے۔''

ماں باپ کی طرف سے ملنے والا ورثہ بھی ذاتی طور پر اسے مل جاتا ہے۔ اور اسے اپنے بچوں یا شوہر کی کفالت بھی نہیں کرنی پڑتی۔

3۔ ان دو پہلو سے قطع نظر جہاں اسلام نے محض رشتہ کا خیال کیا ہے وہاں عورت اور مرد دونوں کو مساوی درجہ دیا ہے مثلاً میت کی اولاد کی موجودگی میں والدین کے حصے یکساں رکھے گئے ہیں۔ یا اخیافی (ماں جائے بہن بھائی) کے حصوں کے درمیان بھی اسلام نے کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

4۔ اس سلسلہ میں ایک اور حکمت یہ بھی ہے کہ شریعت نے یہ اصول پیش کیا ہے۔

الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھی لاولی رجل ذکر

حقوق کو اصحاب حقوق تک پہنچاؤ اور جو کچھ باقی رہے تو وہ قریبی رشتہ دار مرد کا ہے۔

اسلام نے مرد پر مالی بارڈالنے کے ساتھ رجال خاندان کے درمیان تعاون و

تناظر کے ضابطے بھی مقرر کیے ہیں۔ یہ ضابطے نہ صرف اخلاقی اہمیت کے حامل ہیں' بلکہ انہیں قانونی اور دستوری حیثیت بھی حاصل ہے۔ اگر ایک شخص افلاس کا شکار ہو جائے تو رجال خاندان میں نسبتاً جو اس سے قریب تر ہو گا اس پر سب سے زیادہ مالی تعاون اور کفالت کی ذمہ داری ہو گی۔

5۔ قانون وراثت میں اصل اہمیت چونکہ نسب کو دی جاتی ہے اس لیے اس ضابطہ کے تحت ضروری نہیں کہ مرد کو زیادہ ہی حصہ ملے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک عورت مورث سے قریبی تعلق رکھتی ہو اور اس مرد سے زیادہ حصہ پائے جو مورث کا دور کا رشتہ دار ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت اپنے خاندان (والد' والدہ' بھائی' بہن وغیرہ) سے بھی وراثت میں حصہ پاتی ہے' اور اپنے خاوند کے خاندان (خاوند' اپنے بیٹے بیٹیوں وغیرہ) سے بھی اس طرح اس کے لیے تلافی کی ایک صورت بہر حال موجود ہے۔

باہیں ہمہ شریعت اسلامیہ کے پورے قانون میں' معاشی' معاشرتی اور قانونی ذمہ داریاں چونکہ زیادہ تر مرد پر ہی عائد کی گئی ہیں' اس لیے عورت کو مرد کے مقابلے میں اکثر اوقات نصف حصہ یا نصف رقبہ دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر وراثت' دیت اور قانون شہادت وغیرہ میں' عورت ہر جگہ مرد کے مقابلے میں نصف حصے کی مالک ہے۔ مگر اس کا مطلب عورت کے درجے اور رتبے میں کمی ہرگز نہیں' بے شمار دوسرے مواقع پر عورت کا درجہ زیادہ مساوی رکھا گیا ہے۔ مثلاً علم عمل اور اخروی اجر و ثواب کے حصول میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے' جبکہ خدمت و اطاعت میں اولاد کے لیے والدہ کا درجہ زیادہ ہے۔ اولاد میں سے دختری اولاد کی پرورش تربیت اور نگہداشت پر' لڑکوں کی نسبت زیادہ اجر و ثواب ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے عورت کا درجہ مرد سے بڑھا دیا ہے۔ اس طرح شریعت نے دونوں کے مابین توازن اور اعتدال قائم رکھا ہے' جو کہ صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہے۔

عورت کی تعلیم و تربیت

حافظ محمد سعد اللہ ریسرچ اسٹنٹ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تعلیم انسان کے لیے جملہ ظاہری و باطنی کمالات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ بلکہ اس کے فی الحقیقہ انسان بننے کے لیے بنیادی اور لازمی حیثیت کی حامل ہے۔ زیور علم سے عاری اور محروم آدمی بلاشبہ زمین پر چلتا پھرتا مردہ ہے۔ مصر کے جدید عربی شاعر احمد شوقی نے اس چیز کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے۔

الناس صنفان موتی فی حیاتھم

والاٰخرون ببطن الارض احیاء

ترجمہ: انسان دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو زندگی میں مردہ ہیں اور دوسرے وہ جو زیر زمین چلے جانے کے بعد بھی زندہ ہیں۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خالق عالم نے تخلیق انسان کے ساتھ ہی اس کی تعلیم کا بندوبست بھی فرمایا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا. (البقرۃ 31)

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو نام سکھلائے کل کے کل۔

جب نیر اسلام طلوع ہوا اور نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ روحی) پر وحی نازل ہوئی تو اس کا آغاز ہی قرات اور علم و قلم سے ہوا۔ پھر مختلف طریقوں سے متعدد مقامات پر قرآن مجید میں حصول علم اور تعلیم کی ترغیب اور ہدایات دی گئیں۔ قرآن کریم میں جہاں انعامات الٰہی کا ذکر ہے وہاں سرفہرست اسی تعلیم کا بیان ہے۔

قبل از اسلام صنفِ نازک کی زبوں حالی:

یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز سفر مرد اور عورت کے باہمی اتحاد سے ہوا۔ اسی اتحاد کی بدولت نسل انسانی بڑھی اور اسی باہمی اتحاد و تعاون سے علم و فن' صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن کا ارتقاء ہوا۔ کیونکہ مرد انسانیت کے ایک حصہ کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرے حصہ کی ترجمانی عورت کرتی ہے۔ ہم ایسی کسی سوسائٹی کا تصور نہیں کر سکتے جو تنہا مردوں پر مشتمل ہو اور جس میں عورت کی ضرورت نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے یکساں محتاج ہیں۔ نہ عورت' مرد سے مستغنی ہو سکتی ہے اور نہ مرد' عورت سے بے نیاز۔

اتنی بات ضرور ہے کہ مرد اور عورت کی استعداد اور صلاحیتیں جدا گانہ' ان کی دلچسپیاں مختلف اور ان کے فرائض کے دائرے الگ الگ ہیں۔ عورت اپنے ناخن تدبیر سے نسل انسانی کی پرورش تو کر سکتی ہے لیکن ہل چلا کر اپنی معاش فراہم کرنے اور تیر و تفنگ سے دشمن کا مقابلہ کرنا اس کے لیے دشوار ہے کیونکہ قدرت نے اس کو آہنی اور قوی بازو نہیں عطا کیے البتہ وہ اپنے سینے میں مہر و الفت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات رکھتی ہے چنانچہ ہمیشہ بچوں کی دیکھ بھال' گھر کا انتظام' کھانے پینے اور کپڑے کی تیاری عورت کے فرائض رہے ہیں اور جانوروں کا شکار' زراعت' تجارت اور دشمن کی مدافعت مرد نے کی ہے۔

لیکن عورت اور مرد کی قوت اور صلاحیتوں کا یہ فرق تاریخ کے بیشتر ادوار میں عزت اور ذلت کا معیار بن گیا۔ مرد زور اور قوت رکھتا تھا اور ایسے کام با آسانی کر گزرتا تھا جن کو عورت اپنی حد استطاعت سے باہر سمجھتی تھی اس لیے اس کو رافع و اعلیٰ سمجھ لیا گیا اور اس کے مقابلے میں عورت کی حیثیت فروتر قرار پائی۔ چنانچہ جو ممالک دنیا میں متمدن و مہذب شمار ہوتے تھے اور عدل میں مشہور تھے جہاں شب و روز اخلاق کے درس دیئے جاتے اور انسانی حقوق کی تعلیم ہوتی تھی وہاں بھی مرد کی برتری ایک مسلمہ حقیقت تھی اور عورت کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کو جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا

تھا حتیٰ کہ بعض اوقات اس کو ان حقوق سے بھی محروم رکھا گیا جن سے زمین پر رہنے والا ہر متنفس بہرہ مند تھا۔

یونان' روم' یہودیت' عیسائیت' ہندومت اور عرب میں عورت کے متعلق نظریات اور اس کی معاشرتی بے حیثیتی' بے کسی' لاچاری اور مظلومیت کی داستان سنائی جائے تو ہر سلیم الفطرت انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں۔ صرف جاہلی عرب معاشرہ میں عورت کی حالت مولانا حالی کی زبان میں ملاحظہ فرمایئے۔

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھر دیکھتی جب کہ شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

اسلام میں عورت کا مقام:

اسلام انسانیت کے لیے سراپا خیر خواہی اور رحمت ہے۔ اسلام نے انسان ہونے کے ناطے سے مرد اور عورت کو برابر قرار دیا۔ کسی مرد کو محض مرد ہونے کی بنا پر اسلام میں کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر عورتوں کے ساتھ حسن سلوک' ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ' ان کے اموال کی حفاظت' وراثت میں ان کی شرکت' ہمیشہ ان سے درگزر' ان کے بارے میں صبر و تحمل سے کام لینے اور مقدور بھر انہیں بہترین رہائش' کھانا اور لباس مہیا کرنے کے بارے میں ہدایات ارشاد ہوئیں۔ عورتوں سے متعلقہ مسائل اور احکام کے بارے میں مستقل سورتیں نازل ہوئیں۔

قرآن کے بعد صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس صنف انسانی کو قعر

ذلت سے نکال کر وہ رفعت و بلندی عطا فرمائی جس سے بڑھ کر کسی رفعت و بلندی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ تمام سابقہ ادیان اور اقوام عالم نے عورت کو منبع معصیت مجسم پاپ' قابل صد نفرت' شیطان' گناہ اور پتہ نہیں کیا کچھ سمجھ رکھا تھا مگر محبوب مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رحمۃ للعالمینی سے اس مظلوم و مقہور صنف انسانی کو اپنی محبوب ترین متاع قرار دیا۔ فرمایا

حُبّب الیّ من الدنیا النساء والطیب و جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ.

دنیا کی تمام چیزوں میں مجھے عورت اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

مختصر یہ کہ قرآن و حدیث میں حقوق نسواں کو اتنی وضاحت اور شدومد سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

تعلیم اور عورت:

اسلام نے عورت کو جہاں دیگر مراعات اور حقوق میں مرد کے برابر ٹھہرایا وہاں اسے تعلم و تعلیم کا بھی پورا پورا حق دیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

عَلَّمَ الِاِ نْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ .

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔

خَلَقَ الِاِ نْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ .

رحمٰن نے انسان کو پیدا فرمایا اور اسے بیان (گویائی) کی تعلیم دی۔

ان آیات مبارکہ میں بغیر تخصیص مرد کے انسان کا ذکر فرمایا اور لفظ انسان میں مرد اور عورت دونوں داخل ہیں۔ دوسرے قرآن و حدیث کے خصوصی اسلوب بیان میں عموماً یہی ہوتا ہے کہ احکام مردوں کے بیان ہو رہے ہوتے ہیں مگر ضمناً عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ایک قاعدے کے طور پر فرمایا:

حکم المرئۃ حکم الرجل کماھو مطر دفی جل الاحکام

حیث یدخلن مع الرجال بالتبعیة الا ماخصه الدلیل .

عورت کا حکم بھی مرد ہی والا حکم ہوتا ہے جیسا کہ اکثر احکام میں ہوا ہے کیونکہ عورتیں مردوں کے ساتھ تبعاً شامل ہوتی ہیں الا یہ کہ کوئی دلیل مردوں کو خاص کر دے۔

اس کلیے کے تحت کتب احادیث میں وارد فضیلت علم سے متعلقہ تمام احادیث جس میں زیادہ تر مذکر کے صیغے استعمال ہوتے ہیں' ان میں عورتیں بھی شامل ہوں گی علاوہ ازیں متعدد احادیث میں مستقل طور پر عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق ارشاد فرمایا گیا۔

بخاری شریف میں ہے۔

قال مالک بن الحویرث قال لنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ارجعوا الیٰ اھلیکم فعلموھم

حضرت مالک بن الحویرث کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا۔
اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ جاؤ اور انہیں (دین کی) تعلیم دو۔

اہل سے مراد عام طور پر بیوی ہی ہوا کرتا ہے۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا؟

وَعُبِّرَ بِاَھْلِ الرَّجُلِ عَنْ اِمْرَاَ ءِتِہٖ.

آدمی کے ''اہل'' سے مراد اس کی بیوی ہوتی ہے۔

تعلیم نسواں پر اجر و ثواب:

شریعت نے کہیں بھی عورتوں کے لیے تعلیم پر پابندی نہیں لگائی اور نہ ہی تعلیم کے میدان میں ان کی حوصلہ شکنی کی گئی بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کے واسطے والدین کو ترغیب دلائی گئی اور اس پر ان کے لیے عظیم اجر و ثواب کی بشارت سنائی گئی۔ والدین کا اپنی بچیوں کی تعلیم کے سلسلے میں اخراجات اٹھانا' محنت و مشقت برداشت کرنا اور سعی و فکر کرنا یوں ہی رائیگاں نہ جائے گا یہ بیچاری صنف نازک تو اپنے والدین کے احسان کا کیا بدلہ چکائے گی البتہ ان کا رب ان کے والدین کو اس نیکی پر بہترین صلہ عطا فرمائے گا۔ کنز العمال کی ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من کانت له ابنة فادبھا واحسن ادبھا وعلمھا فاحسن تعلیمھا

فاوسع علیها من نعمه اللّٰه التی اسبغ علیه کانت له منعة وسترا من النار.

جس شخص کے ہاں کوئی بیٹی ہو پھر وہ اسے بہترین آداب سکھائے اور عمدہ ترین تعلیم دے اور مقدور بھر اس کے ساتھ حسن سلوک کرے تو وہ بیٹی اس کے لیے جہنم کی آگ سے چھٹکارے کا باعث بنے گی۔

ابوداؤد شریف میں ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من عالم ثلاث بنات فادبهن و زوجهن و احسن الیهن فله الجنة.

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا جس نے تین بیٹیوں کی پرورش کی پھر انہیں (پڑھایا) سکھایا' ان کی شادیاں کردیں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔

ان احادیث شریفہ سے منشائے نبوی یہ لگتی ہے کہ والدین اپنی لڑکی سے کم نفع کی وجہ سے (کیونکہ وہ تو پرایا مال ہے) ان کی تعلیم وتربیت سے غافل نہ ہوں۔ اور اگر عورتیں جاہل اور غیر تربیت یافتہ رہ گئیں تو معاشرہ کے اکثر افراد کے ان پڑھ ہونے اور غیر مہذب وغیرہ شائستہ ہونے کا سبب بنیں گی۔ چنانچہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے عورت کی تعلیم وتربیت کی ترغیب دی۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں جن کے واسطے باری تعالیٰ نے دوہرا اجر مقرر فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک آدمی درج ذیل ہے۔

ورجل کانت عنده امهة یطاهافادبها فاحسن تادیبها و علمها فاحسن تعلیمها ثم اعتقها فتنرو جهافله اجران.

ترجمہ: اور وہ آدمی جس کے ہاں کوئی لونڈی ہو جس سے وہ وطی کرتا ہو۔ اس آدمی نے اس لونڈی کو بہترین آداب زندگی سکھائے اور اسے اعلیٰ تعلیم دی۔ پھر اسے

آزاد کر کے اس سے شادی کر لی تو ایسے آدمی کے لیے دو اجر ہوں گے۔

ایک لونڈی کی تعلیم و تربیت تو بخاری شریف کے ترجمۃ الباب (باب تعلیم الرجل امتہ و اھلہ) اور حدیث سے ثابت ہے۔ آزاد بیوی کی تعلیم و تربیت اس روایت پر قیاس کرتے ہوئے ثابت ہوگی۔ کیونکہ

الاعتناء بالاھل الحرائر فی تعلیم فرائض اللّٰہ وسنن رسولہ اکدمن الاعتناء بالاماء۔

آزاد بیویوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے فرائض اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی تعلیم کا اہتمام کرنا زیادہ ضروری ہے لونڈیوں کی تعلیم کے اہتمام سے۔

دوسرے یہ کہ لونڈی کی تعلیم و تربیت پر دوگنا ثواب ہے تو آزاد بیوی کی تعلیم، تربیت پر بدرجہ اولیٰ دوہرا اجر ہوگا۔

اولاد میں ترجیحی سلوک خلاف شرع ہے:

شریعت میں تمام اولاد (لڑکے اور لڑکیوں) کے ساتھ مساویانہ برتاؤ ضروری ہے، خوراک، لباس تحائف عطیے اور دیگر حقوق میں اولاد کی برابری والدین کے لیے شرط ہے۔ ورنہ یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔ قلبی میلان انسانی طاقت سے باہر ہے اس پر کوئی باز پرس نہیں جہاں تک ظاہری معاملات کا تعلق ہے ان میں کسی لڑکے یا لڑکی کو دوسروں پر بلاوجہ ترجیح دینا خلاف شرع ہے۔

مسند احمد میں ہے:

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر کہتے ہیں میرے والد (بشیر نے مجھے بطور ہبہ کوئی چیز عطا کی۔ میری والدہ نے ان سے کہا کہ اس ہبہ پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بناؤ چنانچہ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور عرض کی یا رسول اللہ! اس لڑکے کی ماں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اسے بطور ہبہ کچھ دوں چنانچہ میں نے اس کے نام ہبہ کر دیا۔ اب کہتی ہے کہ میں اس ہبہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بناؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا

تمہاری کوئی اور اولاد بھی ہے؟ والد صاحب نے عرض کیا: ہاں آپؐ نے پوچھا کیا تو نے تمام کو اسی طرح ہبہ کیا ہے۔ جس طرح اس لڑکے کو کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں "فرمایا تب مجھے اس پر گواہ نہ بنا کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ تمام اولاد کا تجھ پر یہ حق ہے کہ تو ان میں برابری کرے۔"

والدین اپنی اولاد کے واسطے جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں یا جو کچھ انہیں دیتے ہیں' اس میں سب سے عمدہ عطیہ "تعلیم وتربیت" کا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

مانحل والد ولده افضل دین ادب حسن

(اچھے ادب (تعلیم وتربیت) سے افضل کوئی شے باپ اپنے بیٹے کو نہیں دیتا)

لہٰذا اس بہترین عطیہ (تعلیم وتربیت) سے لڑکیوں کو نوازنا اور بیچاری لڑکیوں کو محروم رکھنا دین اور عقل ہر دو اعتبار سے ناانصافی ہے اللہ کے عادل اور منصف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ساووابین الاء که فی العطیة فلو کنت مفضلا احد الفضلت النساء

عطیہ میں اولاد کے درمیان برابری کرو۔ اگر کسی کی تفصیل یا ترجیح جائز ہوتی تو میں عورتوں کو افضل اور لائق ترجیح قرار دیتا۔

ایک روایت میں فرمایا:

نز کنت مؤثر ااحدا علی احدلاً ثرت النساء علی الرجال .

اگر میں کسی کو کسی پر ترجیح دیتا تو عورتوں کو مردوں پر ترجیح دیتا۔

تعلیم نسواں۔ایک دینی ضرورت:

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ دینی تعلیمات اور احکام اسلامی جاننے کی جتنی ضرورت مسلمان مردوں کو ہے' اتنی ہی مسلمان عورتوں کو بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں دین کے اصول وکلیات کا احترام یا اتباع احکام کا مطالبہ صرف مسلمان مرد سے ہی نہیں بلکہ عورت سے بھی کیا گیا ہے۔ اور اس مطالبہ کی تکمیل کی سوائے اس کے اور کوئی شکل نہیں کہ وہ قرآن

وسنت اور دینی تعلیمات سے پوری طرح واقف ہو۔

سورۃ الممتحنہ کی آیت نمبر 12 میں مومن عورتوں سے جن باتوں شرک' چوری' زنا' بہتان تراشی اور اولاد کو قتل نہ کریں گی وغیرہ) کا اقرار کرایا گیا ہے ان میں ایک چیز ہے وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ ۔(وہ کسی بھی معروف حکم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہیں کریں گی) یہ بظاہر اچھا چھوٹا سا فقرہ ہے۔ مگر عورت کو معاشرہ میں انتہائی ذمہ دار اور جواب دہ بنا دیتا ہے۔ اور مجبور کرتا ہے کہ وہ قدم قدم پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے بچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا ڈھونڈ ے۔ یقیناً اسی احساس ذمہ داری اور احساس جوابدہی نے صحابیات رضوان اللہ علیہن اجمعین کو دین کے معاملے میں بڑا نڈر بنا دیا تھا۔ دینی مسائل کو سمجھنے میں عورت کی فطری شرم وحیا کے لیے مانع نہ تھی۔ وہ بے دھڑک حضور صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی ان کی تشفی فرماتے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا صحابیات کے فہم دین کے جذبہ خیر کو یوں بیان فرماتی ہیں۔

نعم النساء نساء الانصار لم يمنعهن الحياء ان يتفقهن في الدين.

انصاری عورتیں کیا خوب عورتیں ہیں! دین کے سمجھنے کے سلسلے میں حیاء ان کے آڑے نہیں آتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو تدریجاً احکام شرعیہ کا مکلف فرما رہے تھے۔ وحی الٰہی کے نازل ہونے یا آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات وتعلیمات کا کوئی معین وقت اور کوئی خاص مقام نہ تھا۔ مسجد میں' بازار میں' میدان جنگ میں' سفر میں' حضر میں' عام مجلس میں' شادی بیاہ کے موقع پر' غمی اور مرگ کے موقعہ پر غرض دن رات میں موقع محل اور ضرورت کی مناسبت سے احکام الٰہی نازل ہو رہے تھے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تشریح فرما رہے تھے۔ ان مواقع میں بہت سے مواقع ایسے ہوتے تھے جہاں عورتیں حاضر نہیں ہوتی تھیں یا ہو نہیں سکتی تھیں۔ اس طرح عورتیں براہ راست لسان نبوی علیٰ صاحبہ التحیۃ والتسلیم سے نکلی ہوئی تعلیمات اور فرمودات کے محروم رہتیں۔ تعلیمات سے آگاہی اپنی جگہ

اور بلاواسطہ کلام نبوت سننے کا لطف وسرور اور کیف اور مزہ اپنی جگہ۔ بالواسطہ کوئی حکم معلوم کرنے میں لطف اور لذت کہاں جو بلاواسطہ حکم نبویؐ میں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ صحابیات نے بارگاہ نبویؐ میں اس امر کی شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے مستقل علیٰحدہ ایک دن تعلیم کے واسطے مقرر فرمائیں۔ رؤف ورحیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست کو پذیرائی بخشی اور ایک دن مقرر فرمایا۔ بخاری شریف میں ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال قالت النساء للنبی صلی اللہ علیہ غلبنا علیک الرجال فاجعل لنا یوماً من نفسک فوعد ھن یوما لقیھن فیہ فوعظھن و امر ھن الخ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عورتوں (صحابیات) نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ مرد ہمارے مقابلے میں آپؐ پر غالب ہیں (یعنی آپ کا اکثر وقت مردوں ہی میں گزرتا ہے اس طرح ہم عورتیں آپ کی تعلیمات اور فرمودات سے محروم رہتی ہیں) لہٰذا ہمارے لیے آپؐ ایک علیحدہ دن مقرر فرمائیں (جس میں ہم حاضر ہو کر آپ سے مستفید ہو سکیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرمایا۔ وعدے کے مطابق اس دن آپؐ ان عورتوں سے ملے۔ انہیں وعظ ونصیحت فرمائی اور انہیں (صدقہ کا) حکم فرمایا۔

دین واحکام شرعیہ سے واقفیت آپ کی ضرورت کے علاوہ یہ چیز بھی مدنظر رہے کہ جتنے اور جو اخلاقی اوصاف مردوں میں پائے جا سکتے ہیں وہ عورتوں میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ بعض مستورات رفعت وبلندی کے اس درجہ اور مقام تک پہنچیں کہ اکثر مردان کی گرد راہ کو بھی نہیں چھو سکتے تھے۔

نہ ہر مرد مرد است نہ ہر زن زن است

قرآن مجید کی سورۃ الاحزاب' آیت نمبر 35 ان المسلمین و المسلمات والمومنین والمومنات میں جو اخلاقی اوصاف وخصائل مردوں کے بتائے گئے ہیں بعینہ وہی اوصاف وخصائل عورتوں کے بھی شمار کیے گیے ہیں۔ لہٰذا ہر اعتبار سے ضروری ہے

کہ جہاں مردوں کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کیا جائے وہاں ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم وتربیت کا بھی اہتمام ہوتا کہ انسانی معاشرہ مطلوبہ نتائج حاصل کر سکے۔

تعلیم عورت کا حق ہے:

بقول ابن خلدون علوم وفنون کی تحصیل انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اس نے عورت کو حصول علم کا پورا پورا حق دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے اسی فطری ودینی حق کے پیش نظر متعدد مواقع پر مردوں کو حکم فرمایا اور ترغیب وتلقین فرمائی کہ وہ عورتوں کو دینی تعلیم اور قرآن وسنت سے روشناس کرایا کریں)

چنانچہ حضرت مالک بن حویرثؓ کہتے ہیں کہ ہم چند نوجوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دین سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے بیس دن رہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ ہمیں گھر جانے کی جلدی ہے تو فرمایا:

ارجعوا الیٰ اھلیکم فقیمو افیھم وعلمو ھم ومرو ھم .

اپنے بیوی بچوں کی طرف لوٹ جاؤ' ان ہی میں رہو' ان کو دین کی باتیں سکھاؤ اور ان پر عمل کا حکم دو۔

بعض اوقات آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو قرآن مجید کے خاص خاص حصوں کی طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی (عورتوں کو ان کی تعلیم دیں) مثلاً سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتوں میں ایمانیات اور اصول دین سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا

ان اللّٰہ ختم سورۃ البقرۃ بایتین اعطیتھما من کنزہ الذی تحت العرش فتعلموھن وعلموھن نساء کم .

بلاشبہ اللہ نے سورۃ بقرہ کو ایسی دو آیتوں پر ختم کیا ہے جو مجھ کو اس مخصوص خزانہ سے دی گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے۔ پس تم خود بھی ان کو سیکھو اور اپنی عورتوں کو بھی سکھاؤ۔

اسی طرح کا ایک حکم نامہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل کوفہ کو لکھا تھا:

علموا نساء کم سورۃ النور .

اپنی عورتوں کو سورۃ نور کی تعلیم دو۔

مختصر یہ کہ حصول تعلیم عورت کا فطری، دینی اور قانونی حق ہے۔ مذکورہ ارشادات نبوی محض ترغیبی اور اخلاقی نوعیت نہیں رکھتے بلکہ ان کے پس پردہ ضابطہ اور قانون کی زبان بول رہی ہے۔

طریقہ تعلیم:

جب یہ بات متعین ہو گی کہ حصول تعلیم عورت کا حق ہے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طریقہ تعلیم کیا ہونا چاہیے؟ اپنے اپنے گھروں میں انفراداً عورتوں کو تعلیم دی جائے یا مدارس میں بصورت اجتماعی؟

انفرادی طور پر گھروں میں بچیوں کو تعلیم دینے پر تو کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ مگر ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں کہ وہ اپنی بچیوں کی تعلیم و تربیت کا گھر پر بندوبست کر سکے۔ رہا یہ مسئلہ کو بچیاں گھر سے باہر کسی مدرسہ میں اجتماعی طور پر علم حاصل کریں تو یہ شریعت میں جائز ہے اور اس کی ایک نظیر خود دور نبویؐ میں ملتی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں **هل يجعل للنساء يوما علىحدة** کا باب قائم کر کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ عورتوں کا گھر سے باہر کسی جگہ جمع ہونا اور علم حاصل کرنا جائز ہے۔ اور نقل کیا ہے کہ عورتیں ایک جگہ جمع ہوئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے اور انہیں ضروری امور کی تعلیم دی۔

مگر گھر سے نکلنے میں شرعی حدود اور آداب کا پاس ضروری ہوگا۔ اسلام عورت کو گھر سے باہر زیب و زینت، بننے سنورنے اور بے پردگی کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

مخلوط تعلیم:

مخلوط تعلیم شرعی نقطہ نظر سے جائز نہیں۔ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط ممنوع ہے۔ مرد اور عورت کا آزادانہ اجتماع کئی مفاسد، خرابیوں اور فتنوں کے دروازے کھولنے کا باعث بنتا ہے۔ بھلا آگ اور روئی کا اتحاد کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ شریعت نے عورت کو تعلیمی دینی اور سماجی کاموں کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے مگر اس شرط

کے ساتھ کہ ایک تو وہ بناؤ سنگھار کر کے نہ نکلنے دوسرے مردوں کے ساتھ اس کا اختلاط اور آزادانہ میل جول نہ ہو۔

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور مردوں کو خلط ملط ہوتے دیکھا تو عورتوں کو حکم دیا۔

استاخرن فانه ليس لكن ان تحققن الطريق عليكن بحافات الطريق.

پیچھے ہو جاؤ کیونکہ تمہیں درمیان راستہ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمہیں راستے کے کنارے کنارے چلنا چاہیے۔

امام نووی فرماتے ہیں مختلف احادیث کی بناء پر علماء نے کہا ہے کہ عورت کو مسجد جانے کی اجازت اسی وقت دی جائے گی جب کہ۔

ان الا تكون مطيبة و لا متنسر ينهة و لاذات خلاخل يسمع صوتهاو لا لياب فاخرة و لامختلطة بالرجال و لاشابة و نحو ها ممن يفتتن بها.

وہ خوشبو لگائے ہوئے نہ ہو زیب و زینت سے آراستہ ہو ایسے پازیب نہ پہنے ہوئے ہو جن کی جھنکار سنائی دے' بھڑ کیلے لباس میں ملبوس نہ ہو مردوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو۔ جوان یا ایسی حالت میں نہ ہو جس سے وہ فتنے کا باعث بنے۔

ابن الھمام فرماتے ہیں:

وحيث ابحنا لها الخروج فانما يباح بشرط عدم الزينة وتغيير الهيئة الى مالا يكون داعية الى نظر الرجال والا ستمالة.

جب عورت کے لیے گھر سے باہر نکلنے کو ہم جائز قرار دیتے ہیں تو یہ جواز اس شرط کے ساتھ ساتھ ہے کہ وہ زیب و زینت کے ساتھ نہیں نکلے گی اور ایسی ہیئت میں ہوگی جو مردوں کو دیکھنے اور مائل ہونے پر نہ ابھارے۔

مرد اور عورت کے عدم اختلاط کے ضروری ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی بیعت کے وقت کسی عورت کے ہاتھ

میں ہاتھ نہیں دیا۔ عورتوں کی بیعت کپڑے کے واسطے سے لی جاتی تھی۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اختلاط کے سلسلے میں اتنی احتیاط فرمار ہے ہیں تو ماوشما کہاں۔ علاوہ ازیں متعدد احادیث' اقوال صحابہ اور آراء فقہا ہیں جو مرد اور عورت کے اختلاط کے ناجائز ہونے پر دال ہیں۔ لہٰذا مغرب کی تقلید میں مخلوط تعلیم کا سلسلہ بند ہونا چاہیے اور لڑکیوں کے واسطے الگ مدارس قائم ہونے چاہئیں جہاں ان کی ہم جنس معلمات ہی ان کو تعلیم دیں' ان کی تربیت کریں اور دیگر نگرانی کے امور سرانجام دیں۔

•

تربیت:

شریعت میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی بڑا زور دیا گیا ہے۔ فرائض نبوت میں جہاں کتاب وحکمت کی تعلیم ہے وہاں نفوس کا تزکیہ وتصفیہ بھی شامل ہے۔ اخلاق اور اوصاف حسنہ سے عاری صاحب علم اس چوپائے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جس پر کتابوں کا ڈھیر لاد دیا جائے۔ بہر حال بچیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی تربیت بھی نہایت ضروری ہے۔ تربیت ہی انسان کو عالی ہمتی' بلند حوصلگی اور شرافت واخلاق کے فاخرہ لباس سے طبوس بناتی ہے۔ جس علم سے انسان' انسان نہ بنے' اس کے اطوار وعادات نہ سدھریں' عورت ہے تو وہ عفت اور پاکدامنی کا مرقع نہ بنے تو ایسی تعلیم سے تو جہالت ہی بھلی ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اس علم کو ارباب نظر موت

عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت اور اخلاقی اصلاح کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہو وہ سبھا کی پری نہ ہو

علم کا تعلق محض لوازم حیات ہی سے نہیں بلکہ مقاصد حیات سے بھی ہے۔ اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے۔ مسلمانوں

کے مخصوص نظام تعلیم میں تعلیم اور سیرت سازی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور اس کا اظہار "علم وفضل" کی اصلاح سے بھی ہوتا ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے اولاد کی اخلاقی تربیت نہ کرنے کو قتل کے مترادف قرار دیا ہے' فرماتے ہیں۔

قتل اولاد کا جرم اور سخت گناہ ہونا جو اس آیت **ولا تقتلوا اولادکم** میں بیان فرمایا گیا ہے وہ ظاہری قتل اور مار ڈالنے کے لیے تو ظاہری ہے اور غور کیا جائے تو اولاد کو تعلیم وتربیت نہ دینا جس کے نتیجے میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت کی فکر سے غافل رہے' بداخلاقیوں اور بے حیائیوں میں گرفتار رہے یہ بھی قتل اولاد سے کم نہیں جو لوگ اپنی اولاد کے اعمال واخلاق کے درست کرنے پر توجہ نہیں دیتے ان کو آزاد چھوڑتے ہیں یا ایسی غلط تعلیم دلاتے ہیں جس کے نتیجے میں اسلامی اخلاق تباہ ہوں وہ بھی ایک حیثیت سے قتل اولاد کے مجرم ہیں ظاہری قتل کا اثر تو صرف دنیا کی چند روزہ زندگی کو تباہ کرتا ہے یہ قتل انسان کی اخروی اور دوامی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچیوں کی تعلیم اور تربیت دونوں پر یکساں توجہ کیجائے تا کہ آئندہ چل کر وہ بچوں کی بہترین اولین درسگاہ ثابت ہوں۔

تعلیم وتربیت نسواں اور تربیت اولاد:

عورتوں کی تعلیم وتربیت اس لیے بھی حد درجہ ضروری ہے کہ آئندہ انہیں بچوں کی تربیت کرنا ہے۔ ماں کے لیے شرعی نقطہ نگاہ سے بھی بچوں کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا لازمی ہے اور اس سلسلے میں وہ جوابدہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

المرة راعية علىٰ بيت بعلها وولده وهي مسئولة عنهم.

عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بال بچوں کی نگران ہے اور بچیوں کے بارے میں (بروز قیامت) اس سے باز پرس ہوگی۔ عام مشاہدہ یہی ہے کہ ماں اور گھریلو ماحول جتنا پاکیزہ ہوتا ہے اکثر اولاد اتنی ہی صالح' متقی' فرمانبردار اور ملک وملت کے لیے

مفید ثابت ہوتی ہے۔ چھوٹے اور معصوم کے بچے نرم ٹہنی کے مانند ہوتے ہیں انہیں جدھر موڑتے جائیں ادھر مڑتے جاتے ہیں۔ امام غزالی نے لکھا ہے:

ترجمہ: ”بچہ اپنے والدین کے ہاں بطور امانت ہوتا ہے۔ اس کا پاکیزہ قلب ہر قسم کے نقش اور صورت سے خالی نفیس جوہر ہوتا ہے۔ اس پاکیزہ قلب پر جو کچھ نقش کر دیا جائے وہ اسے قبول کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ اور جس طرح اسے مائل کریں ادھر مائل ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بھلائی کی عادات اور اچھے اخلاق واطوار کا عادی بنایا جائے تو اس میں اچھے اخلاق واطوار راسخ ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ دنیا وآخرت میں سعادت مند قرار پاتا ہے اور اگر اسے بری عادات اور اخلاق ذمیمہ کا عادی بنایا جائے تو وہ انہی چیزوں کا خوگر ہو جاتا ہے نتیجۃً دنیا وآخرت میں ہلاک ہوتا ہے۔“

غرضیکہ اولاد کی صحیح خطوط پر تربیت کے لیے ماں کا تعلیم وتربیت یافتہ ہونا لازمی ہے۔

درحقیقت عورت کا اصل روپ اور اس کی اصل معراج اس کا ماں ہونا ہے عورت کا فرض فیکٹریوں میں اشیاء کی پیداوار نہیں بلکہ انسانیت سازی ہے۔ وہ نوع انسانی کی تکثیر اور اس کی حفاظت تربیت کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اسی میں اس کی عظمت ہے۔ یہ امر نا قابل تردید ہے کہ اقوام کا عروج ان کی ماؤں کے فیض کا نتیجہ ہوتا ہے یہ مقام تفصیلات کا متحمل نہیں ورنہ اسماء الرجال اور سوانح کی کتابوں کو اگر دیکھا جائے تو ائمہ مجتہدین، مفسرین ومحدثین، فقہاء کرام، علماء وفضلا اور صوفیہ کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جن کا علم وفضل، طہارت وتقویٰ شہرت اور ناموری زیادہ تر ان کی ماؤں کی محنت اور تربیت کی مرہون منت ہے۔ اگر ان کی ماؤں کی مخلصانہ تربیت ان کے شامل حال نہ ہوتی وہ تو یقیناً مراتب پر فائز نہ ہو سکتے۔ درحقیقت مائیں ہی کسی قوم کی تقدیر کا فیصلہ کرتی ہیں۔

خنک آن ملتے کز وار داتش
قیامت ہا بہ بیند کائناتش
چہ پیش آید چہ پیش افتادورا
تواں دید از جبین امہاتش

مسلمان خواتین کی علمی خدمات

سید غلام مصطفیٰ بخاری عقیل درس جامعہ نظامیہ رضویہ

عورت شجر انسانیت کی جڑ ہے کہ انا خلقنا کم من ذکر و انثی نے یہی حقیقت آشکارا کی ہے۔

عورت رونق بزم کائنات ہے کہ زین للناس حب الشھوات من النسآء (الایۃ) میں مذکور سامان ہائے دلبستگی میں سرفہرست ہے۔

عورت سامان تسکین روح ہے کہ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا کا مصداق ہے عورت عظیم ہے کہ دنیا کے ہر عظیم انسان کو اس کی گود نے پروان چڑھایا۔

مگر............انسانی معاشرے نے اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا؟

یہی کہ............باوجود یکہ معاشرہ نہ تو اسے پیدائشی غلام سمجھتا تھا نہ پیدائشی غلام تھی پھر بھی ظہور اسلام تک ہر ملک میں اور ظہور اسلام کے بعد علی الخصوص ان ممالک میں جو ضیاء اسلام سے منظور ہو سکے اس کے ساتھ غلاموں سے بدترین سلوک کیا جاتا رہا اسے کوئی حق دینا تو درکنار اس کے حق میں کوئی آواز تک بلند کرنے کا روادار نہ تھا بلکہ ہر ایک اس کی عزت و احترام کے گراف کو نیچے لانے میں دوسرے سے سبقت لے جانے پر کمربستہ تھا۔

عارف تمہی نہیں ہو محنت میں خستہ حال
اس راستے میں اور بھی آشفتہ سر ملے

جاہل معاشرے تو ایک طرف اپنے وقت کے مہذب ترین اور تہذیب و تمدن کے گہوارہ معاشروں میں عورت کس حالت سے دوچار تھی اس کی تصدیق حسب ذیل چند اقتباسات سے ہو سکتی ہے۔

عورت یونان میں

یونان جس کے علم وفضل کی آج بھی دنیا معترف ہے اور علم وفضل میں ایک دنیا کا جورہنمار ہا ہے لیکن یہ فضل وکمال اسے عورت کی حالت سدھارنے پر آمادہ نہ کرسکا۔

لقمان ارسطو۔افلاطون۔اور جالینوس کی سرزمین میں عورت کی حالت یہ تھی۔

یونانی عورت کو ایک کمتر درجہ کی مخلوق سمجھتے تھے اگر کسی عورت کا بچہ خلاف فطرت پیدا ہوتا تو اسے مار ڈالتے۔

اسپارٹا میں اس بدنصیب عورت کو جس سے کسی قومی سپاہی کے پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی مار ڈالتے جب کسی عورت کا بچہ ہو چکتا فوائد ملکی کی غرض سے اسے دوسرے شخص کی نسل لینے کے لیے اس کے خاوند سے عاریتاً لے لیتے تھے اور خاوند مرتے وقت جس کے حق میں چاہے بیوی کے متعلق وصیت کرسکتا تھا اور وہ اس کی ملکیت ہو جاتی تھی۔

یونان جو گہوارہ علم وفضل تھا وہاں عورتوں کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تھا۔(مدارس صرف مردوں کے لیے قائم کیے جاتے تھے)اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک بڑا حق ہوتا جو خواتین کو دیا جاتا مگر وہ تو خواتین کے لیے ان کی ذات تک میں کوئی حق تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے بلکہ:

”عورت کی شادی اس کی مرضی کے بغیر کردی جاتی بعض اوقات تو باپ مرتے وقت اپنی بیٹی کی کسی کے حق میں وصیت کر جاتا تو بیٹی کو وہ وصیت پوری کرنا پڑتی تھی بھائی کی موجودگی میں وراثت سے محروم رہتی اکیلی ہوتی تو وارث بنتی مگر ایسی صورت میں اس کے لیے ضروری ہوتا کہ باپ کے ورثا میں سے سب سے بڑے کی بیوی بنے اور اس سے جو بچہ پیدا ہو وہ نانا کی طرف منسوب ہو کر اس وراثت کا حق دار بنے۔

حتیٰ کہ افلاطون کا خیال تھا کہ عورت اور غلام دونوں ایک ہی درجے کی مخلوق ہیں۔

عورت روم میں

روم جو اپنے دور کی سپر پاور اور متمدن ترین سلطنت تھی اس میں خواتین کا عالم یہ تھا۔ مرد کی حکومت اپنی بیوی پر جابرانہ تھی جس کا معاشرت میں کوئی حصہ نہ تھا اور شوہر کو پورا حق اس کی جان پر بھی حاصل تھا۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مرد کو یہ حق حاصل تھا کہ جب چاہے بیوی کو طلاق دے جب چاہے اسے بیچ دے اور ہر چھوٹی غلطی سے لے کر بڑی غلطی تک (اسلامی اصطلاح میں قابل حد فعل کی سزاء کا مکمل اختیار خاوند کو حاصل تھا حکومت کا کوئی اختیار نہ تھا۔

عورت یہود کے نزدیک

یہودیوں کے ہاں یہ بھی اثاث البیت جیسی شئ تھی جس کی وجہ سے باپ کو اپنی بیٹی کو بیچ دینے کا اختیار تھا خاوندوں کے اختیارات بھی جابرانہ تھے۔

عورت بعض حالات میں ملک کی ملکیت قرار دی جاتی یا قوم کی ملکیت ہوتی جس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ ان کے ہاں ہر شخص کا نام اسرائیل میں باقی رہنا ضروری تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے عورت کی خواہشات اور عزت نفس کی کوئی حیثیت نہ تھی انہوں نے تمام ایسی خواتین کے لیے جن کے خاوند بے اولاد فوت ہو جائیں لازم قرار دے رکھا تھا کہ:

اگر چند بھائی اکٹھے رہتے ہوں اور ان میں سے کوئی بے اولاد فوت ہو جائے تو اس کا نکاح کسی دوسرے آدمی کے ساتھ نہ کیا جائے بلکہ اس کے شوہر کا بھائی اس سے خلوت کرے اسے اپنی بیوی بنائے اور بھاوج کا حق اسے ادا کرے تو یوں ہوگا کہ پہلا بچہ جو پیدا ہوگا وہ متوفی بھائی کے نام منسوب ہوگا تا کہ اس کا نام اسرائیل سے نہ مٹ جائے۔

اگر یہ شوہر بننے سے انکار کردے تو اس کے بھائی کی بیوی ججوں کے سامنے اس کے نزدیک اپنے پاؤں کی جوتی نکالے اور اس کے منہ پر تھوک دے اور کہے کہ اس شخص کے ساتھ جو اپنے بھائی کا گھر نہ بنائے یہی کیا جائے گا اور اس کا نام یہ رکھا جائے کہ یہ اس شخص کا

گھر ہے جس کا جوتا نکالا گیا ہے۔

عورت عیسائیت میں

دین عیسوی میں ابتداً تو عورت کا مقام قدرے بلند تھا جس کا اندازہ حضرت عیسیٰ کے اولین اعلان وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبار اشقیا سے ہوتا ہے کہ دین عیسوی میں عورت کو باوقار مقام دینا مطلوب تھا۔

دین عیسوی کی ابتدائی تعلیمات بھی اس بات کی عکاس ہیں مگر کچھ عرصہ بعد ان کی یہ حیثیت مجروح ہونا شروع ہوئی پہلے تو ترتولیاں (نے جو مسیحیت کے اولین ائمہ میں سے ہے) نے عورت کے متعلق کہا۔

وہ شیطان کے آنے کا دروازہ شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی اور خدا کے قانون کو توڑنے والی خدا کی تصویر مرد کو غارت کرنے والی ہے۔

بعد میں کلیسا نے عورت کی حیثیت کو یہاں تک گرادیا کہ:

581ء میں ائمہ کلیسائی کی مجلس منعقدہ کولون میں اس بات پر زوردار بحث ہوئی کہ عورت انسان بھی ہے یا نہیں بڑی ردو قدح کے بعد اسے معمولی اکثریت کے ساتھ انسان تسلیم کیا گیا۔

انسان تو اسے مانا لیکن کس قماش کا اس کے لیے حسب ذیل اقتباس کافی ہے۔

عیسائی عورت کو نجاست کی پوٹ، سانپ کی نسل، منبع شر برائی کی جڑ جہنم کا دروازہ وغیرہ کے القابات سے یاد کرتے تھے۔

عورت اور ہندومت

ہندو معاشرے میں تو عورت کی حالت بہت قابل رحم تھی اور بالکل اچھوتوں کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی جناب محمد عبدالحی کے الفاظ یہ ہیں۔

عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے۔ بیوہ عورت قانونی طور پر ہر لذت سے عمر بھر محروم کر دی جاتی سماج کے لیے ایسے ہی شرمناک برتاؤ کی وجہ سے ایک عورت شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جل جانا گوارا کر لیتی تھی۔ لڑائی میں ہار جانے کے ڈر سے عورتوں کو خود ان کے باپ بھائی اور شوہر قتل کر دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

علاوہ ازیں عورت کی عصمت اس قدر ارزاں تھی کہ ہندوؤں کے ہاں آٹھ قسم کے نکاح قانونی ہیں جن میں ...... گاندھرب...... راکشش ...... پیشاچ ......بھی شامل ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

گاندھرب ۔ بے قاعدہ بے موقع کسی وجہ سے دولہا دلہن کا مرضی سے میل ہونا راکشش جبراً چھین کر اغواء کر کے یا فریب ۔ کے ذریعہ لڑکی حاصل کر لینا پیشاچ' سوئی سوئی' مدہوش یا پاگل لڑکی سے قضائے حاجت کرنا۔ نیوگ' نکاح کے بعد اگر کسی وجہ سے اولاد نہ ہو تو ہندوں کے ہاں اسکے لیے بھی ایک قانونی راستہ ہے۔ (اولاد حاصل کرنے کا) جس کو نیوگ کہا جاتا ہے۔

''اولاد نہ ہونے کی صورت میں خسر وغیرہ کے حکم سے عورت رشتہ دار یا دیور سے حسب دلخواہ اولاد حاصل کرے۔''

مجموعی تصویر' ہندوؤں کے ہاں مجموعی اعتبار سے عورت جن خوبیوں کی حامل سمجھی جاتی تھی وہ یہ تھیں۔

تقدیر' طوفان' موت' جہنم' زہر' زہریلے سانپ' ان میں سے کوئی بھی اس قدر خراب نہیں جتنی عورت ہے۔

عورت یورپ میں:

قرون وسطٰی میں جو ظہور اسلام ۔ سے جدید یورپ تک کے ادوار کو کہا جاتا ہے ان میں جب کہ اسلامی ممالک میں خواتین علم و فضل کے دریا بہا رہی تھیں حقوق کے اعتبار سے

ایک بلند مقام حاصل کر چکی تھیں جس کی تفصیل آئندہ آتی ہے یورپ میں عورت کی حالت کچھ یوں تھی۔

یورپ میں خاوند کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ جب چاہے اپنی بیوی کے گلے میں رسی ڈال کر بازار میں بیچ آئے۔

نطشے جدید دور کے یورپ کا مایہ ناز فلسفی زرتشت کا نام لے کر کہتا ہے کہ عورتیں دوستی کے قابل نہیں وہ محض بلیاں ہیں یا زیادہ سے زیادہ گائیں عورتیں صرف جنگجو مردوں کا دل بہلانے کے لیے اس کے نزدیک اس دل کو بہلانے میں عورتوں کو کوڑے سے مارنا ضروری ہے وہ لکھتا ہے کہ عورت کے پاس جاتے وقت اپنا کوڑا نہ بھولئے۔

نطشے نے تو اسے پھر بھی مرد میدان لوگوں کی دلبستگی کا سامان قرار دیا جس میں کچھ وقار ہے جرمن تو اسے ہر ایک دلبستگی کا سامان قرار دیتے تھے جرمن عورت کو بیچنا مہمانوں کو بطور تحفہ پیش کرنا اور وصیت کر کے کسی دوسرے کی مملوک بنانا جائز سمجھتے تھے۔

یورپ میں جو حقوق عورتوں کو اب حاصل ہوئے یہ انہوں نے کتنی مشکل سے حاصل کیے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جائے کے جب ووٹ تک کا حق جو قرون اول سے ہی خواتین اسلام کو حاصل رہا ہے یورپ کی عورتوں نے اتنی مشکل سے حاصل کیا تو باقی حقوق کا کیا حال ہے:

یورپ میں عورتوں کو بڑی مشکل سے ووٹ کا حق ملا 1928 میں انگلینڈ میں ووٹ کا حق مانگنے کے جرم میں ایک عورت کو گھوڑے سے کچل کر مار ڈالا گیا۔

سوئٹیزرلینڈ جیسے ملک میں یہ حق 1971ء میں مل سکا جب کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان کے انتخاب کے دوران مدینہ کی عورتوں سے بھی مشورہ لیا صلح حدیبیہ میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی ام سلمہ کے مشورہ پر عمل کیا۔

زمانہ جاہلیت میں عورت

گزشتہ اوراق میں اپنے وقت کے مہذب ترین معاشروں میں عورت کی حیثیت

کا تذکرہ کیا گیا ہے اسی سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب متمدن معاشروں کا یہ عالم تھا تو عرب جو جہالت میں ضرب المثل تھے اور پورے جزیرہ میں صرف ستر مرد اور عورتیں لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کے ہاں عورت کا کیا مقام رہا ہوگا۔ کتب تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عورت عرب میں کسی بھی حیثیت میں قابل احترام نہ تھی لیکن جب وہ بیٹی یا بیوی ہوتو اس کی بیچارگی کی داستان تو بہت طویل ہو جاتی تھی۔

اس موضوع پر اگرچہ بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر خوف طوالت کی بناء پر چند اقتباسات عورت کی حالت کے متعلق ملاحظہ ہوں۔

بچی کی حیثیت میں عرب عورت جب بچی ہوتی تو اولاً تو وہ زندہ درگور کردی جاتی تھی جیسا کہ بے شمار احادیث میں ایسے واقعات بیان ہوتے ہیں اور قرآن کریم نے بھی واذا لمؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت ۔ سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اگر کہیں زندہ درگور کرنے کا رواج نہ تھا تو وہاں بھی اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ اس کی پیدائش پر باپ کا رنگ فق ہو جاتا اور شرم کے مارے کئی کئی دن لوگوں سے چھپا رہتا اور اس سے جان چھڑانے کی تدبیریں کرتا رہتا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

اذا بشر احدهم بالا نثیٰ ظل وجهه مسوداً وهو کظیم یتواریٰ من القوم من سوء مابشر به ایمسکه علی هون ام یدسه فی التراب

ترجمہ: جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو سارا دن اس کا چہرہ بے رونق رہتا اور وہ دل میں کڑھتا رہتا ہے تو قوم سے اس خبر کی بنا پر چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ آیا ذلت برداشت کر کے اسے زندہ رکھے یا اسے مٹی میں گاڑ دے۔ بہن کی حیثیت میں۔ جب بیٹی باپ کے لیے اس قدر باعث عار او ننگ ہو تو ایسے میں کوئی بھائی کیونکہ بہن کے وجود کو باعث فخر قرار دے سکتا تھا۔

بیوی کی حیثیت میں:

عورت بیوی کی حیثیت میں سب سے زیادہ مظلوم تھی چنانچہ جہاں اس کو لاتعداد

سوکنوں اور طلاقوں کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا وہاں اس کی تذلیل کے ہزار ہا سامان مہیا کیے گئے تھے مثلاً جس خاوند کو ماں باپ اور معاشرہ عورت کی عزت وعصمت کا محافظ گردانتا ہے اس کے ہاں بیوی کی قدر ومنزلت کچھ یوں تھی کہ:

اپنی منکوحہ بیوی سے مرد کہتا ہے کہ تو پاکی حاصل کرنے کے بعد فلاں مرد کے پاس چلی جا اور اس سے فائدہ حاصل کرا تنی مدت شوہر اپنی اس عورت سے علیحدہ رہتا جب تک اس کی عورت کو غیر مرد کا حمل ظاہر نہیں ہو جاتا ایسا جاہلیت میں اس لیے کرتے تھے کہ لڑکا نجیب ہو۔

بیوی سامان تجارت:

جب عرب میں کوئی چیز ادھار ہوتی اور ضمانت مانگی جاتی تو یہ لوگ بیویوں کو گرو رکھ دیا کرتے تھے۔ جیسے کہ کعب بن اشرف نے محمد بن مسلمہ سے غلہ ادھار مانگنے پر کہا:

ارھنونی نساء کم قالوا کیف نرھنک نساء ناوانت اجمل العرب

ترجمہ: تم اپنی بیویوں کو میرے پاس گروی رکھو انہوں نے کہا کہ ہم اپنی بیویوں کو تمہارے پاس کیسے گروی رکھیں جب کہ تم عرب کے خوبصورت ترین مرد ہو اندازہ کیجئے جب خاوندوں کا یہ عالم ہو تو دوسروں کا کیا حال ہوگا۔

بیوی ٹھوکر کا پتھر:

بیویوں کے ساتھ اسی سلوک پر بس نہ کرتے اس کو طرح طرح سے تنگ کرتے کئی کئی بار طلاق دے کر بقصد ایذاء پھر رجوع کر لیتے بیوہ کو بغیر مال دیئے نکاح ثانی کی اجازت نہ دیتے مہر چھڑانے کے لیے بیوی پر غلط کاری کا الزام لگا دیتے لونڈی ہوتی تو اس سے پیشہ کروا کر دولت حاصل کرتے ان کے ان تمام افعال کی گواہی قرآن کریم نے ان کی ممانعت کر کے دی ہے'

ماں کی حیثیت میں:

اگرچہ ماں کی حیثیت سے عورت کو ہر معاشرہ قابل احترام سمجھتا تھا مگر صرف حقیقی ماں کو لائق تعظیم گردانتا تھا باپ کے عقد میں آنے والی دوسری عورتیں مال وراثت کی طرح تقسیم کی جاتی تھیں ابوبکر جصاص کے الفاظ یہ ہیں۔

وقد كان نكاح امراة الاب مستضيضاً شائعاً في الجاهلية

عورت وراثت سے ہر حیثیت میں محروم تھی جیسا کہ ثابت بن قیس کی بیوی کی بارگاہ رسالت میں شکایت سے اندازہ ہوتا۔

اسلام کا ظہور اور عورت

گزشتہ سطور میں جو کچھ آپ نے پڑھا یہ مشتے نمونہ از خروارے کے قبیل سے ہے ان حالات میں اسلام نے عورت کی حالت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور حقیقت یہ ہے کہ ان حالات کے برعکس عورت کو فرش سے عرش تک پہنچا دیا اسلام نے عورت کی معاشرت' معاش' اقتصاد' اور تمدنی حالات میں زبردست اصلاحات کیں اگرچہ مرد کی برتری کو اسلام نے چیلنج نہیں کیا لیکن عورت کے حقوق کے سلسلہ میں اسے اتنی جکڑ بندیوں میں کس دیا کہ عورت کو خود بخود اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا میرا موضوع چونکہ علمی خدمات ہے لہٰذا میں اپنے موضوع کے مناسب صرف علمی خدمات کا تذکرہ کروں گا۔

معاشرے میں اہل علم کا مقام

ہر زندہ معاشرے میں سب سے بلند معاشرتی حیثیت اصحاب علم کی ہوتی ہے۔ جہاں علم شرف انسانیت ہے وہاں انسانیت کی تمام تر ترقی اہل علم کی کاوشوں کی مرہون منت ہے۔

اسلام جس کی پہلی وحی ذکر قلم اور پڑھنے سے شروع ہوئی اس کے ہاں تو اہل علم کا معاشرتی مقام اور بھی بلند ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ان کے مرتبہ رفیع کو یوں بیان فرمایا۔

ویرفع اللّٰہ الذین امنوا والذین اوتوا لعلم درجات

ترجمہ: اللہ سے اس کے بندوں میں۔ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔

حصولِ علم اور خواتین

چونکہ اسلام کا مقصد عورت کی معاشرتی حیثیت کو بلند سے بلند تر کرنا تھا لہٰذا اسلام نے معاشرتی مراتب میں اس سب سے بڑے مرتبے کے حصول کے لیے عورت کو پورا حق دیا اور اسلام کو اس سلسلہ میں نہ صرف اولیت بلکہ انفرادیت حاصل ہے کہ اس نے عورت کو حصول علم کا نہ صرف حق دیا بلکہ اس پر بھی حصول علم کو مردوں کی طرح فرض قرار دیا۔

اطلبوا لعلم ولو کان بالصین فان طلب العلم فریضة علی کلم مسلم و مسلمة .

لونڈیوں تک کو تعلیم دینا آپ نے باعث ثواب قرار دے کر عورت کو زیور علم سے آراستہ کرنے کی ترغیب دلائی۔ جب صحابہ نے اپنی بیویوں کو مسجد نبوی میں آنے سے روکا اور آپؐ تک یہ شکایت آئی تو آپؐ نے فرمایا۔

اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے مت روکو۔ اس پر بس نہیں کی بلکہ جب آپؐ نے محسوس کیا کہ خواتین یہاں کما حقہ استعفادہ نہیں کر سکتیں تو آپؐ نے ان کے لیے ایک دن مخصوص فرمایا۔

اس دن آپ خواتین کے سوالوں کے جواب دیتے اور ان کے حالات کے مطابق انہیں وعظ نصیحت فرماتے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا تھوڑے ہی عرصہ میں تعلیم یافتہ خواتین کی بہت بڑی کھیپ تیار ہوگئی جس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ علامہ ابن حجر نے الاصابہ میں قرون اولیٰ کی صرف جن محدث خواتین کا تذکرہ کیا ہے ان کی تعداد پندرہ سو تینتیس ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں یورپین اور مسلم خواتین کا تقابلی جائزہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد مسلم خواتین کی شاندار علمی ترقی کا اندازہ کرنے سے قبل قرونِ وسطیٰ (از ظہور اسلام تا انقلاب فرانس) کی یورپین خواتین کی علمی حالت کا مختصر جائزہ لیا جائے تا کہ اسلام کے بعد میدان علم میں مسلم خواتین کی ترقی کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل اقتباسات علماء مغرب کے پیش خدمت ہیں قرون وسطیٰ کے لوگوں نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا کہ عورت کو مطلق کوئی اختیار نہیں دیا کسی طاقت ورکا تو سوال ہی نہیں تھا اگر کچھ اختیار تھا تو یہ کہ وہ گھر داری کے تنگ دائرہ میں پھنسی رہے۔

اس نقطہ نظر کو انسائیکلو پیڈیا آف ایجوکیشن میں ذرا تفصیل سے یوں بیان کیا گیا ہے۔فرانسکوڈا ابار برینو کے نزدیک امیر زادی کو نوشت وخواند کی اجازت محض اس وجہ سے دی گئی تھی کہ وہ بالغ ہو کر اپنی جدائیداد کی دیکھ بھال کر سکے۔ جہاں تک دیگر معززین اطباء ججوں اور دیگر شرفاء کی لڑکیوں کا سوال ہے وہ کافی بحث مباحثہ کے بعد یہ طے کرتا ہے کہ بہتر ہے وہ لکھنا پڑھنا نہ سیکھیں علاوہ بریں تاجروں اور اہل حرفہ کی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی قطعاً ممانعت تھی۔

اے برام انگلستان میں قرون وسطیٰ کی حالت یوں بیان کرتا ہے۔

مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعلیم کو کچھ بھی اہمیت حاصل نہ تھی اور رشد بد کے علاوہ ان سے کچھ توقع نہ تھی۔

لارڈ لینڈری کا نانٹ صرف یہ چاہتا ہے کہ۔

اس کی لڑکیاں کچھ پڑھنا سیکھ لیں اس کے خیال میں لڑکیوں کو مدرسہ میں اس لیے داخل کیا جائے کہ وہاں دین کی اچھی اچھی باتیں سیکھ لیں اور اسطرح اپنے فرائض اچھی

طرح جان لیں اور بری باتوں سے بچی رہیں۔

علاوہ ازیں عام معاشرے کا ذہن لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق یہ خیال تھا۔

لوگ اپنے وصیت ناموں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ رقم نہیں چھوڑتے تھے بلکہ بجائے اس کے شادی کے اخراجات کے لیے وصیت کیا کرتے تھے غالباً اکثر والدین اس بات سے مطمئن تھے کہ ان کی بیٹی تھوڑی سی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے امور خانہ داری میں کافی مہارت رکھتی ہو اور اس میں ایک اچھی بیوی بننے کی صلاحیت موجود ہو۔

ان تمام اقتباسات کی روشنی میں اگر یورپ کی عورت کو قرون وسطیٰ میں زیادہ ہی پڑھی لکھی شمار کیا جائے تو اس سے زیادہ نہیں ہوگی کہ وہ ابتدائی درجے کی تعلیم سے ہی آراستہ تھی اعلیٰ تعلیم اور علم عالیہ نہ اسے پڑھانے کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی نہ اسے ان کا علم تھا۔

مسلم خواتین کی اسلامی عہد میں علمی ترقی

قبل ازیں مذکور ہوا کہ ظہور اسلام سے قبل عورت تمام حقوق سے کلیتاً محروم اور تعلیم سے ناآشنا تھی اسلام کی خواتین کے متعلق فراخدلانہ معاشرتی تعلیمی اور جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواتین ہمہ قسم حقوق سے بہرہ اندوز ہونے اور حقوق میں مداخلت پر خلیفہ تک کو ٹوکنے کی جرات کرنے کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں نہ صرف لکھنے پڑھنے کے قابل ہوگئیں بلکہ بعض تو علم و فضل کے اس مقام رفیع پر فائز ہوگئیں تھیں کہ فحول علماء سے بھی سبقت لے گئیں خواتین صحابیات کی صفوں میں حضرت عائشہؓ بھی شامل تھیں جو ایسی زبردست عالمہ بن گئی تھیں کہ آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

کے آدھا علم عائشہ سے حاصل کرو۔

اسلام کے علوم شرعیہ جو امت تک پہنچے ان کے ابلاغ میں اکیلی حضرت عائشہ کا اتنا حصہ ہے کہ بقول ابن حجر۔

فاکثر الناس اخذو اعنھا ونقلو اعنھا من الاحکام والاداب شیئاً

كثيراً حتى قيل ان ربع الاحكام الشرعية منقول عنها رضى الله عنها.

اس دور میں جب عورتوں کی تعلیم کی کوئی باقاعدہ درس گاہ قائم نہ تھی بلکہ پوری دنیا عورت کو تعلیم یافتہ بنانے کے خلاف تھی اس وقت میں حضرت عائشہ مندرجہ ذیل علوم میں مہارت تامہ رکھتی تھیں۔

علم القرآن علی الخصوص وغیرہ' حلال' حرام' فرائض علم حدیث' علم فقہ' شعر ادب علم الانساب میں اخبار ایام واحادیث عرب اور طب وغیرہ۔

حضرت عائشہ کی ان علوم میں مہارت کی انفرادی مثالیں آئندہ سطور میں ملیں گی مجموعی مہارت کا یہ عالم تھا کہ عروہ بن زبیر کا کہنا ہے۔

ما رايت احداً اعلم بالقران ولا لفرائضه ولا بحلال ولا بحرام ولا بشعر ولا بحديث العرب ولا النسب من عائشة وما اريت اعلم بفقه ولا طب من عائشه.

ایک حضرت عائشہ ہی کا کیا ذکر یہاں تو تمام اُمہات المومنین اور صحابیات کی ایک بڑی تعداد علم وفضل کے بلند پایہ مقام کی حامل تھی چنانچہ جہاں حضرت عائشہ کے تلامذہ حدیث میں سے 88 افراد کے نام کتب میں درج ہیں وہاں پر حضرت ام سلمہ کے بھی 33 تلامذہ کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت ام درداء کے متعلق جہاں تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا کہ:

كانت ام الدرداء تجلس فى صلواتها جلسة الرجل و كانت فقيهة

وہاں حضرت فاطمہ بنت قیس کے مرتبہ علم وفضل کو یوں بیان کیا ہے کہ:

وہ حضرت عمرؓ اور عائشہؓ سے ایک فقہی مسئلہ پر عرصہ تک بحث کرتی رہیں لیکن وہ ان کی رائے نہیں بدل سکے اس سے بھی آگے یہ کہ امت کے بہت سے ائمہ نے انہی کی رائے کو ترجیح دی۔"

صحابیات کی مجموعی اعتبار سے اگر علمی ترقی کا جائزہ لینا ہو تو تذکرہ نگاروں کے ان دو اقوال سے لیا جا سکتا۔

علامہ ابن قیم کا کہنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن صحابہ کے فتاویٰ محفوظ ہیں ان کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ زیادہ ہے ان میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی ان میں بھی سات اشخاص ایسے ہیں کہ جن کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بقول علامہ ابن حزم ان میں سے ہر ایک کے فتوؤں کو اکٹھا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے ان اشخاص میں حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ حضرت عائشہؓ بھی شامل ہیں۔

مفتی صحابہ کی دوسری صنف میں حضرت ابو بکرؓ و عثمانؓ کے دوش بدوش حضرت ام سلمہؓ بھی موجود ہیں جن کے فتوؤں سے ایک ایک مستقل رسالہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا گروہ ان صحابہ کا ہے جنہوں نے بہت کم فتوے دیئے اس میں حسنین کریمین حضرت ابوذرؓ اور ابو عبیدہؓ کے ساتھ ام عطیہؓ حضرت حفصہؓ حضرت ام حبیبہؓ حضرت لیلیٰ بنت قائمؓ۔ اسماء بن ابی بکرؓ اُم شریک خولہ بنت تویتؓ۔ اُم دردؓ وغیرہ بہت سی صحابیات شامل ہیں۔[1] (خلاصہ)

قول ثانی:

روایت حدیث کے اعتبار سے صحابہ کے پانچ طبقے ہیں۔

1۔ جن کی روایات کی تعداد ہزار یا ہزار سے زیادہ ہے حضرت عائشہؓ اسی طبقہ میں شامل ہیں۔

2۔ جن کی روایات کی تعداد پانچ صد یا زیادہ ہے کوئی صحابیہ شامل نہیں۔

3۔ جن کی روایات کی تعداد سو سے زیادہ پانچ سو سے کم ہے ان میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا شامل ہیں۔

4۔ جن کی روایات کی تعداد چالیس تا سو ہے ان میں امہات المومنین حضرت اُم حبیبہؓ میمونہؓ وصفیہؓ کے ساتھ بہت سی صحابیات شامل ہیں۔

5۔ جن کی روایات کی تعداد چالیس یا اس سے بھی کم ہے اس طبقہ میں صحابیات کی بہت بڑی تعداد شامل ہے۔ جن میں سے فاطمہ بنت قیس ربیع بنت معوز ام قیس وغیرہ ہیں۔

اہل علم صحابیات کا حلقہ اثر

جو صحابیات مسند درس و تدریس سنبھالے ہوئے تھیں ان سے استفادہ کرنے والوں میں ہر شعبہ زندگی کے افراد شامل ہوتے تھے مثلاً حضرت عائشہ صدیقہؓ سے استفادہ کرنے والوں میں جہاں ۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت عمرو بن عاص حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے نامور حکمران اور سیاستدان شامل تھے وہاں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہ جیسے عظیم حافظ حدیث اور عقلمند اور سعید بن مسیب جیسے بے مثال فقیہ بھی شامل تھے۔

خواتین دورِ رسالت کے بعد

صحابیات کا براہ راست معلم کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ تلمذ میں داخل ہونے کی بناء پر علم و فضل سے آراستہ ہونا چنداں تعجب خیز نہیں تھا۔

تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب قاری یہ دیکھتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی حالات کے اکثر دگرگوں ہوتے رہے اور خواتین کے لیے باقاعدہ درس گاہیں موجود نہ ہونے کے باوجود عورتوں کی بہت بڑی تعداد علم و ہنر کے مختلف میدانوں میں سرگرم عمل رہی ہے۔

یہ تعداد اگرچہ مردوں اور دور رسالت کی خواتین کے مقابلے میں کم رہی ہے' مگر اس کی دو وجوہ تھیں۔

1۔ خواتین کو بعد کے ادوار میں دور رسالت جیسی تعلیمی سہولتیں حاصل نہ تھیں نہ انہیں پڑھانے کے لیے علماء کوئی وقت مختص کرتے تھے۔

2۔ دوسری یہ کہ دور دراز کے علماء سے خواتین کے لیے استفادہ آسان نہ تھا دورِ رسالت کے بعد خواتین کے علمی اعتبار سے پس ماندہ ہونے بلکہ بڑی تعداد میں زیورِ علم سے آراستہ ہونے کا ثبوت حسب ذیل حقائق سے ملتا ہے۔

1۔ عمر رضا کحالہ نے پانچ حصوں پر مشتمل کتاب اعلام النساء تحریر کی جس میں ہر طبقہ کی خواتین کا تذکرہ کیا اس کتاب کے صرف ایک حصہ یعنی جلد ثانی میں راقم کے شمار کے مطابق محدثات وروایات حدیث کی تعداد 270 ہے ان میں صحابیات اور ادیبات شاعرات حاکمات طبیات وغیرہ شامل نہیں۔

2۔ مشہور مورخ خطیب بغدادی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تاریخ بغداد میں صرف ایک شہر یعنی بغداد کی علم وفضل کے اعتبار سے ایک سو بتیس خواتین کا تذکرہ کیا ہے۔

3۔ علی بن عساکر نے اپنے اساتذہ میں اسی سے زیادہ خواتین کا تذکرہ کیا ہے۔ جب کہ خطیب بغدادی کو بخاری شریف ایک خاتون کریمہ بنت احمد مروزی نے پڑھائی۔ علاوہ ازیں ابوحیان اپنے اساتذہ میں تین خواتین صفیہ بنت الملک الکامل۔ شامیہ بنت الحافظ' زینت بنت عبداللطیف بغدادی کا نام لیتا ہے۔

4۔ ابوالفرج ابن جوزی اپنے اساتذہ حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے حسب ذیل تین خواتین کا نام لیتا ہے۔

1۔ فاطمہ بن محمد بن حسین الرازی۔

2۔ فاطمہ بنت ابی حکیم عبداللہ ابراہیم الخبر ی۔

3۔ شہدہ بنت محمد بن الفرج بن عمر الامیری۔

حیرت انگیز علم وفضل کی حامل بعض خواتین

خواتین کی علمی ترقی چونکہ صحابیات کے بعد بھی جاری رہی لہٰذا قدرتی طور پر

مختلف علمی میدانوں میں علم وفضل والی خواتین وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہیں۔

چند ایک کا تذکرہ برائے ثبوت پیش ہے ورنہ احاطہ ممکن ہے نہ اس کی گنجائش ہے۔

عمرہ بنت عبدالرحمٰن:

یہ ایک تابعی خاتون تھیں جن کی پرورش حضرت عائشہؓ نے کی تھی ان کو بڑے بڑے علماء نے عادل ضابطہ فقیہ اور حضرت عائشہؓ کے علم کی وارث قرار دیا ہے مگر اس سے ان کی علیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔

علم وفضل کے اعتبار سے ان کا پایہ کتنا بلند تھا اس کے لیے راس المحدثین اور سر خیل تابعین حضرت امام زہری کا یہ قول پڑھیے۔

قاسم بن محمد نے امام زہری سے کہا کہ کیا میں تمہیں علم سے بھرے ہوئے برتن کی نشاندہی نہ کروں۔ آپ نے عرض کیا ضرور تو انہوں نے کہا کہ جاؤ عمرہ بنت عبدالرحمٰنؒ کی مجلس کو نہ چھوڑو۔

امام زہری کا بیان ہے کہ میں حسب مشورہ عمرہ کی مجلس میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ واقعتاً علم کا نہ ختم ہونے والا سمندر ہیں۔

یہی عمرہ بنت عبدالرحمٰن علم حدیث میں اتنا بلند پایہ رکھتی تھیں کہ نہ صرف امام زہری یحیٰی بن سعید اور ابوبکر بن حزم جیسے یگانہ روزگار محدثین ان کی خدمت میں برائے استفادہ حاضر ہوتے تھے بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابن حزم کو حکم دیا کہ عمرو بن عبدالرحمٰن کی احادیث کو قلمبند کریں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کی صاحبزادی عائشہ بنت سعد اس پائے کی عالمہ تھیں کہ امام الحرمین امام مالک ایوب سختیانی اور حکم بن عتیبہ جیسے فقہاء ومحدثین ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔

حضرت حسنؓ کی پوتی نفیسہ کے علم وفضل کا یہ عالم تھا کہ امام شافعی فسطاط مصر میں (جب آپ کا اجتہاد کے اعتبار سے دور ثانی شروع تھا اور آپ شہرت کے آسمان پر آفتاب

عالمتاب بن کر چمک رہے تھے) ان کی مجلس درس میں باقاعدگی کے ساتھ اپنے تلامذہ کے ساتھ حاضر ہوتے تھے اور استفادہ کیا کرتے تھے۔

تنجا شہدا ملقب فخر النساء کی قابلیت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ یہ دمشق کی جامع مسجد میں ایک مجمع کے سامنے ادب خطابت اور شاعری پر لیکچر دیا کرتی تھیں اور وقائع اسلام میں ممتاز علماء کے ساتھ اس خاتون نام بھی لیا جاتا ہے۔

ابوالخیر اقطع کی دادی عبیدہ کے حلقہ درس کی اس قدر شہرت تھی کہ بیک وقت پانچ صد طلبہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہوتے اور استفادہ کرتے تھے۔

امام الحرمین امام مالک کی صاحبزادی کو حدیث میں اس قدر ملکہ حاصل تھا کہ طالب علم گر موطا پڑھتے ہوئے کہیں غلطی کرتا تو وہ اندر سے دروازہ کھٹکھٹاتیں تو امام موصوف فوراً طالب علم سے کہتے۔

ارجع فالغلظ معک.

پھر پڑھو تم غلطی کر رہے ہو۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے امام مالک کو اس خاتون کی صلاحیتوں پر کتنا اعتماد تھا کہ آپ بذات خود غلطی پر مطلع نہ ہونے کے باوجود اس خاتون کی نشاندہی پر طالب علم کو غلطی کا مرتکب گردانتے اور دھرانے کا حکم دیتے ہجیمہ بنت جیبی الا وصیابیہ ایک تابعیہ عالمہ تھیں یہ علم فقہ وحدیث میں ید طولی رکھتی تھیں اور ام الدرداصغری کے نام سے معروف تھیں فقہ میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ یہ مختلف مسائل میں ایک مستقل نقطہ نظر رکھتی تھیں مثلاً یہ کہ تشہد میں عورت کو تورک کا حکم ہے مگر ان کا نظریہ اس سے مختلف ہے ان کے متعلق تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔

قال مکحول کانت ام الدردا فقیهة و کانت فی صلاتها جلسة الرجل .

حدیث میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ محدثین جن کو روایت حدیث میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے مثلاً عالم بن ابی الجعد شہر بن جوشب ابوحازم مکحول شامی رجاء

بن حیوہ میمون بن مہران جبیر بن نفیر یہ سب ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔

برصغیر ایک خاتون کا ممنون احسان ہے

کریمہ بنت احمد المروزیہ جن کا تذکرہ گزشتہ سطور میں خطیب بغدادی کی استاد کی حیثیت میں آیا ہے اس خاتون کا یہی کمال نہیں کہ وہ خطیب جیسے باکمال کی استاد تھیں بلکہ ان کا امت مسلمہ علی الخصوص برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں پر ایک بڑا احسان بھی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ امام بخاری شریف کے مختلف نسخے روایت کیے گیے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

نسخہ فربری، نسخہ کشمیہنی، نسخہ حموی، نسخہ مستملی، نسخہ مروزی نسخہ ابن حجر، نسخہ ابوالوقت، نسخہ ابن عساکر، نسخہ نفسی نسخہ صفائی، نسخہ ابی سکن، نسخہ ابواحمد جرجانی نسخہ ابن شبویہ، نسخہ کریمہ بنت احمد بن محمد بن حاتم المروزی۔

ان نسخوں میں سے جہاں مردوں کے نسخوں کو مختلف علاقوں میں قبولیت عامہ حاصل ہوئی وہاں کریمہ بنت احمد کی روایت کردہ نسخہ کو برصغیر میں اللہ کی طرف سے درجہ قبولیت عطا کیا گیا چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں۔

میں ایک مثال دیتا ہوں شاید بہت سے لوگوں کے لیے انکشاف ہو یعنی خواتین کی علمی کوششوں علمی جدوجہد ذوق وشوق اور شغف کی کامیابی کی روشن مثال ہے جس سے آدمی پر ایک تحیر قائم ہو جاتا ہے۔

آپ سے پوچھوں قرآن مجید کے بعد اسلام کے پورے کتب خانے اور پورے علمی ذخیرے میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں اس امت کو عطا ہوا جس کی بنیاد علم بالقلم کی وحی سے پڑی اس قلم کی حرکت سے جو دنیا میں بینظیر کتب خانہ تیار ہوا اس

میں کتاب اللہ کے بعد کس کا درجہ ہے تو صحیح جواب ہوگا کہ صحیح بخاری کا درجہ ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ صحیح بخاری ہمارے ہندوستان میں ہر مدرسہ کے لیے معیار فضیلت ہے اس کو علماء نے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا ہے اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ بخاری و مسلم کے بارہ میں حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

کل من یمون امرھا' فھو مبتدع متبع غیر سبیل المومنین .

آج ہمارے مدارس میں (مراد مدارس برصغیر ہیں) جو د... یف کس کی روایت ہے کہ کریمہ (محمد کریمہ بنت احمد نامی خاتون ہے) کی روایت ہے ذرا آگے ... فرماتے ہیں۔

ایسی مثال کوئی امت پیش کر سکتی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جیسے امام بخاری کے تلامذہ کی کوششوں کو بارآور کیا اور آج دنیا میں ان کا نام باقی ہے۔

ویسے ہی ان تلمیذہ کی کوششوں کو کچھ زیادہ ہی بارآور کیا اور یہ چیز ہمارے اسلامی معاشرے میں آخر تک باقی ہے۔

ذرا چشم تصور کیجئے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ شاہ ولی اللہ' مجدد الف ثانی مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی مولانا انور شاہ کشمیری جیسے ہزاروں لاکھوں عظیم علماء کو اس بے مثال خاتون کی بارگاہ میں خمیدہ سر ایستادہ دیکھیے اور پھر مسلم خواتین کی علمی خدمات کا اندازہ کیجئے۔

آٹھویں صدی ہجری کی ایک مصری خاتون عائشہ بنت علی بن محمد بن علی بن عبداللہ بن ابی الفتح ہوئی ہیں جو بے مثال محدثہ حافظہ تھیں جن کے پاس بڑے بڑے علماء برائے استفادہ آیا کرتے تھے۔ اور کمال کی حافظہ اور ذہانت کی مالک تھیں حافظہ کی کیفیت عمر رضا کحالہ نے یوں بیان کی ہے۔

وکانت مستحضرۃ السیرۃ النبویہ تکاو تذکر الغروۃ بتما مھا

وکانت حافظۃ لکثیر من الاشعار سیما دیوان البھاء زھیرو

کانت سـ... حفظ نکانت تحفظ من قراتھا للقصیدۃ اوغیر

ها من سورة واحدة فقد قال البقاعي كتبت الكتابة الحسنة وكانت من الذكاء على جانب كبير تطالع كتب الفقه فتفهم وتحفظ شعراً كثيراً مرت على ديوان البازهير ومصارع العشاق وسيرة النبوية لابن فرات وسلوان المطاع الابن ظفر.

خواتین اسلام کا پسندیدہ موضوع اگر چہ فقہ حدیث تفسیر وغیرہ علوم میں مہارت حاصل کرنا تھا مگر بعض خواتین ایسی بھی تھیں جنھوں نے دیگر شعبوں کو بھی جولائی طبع کے لیے منتخب کیا مثلاً شاعری کی تو صاحب دیوان ہوئیں موسیقی میں بے نظیر بن گئیں۔ طب میں حیرت کے لیے مقام حیرت بن گئیں چونکہ ان تمام میں زیادہ مثالیں دینا مقصد نہیں لہٰذا شاعری طب اور فقہ میں ایک ایک خاتون کا کمال بیان کر کے اس موضوع کو ختم کیا جاتا ہے۔

ام علی تقیہ بنت ابی الفرح فتویٰ 577 نہایت قابل خاتون تھیں ایک مرتبہ انھوں نے صلاح الدین کے بھتیجے تقی الدین عمر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جو ساقی نامہ کی طرز پر لکھا گیا تھا اس میں شاعرہ نے نہایت خوبی سے ایک محفل مے نوشی کا بے کم وکاست نقشہ کھینچا ساغرو رمینار او دیگر کوائف اس طرح بیان کیئے گئے تھے کہ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاعر ایک عادی مے خوار ہے۔ قصیدہ پڑھ کر تقی الدین نے علی الان کہا کہ شاعر کو ضرور محفل مے نوشی کا ذاتی تجربہ ہے اس خاتون نے ایک رزمیہ قصیدہ لکھ ڈالا جس میں اس نے جنگ کی کلی جزئیات نہایت تفصیل سے بیان کی تھیں اور میدان جنگ اور جنگجو بہادروں کا نقشہ کھینچا تھا' جب اس نے یہ رزمیہ نظم تقی الدین کو بھیجی تو ایک خط میں لکھا مجھے جتنا تجربہ بزم کا ہے اتنا ہی رزم کا ہے اس نظم کو پڑھ کر تقی الدین نے اس کے اعلیٰ تخیل کا لوہا مان لیا اور اس کی بے حد تعریف کی۔

نویں صدی ہجری کی ایک خاتون فاطمہ بنت احمد بن یحییٰ تھیں جو نہ صرف علم وفضل میں درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں بلکہ وہ استنباط احکام کی صلاحیت سے بھی بہرور تھیں اور اپنے والد کے ساتھ بہت سے مسائل پر بحث کیا کرتی تھیں ان کے والد نے ان کی صلاحیت کا یوں اعتراف کیا۔

ان فاطمة ترجیع الی نفسهانی استنباط الاحکام.

بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ان کے شوہر امام مطہر نامی ایک بڑے عالم تھے جو لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے جب کبھی ان کو کسی کتاب میں سے کوئی مقام لانحیل نظر آتا تو فوراً گھر آتے اور بیوی سے اس کے متعلق پوچھتے تو وہ فوراً اس مقام کو حل کر دیتیں یہ باہر آ کر اس کی پھر تقریر کرتے جس پر طلباء اعلانیہ کہتے۔

لیس هذا منک بل من وراء الحجاب .

ذرا غور کیجئے کہ ان خواتین کا پایہ علم وفضل کیا ہوگا جو گھروں میں رہ کر ہر قسم کے علماء سے مستفیض ہونے والے علماء کی مشکل کتب میں رہنمائی کرتی ہوں گی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلم خاتون اسلامی عہد میں علمی اعتبار سے کس اوج کمال پر تھی۔

ایک اور حیرت انگیز خاتون کا تذکرہ سنیئے جو علم طب کی ماہر تھی اور اس کی اس علم میں بے مثال دسترس کا اندازہ لگایئے۔

علامہ ابوالفرج ابن جوزی رقم طراز ہیں۔

صلت بن حجدری کہتے ہیں کہ مجھ سے بشر بن مفضل نے بیان کیا کہ ہمارا حاجیوں کا قافلہ سفر میں تھا تو ہمارا گزر عرب کے پانیوں میں سے ایک پانی پر ہوا ہم سے بیان کیا گیا کہ یہاں بہت خوبصورت تین بہنیں ہیں اور کہا گیا کہ وہ طب کرتی ہیں اور علاج کی ماہر ہیں ہم نے چاہا کہ ان کو دیکھیں تو ہم نے اپنے ایک ساتھی کی پنڈلی کو لکڑی اٹھا کر اس سے چھیل لیا یہاں تک کہ اس میں خون کچکچانے لگا پھر ہم نے اس کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور لوگوں سے کہا کہ اس کو سانپ نے کاٹا ہے کوئی جھاڑنے والا ہے تو ان میں سے چھوٹی بہن نکل کر آئی ایسی خوبصورت تھی کہ معلوم ہوتا تھا سورج نکل آیا وہ آ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی کہ اسے سانپ نے نہیں کاٹا ہم نے کہا کیسے تو اس نے کہا کہ اس کا جسم ایسی لکڑی سے چھل گیا ہے جس پر سانپ نے پیشاب کیا تھا اس کی دلیل یہ ہے جب اس کے بدن کو دھوپ لگے گی تو یہ مر جائے گا اور واقعی جب سورج طلوع ہوا تو وہ شخص مر گیا اور ہم متحیر رہ گئے۔

دنیا کی کوئی قوم سوائے مسلمانوں کے اس دور میں ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے خواتین کو فرش سے اوج کمال تک پہنچا دیا تھا مسلمانوں کے ازمنہ وسطیٰ میں ایسے محیر العقول واقعات پڑھ کر بے اختیار یہ فقرہ قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔

اولئک آبائی فجئنا بمثلھم.

اُم المومنین حضرت اُم سلمہ حالات و علمی خدمات

حضرت ام سلمہ قبیلہ قریش کی شاخ بنو مخزوم سے تھیں اصل نام ہند تھا ان کے والد کا نام ابو امیہ تھا جو عرب کے بہت بڑے سردار اور انسانیت مخیر شخص تھے جس قافلہ تجارت میں ہوتے اس کے تمام اخراجات خود برداشت کرتے جس کی بنا پر زاد الراکب کے نام سے مشہور تھے۔

حضرت ام سلمہ کا پہلا نکاح عبداللہ بن عبدالاسد اسدی سے ہوا جو رشتے میں حضرت ام سلمہ کے چچا زاد تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی جنہوں نے اسلام میں ابو سلمہ کے نام سے شہرت حاصل کی اور مشہور ترین صحابہ میں شامل ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد حضرت ابو سلمہ ایمان لائے تو ام سلمہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق ایمان دی اور یوں یہ دونوں دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔

یہ جوڑا ان مسلمانوں میں شامل تھا جنھوں نے ہجرت حبشہ کی۔ کچھ عرصہ بعد واپس مکہ چلے آئے جب یہاں سے مدینہ ہجرت کرنی چاہی تو حضرت اُم سلمہ کے قبیلہ نے مزاحمت کی کہ ہم اپنی لڑکی کو مدینہ نہیں جانے دیں گے جس کی بناء پر بنو عبدالاسد ام سلمہ کو سلمہ سے چھین کر لے گئے کہ اگر تم اپنی لڑکی کو ابو سلمہ کے ساتھ نہیں جانے دیتے تو ہم بھی اپنے بچے کو تمہاری لڑکی کے ساتھ نہیں رہنے دیں گے۔ حضرت اُم سلمہؓ کے بیان کے مطابق ایک سال کی مسلسل آہ و زاری کے بعد میرے قبیلہ والوں نے مجھے ابو سلمہ کے پاس مدینہ جانے کی اجازت دی اور بنو عبدالاسد نے بھی بچہ واپس کر دیا یوں یہ تنہا ہی مکہ سے مدینہ روانہ

ہوئیں۔

مقام تنعیم پر حضرت ام سلمہ کو عثمان بن ابی طلحہ کلید بردار کعبہ مل گئے جنھوں نے آپ کے تنہا سفر پر حیرت کا اظہار کیا کہ شرفاء کی عورتیں اس طرح سفر نہیں کیا کرتی تھیں۔

جب آپ نے سارا ماجراء بیان کیا تو یہ ساتھ ہو لیے اور کمال شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے مسجد قباء تک پہنچایا ان کی اس شرافت سے حضرت ام سلمہ اتنی متاثر ہوئیں کہ ساری زندگی ان کی تعریف کیا کرتی تھیں۔

مدینہ کے قریب عثمان انہیں تنہا چھوڑ کر واپس چلے گئے جب آپ مدینہ میں داخل ہوئیں تو لوگوں نے آپ سے نام ونساب پوچھا جب آپ نے بتایا کہ میں ابوامیہ کی لڑکی ہوں تو لوگوں کو ان کے تنہا سفر اور ابوامیہ کی عظمت کے پیش نظر اس بات کا یقین نہ آیا یہاں تک فتح مکہ کے دن جب آپ کے گھر والے آپ کے رقعہ پر ملنے آئے تو لوگوں کو اس بات کا یقین آیا۔

حضرت ام سلمہؓ پہلی خاتون ہیں جو مدینے میں ہجرت کر کے داخل ہوئیں۔

حضرت ام سلمہؓ کی ابوسلمہ سے چار اولادیں ہوئیں۔ سلمہ ۱۔ زینت ۲۔ درہ ۳۔ عمر ۴۔ ان میں سے درہ وہ خاتون ہیں جن کے متعلق ایک مرتبہ یہ افواہ اڑ گئی کہ حضورؐ ان سے نکاح کرنا چاہتے ہیں جس کی حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو باقاعدہ تردید کرنا پڑی۔

جنگ احد میں ابوسلمہ کو شدید زخم آئے جن کی بناء پر کچھ عرصہ بعد ان کی وفات ہوگئی حضرت ام سلمہؓ کو شدید صدمہ ہوا حضورؐ تشریف لائے رو رہی تھیں آپ نے تسلی دی اور فرمایا یہ کھویا اللہ ان سے بہتر شوہر عطا فرمایا۔

حضرت ابوسلمہؓ کے جنازہ پر آپ نے نو تکبیریں پڑھیں استفسار پر فرمایا کہ یہ ہزار تکبیر کے مستحق تھے۔

ام سلمہؓ کی خاوند سے محبت:

حضرت اُم سلمہؓ کو ابوسلمہ سے بہت محبت تھی جس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا

ہے کہ ایک مرتبہ ابوسلمہؓ سے یہ عہد کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگر ہم میں سے کوئی مر جائے تو دوسرا شادی نہیں کرے گا لیکن ابوسلمہ نہ مانے۔

جب ابوسلمہ فوت ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا کہ تم یہ دعا پڑھا کرو۔

اللّٰھم اجرنی فی مصیبتی و اخلفنی خیراً منھا.

اے اللہ میری مصیبت کا مجھے اجر عطا فرما اور اس سے بہتر صورت حال لا تو حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ جب میں یہ دعا پڑھتی تو میری کیفیت یہ ہوتی۔

فلما ازدت ان اقول اللّٰھم اخلفنی خیراً منه فقلت فی نفسی اعاض خیراً من ابی سلمه ثمه قلتھا فعافنی اللّٰه محمداً صلی اللّٰه علیه وسلم.

جب کہ زرقانی کے الفاظ یہ ہیں۔

قلت ای المسلمین خیراً من ابی سلمه ثم انی قلتھا فاخلف اللّٰه لی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم.

نکاح ثانی:

حضرت ابوسلمہؓ کی وفات کے وقت حضرت ام سلمہؓ حاملہ تھیں بعد وضع حمل کے سیدنا صدیق اکبر اور فاروق اعظم نے پیغام نکاح دیا مگر آپ نے قبول نہیں کیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام دیا تو آپ نے فرمایا کہ مرحبا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن آپ نے تین عذر رکھے۔ 1۔ یہ کہ میں بہت غیرت مند ہوں۔ 2۔ میرے بچے ہیں۔ 3۔ یہ کہ میرے عزیز و اقارب میں سے کوئی میرا نکاح کرنے والا نہیں حضورؐ نے تینوں کا حل تجویز فرمایا اور یوں 3 ہجری کو شوال کے مہینے میں حضورؐ سے نکاح ہوا۔

صائب الرائے:

آپ بہت صائب الرائے تھیں جس کا اندازہ آپ کے اس بینظیر مشورہ سے

ہوتا ہے جو آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ نے صلح حدیبیہ کے دن دیا۔

جب لوگ آپ کے بار بار کہنے کے باوجود معاہدے کی شرائط کے سلسلہ میں شدید صدمہ محسوس کرتے ہوئے قربانی کے لیے نہ اٹھے تو آپ حضرت ام سلمہؓ کے پاس آئے اور باہر کی صورت حال بتائی حضرت ام سلمہؓ نے کہا۔

یانبی اللہ اتحب ذالک اخرج ثم لاتکلم احداً منہ حتی تنحر بدنک وتدعو حالقک فیحلقک فخرج فلم یکلم احداً منھم حتی فعل ذالک نحر بدنہ ودعا حالقہ فحلقہ فلما راؤا ذالک قامو فنحروا وجعل بعضھم یحلق بعضاً۔

حضرت ام سلمہؓ کا مشورہ اس قدر صحیح تھا کہ امام الحرمین یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

لانعلم امراۃً اشارت برایٍ فاصابت الاامر سلمہ۔

وفات:

حضرت ام سلمہ کے سن وفات میں اختلاف ہے بعض اٹھاون بعض ساٹھ لیکن اکسٹھ ہجری کی طرف زیادہ رجحان ہے۔

حضرت اُم سلمہؓ کا علمی پایہ وخدمات:

حضرت ام سلمہ کا علمی پایہ ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد سب سے بلند اور دیگر صحابیات میں تو سب سے زیادہ تھا۔

طبقات ابن سعد میں محمود بن لبید کے قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ ام سلمہؓ بھی حضرت عائشہ کی طرح حصول علم میں بہت کوشاں رہا کرتی تھیں محمود کا کہنا ہے۔

کان ازواج النبی یحفظن کثیراً من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولامثلا لعائشۃ وام سلمہ۔

اس کوشش کا نتیجہ یہ تھا کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا رواۃ حدیث کے تیسرے طبقہ میں ہیں جو حضرت عائشہؓ کے بعد کسی بھی صحابیہ کا سب سے بلند طبقہ ہے اور فقہی اعتبار سے

صاحب فتویٰ صحابہ کے طبقہ ثانیہ میں شامل ہیں۔

مرویات کی تعداد:

آپ سے کل احادیث جو روایت کی گئیں ان کی تعداد 387 ہے ان میں سے 29 احادیث بخاری و مسلم میں ہیں اور متفق علیہ احادیث کی تعداد 13 ہے تین احادیث میں بخاری منفرد ہیں۔ جبکہ 13 احادیث میں مسلم کو انفراد حاصل ہے۔

فقہ میں مہارت جیسا کہ قبل ازیں مذکور ہوا کہ یہ فقہاء صحابہ کے طبقہ ثانیہ میں شامل ہیں اور ان کے فتوؤں سے ایک رسالہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

آپ کے فتوؤں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً متفق علیہ ہیں۔

جو آپ کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی پر دال ہیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر عصر کے بعد دو نفل پڑھا کرتے تھے۔ مروان نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ نے مجھے بتایا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بھی پڑھا کرتے تھے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے حضرت ام سلمہؓ کا حوالہ دیا۔ جب حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ:

یغفر اللّٰہ لعائشہ لقد وضعت امری علی غیر موضع اولم آخبر ھاان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قد نھی عن ذالک.

علم اسرار دین:

حضرت عائشہ کی طرح حضرت ام سلمہؓ کو بھی اسرار دین میں ملکہ حاصل تھا جس میں حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو خصوصیت حاصل تھی۔

ایک مرتبہ آپ سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ملنے آئے تو آپ نے فرمایا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے' کہ میرے بعض صحابی ایسے ہیں کہ انتقال کے بعد میں نے انہیں دیکھونگا نہ وہ مجھے دیکھ سکیں گے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرا کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے تو حضرت عمرؓ بھاگے بھاگے آئے اور پوچھا کہ سچ

بتانا کہ میں بھی ان میں سے ہوں تو آپ نے فرمایا کہ نہیں لیکن تمہارے علاوہ میں کسی کو مستثنٰی نہ کروں گی۔

تلامذہ اُم سلمہ:

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اخذ علم کرنے والوں کی تعداد نجانے کتنی ہوگی صرف وہ لوگ جو حدیث میں آپ سے استفادہ کرتے تھے اور ان کے نام کتب میں مذکور ہیں ان کی تعداد عمر رضا کحالہ کے مطابق "33" ہے جب کہ الاصحابہ میں "15" افراد کے نام درج ہیں جن میں جہاں صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت ابوسعید بن میتب رضی اللہ تعالیٰ عنہمہیں وہاں جلیل القدر تابعین میں حضرت سعید بن میتب جیسے فقیہ اور عروہ بن زبیر جیسے صاحب علم نافع ۔ یحیٰی بن کریب قبیصہ بن زویب جیسے عظیم ترین محدث شامل ہیں۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ امت مسلمہ کی بعد کی علمی ترقی جوان حضرات تابعین کی وجہ سے ہوئی اس میں اس عظیم خاتون کا کتنا حصہ ہے۔

پھر یہ کہ آپ کے تلامذہ کی فہرست گنوانے کے بعد تمام تذکرہ نگار یہ کہتے ہیں کہ آپ کے تلامذہ کی تعداد صرف یہی نہیں ہے۔

ایک خاص خدمت:

ایک عالم ربانی کے فرائض میں جہاں بذریعہ علم لوگوں کی تربیت کرنا ہے وہاں اپنے علم کی روشنی میں حکمران کو ان کی کوتاہیوں پر ٹوکنا بھی ہے' حضرت اُم سلمہؓ نے یہ فریضہ بخوبی ادا دیا چنانچہ آپ کی زندگی میں حکمرانوں نے نماز کے مستحب اوقات میں تغیر وتبدل کیا تو آپ نے انہیں متنبہ کرتے ہوئے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ظہر جلدی پڑھا کرتے تھے اور تم عصر جلدی پڑھتے ہو۔

جب حضرت امیر معاویہ کے دور میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب وشتم

برسر منبر ہونے لگا تو آپ نے امیر معاویہ کو خط لکھا۔

انکم تلعنون اللہ و رسولہ علی منابر کم و ذالک انکم تلعنون علی بن ابی طالب و من احبہ و انا اشہد ان اللہ احبہ و رسولہ[۸۴]

ترجمہ: تم اللہ اور رسول کو برسر منبر برا بھلا کہتے ہو وہ یوں کہ تم علی بن ابو طالب کو نشانہ لعنت و ملامت ٹھہراتے ہو اور ہر اس شخص کو جو ان سے پیار کرتا ہے میں ذاتی طور پر اس بات کی گواہ ہوں کہ خدا اور اس کا رسول ﷺ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کرتے تھے۔

سیدۃ نساء العالمین فاطمۃ الزہراء

آپ آقائے دو عالمؐ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں اور اپنی خوبیوں کی بناء پر سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ آقا دو عالمؐ کا ارشاد ہے۔

فاطمۃ بضعۃ منی یو ذیہنی ما اذا ھا و یر یبنی ما رابہا۔

آپ کا نکاح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ہجرت والے سال ہی رجب کے مہینہ میں ہوا البتہ رخصتی غزوہ بدر کے بعد ہوئی اور یہ رخصتی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی رخصتی کے چار ماہ بعد ہوئی نکاح کے وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر پندرہ سال ساڑھے پانچ ماہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اکیس سال پانچ ماہ تھی۔

آقاء دو عالمؐ کی نسل صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جاری ہے باقی آپ کی کسی اولاد سے کوئی نسل جاری نہ ہوئی حضرت حسنین کریمین آپ کی ہی اولاد ہیں۔

حضرت فاطمہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صرف چھ ماہ بعد زندہ رہیں اور انتیس برس کی عمر میں وفات پائی حضرت عقیل کے گھر میں دفن ہوئیں اور آپ کو رات کو دفن کیا گیا۔

آپ شکل و صورت گفتگو کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ

تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا کہنا ہے:

ما رایت احداً کان اشبه کلاماً وحدیثاً برسل اللّٰہ من فاطمه.

آپ کے فضل و کمال کے لیے کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ قول کافی ہے۔

ماریت قط احداً افضل من فاطمة غیر ابیھا.

باقی آپ کے حالات و واقعات سے کتب معمور ہیں جن کا لکھنا مقصود نہیں۔

علمی پایہ خدمات

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو چونکہ طویل زندگی نہیں ملی اور آپ حضورؐ کے بعد صرف چھ ماہ زندہ رہیں اگر آپ کو کچھ عرصہ مزید زندگی مل جاتی تو یقیناً آپ سے بھی ویسے ہی بلکہ اس سے بڑھ کر علم و عرفان کے دریا پھوٹتے جیسے کہ آپ کے شوہر نامدار جناب حیدر کرار سے ظاہر ہوئے کیونکہ آپ آقا دو عالمؐ کی راز دار خاص تھیں جیسا کہ وصال سے پہلے آپ کی سرگوشی سے پتہ چلتا ہے۔

جو چھ ماہ آپ نے اپنے والد بزرگوار کے بعد گزارے یہ مسلسل بیماری اور حزن و ملال میں گزارے جس پر آپ کے حزن و ملال سے مملو اشعار دال ہیں۔ مثلاً

ماذا علی من شم تربهة احمد.

الایشم مدی الزمان غوالیما

صبت علی مصائب لوانها

جت علی الایام صرن سیا لیما

ایسے میں آپ کا علمی مجالس منعقد کرنا بعید از قیاس ہے تاہم اس عرصہ کا آپ سے کچھ علمی سرمایہ یادگار بھی ہے اور وہ آپ کی روایت کردہ احادیث ہیں اور آپ کے متعلق روایات کردہ تفقہ پر دال واقعات ہیں۔

روایت کردہ احادیث:

حضرت علی سفر سے واپس آئے تو آپ نے قربانی کا گوشت پیش کیا آپ کو تامل ہوا شاید اس وقت تک اس کا صریح حکم معلوم نہ تھا تو آپ نے فوراً کہا کہ کوئی حرج نہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اجازت دے چکے ہیں۔

2۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کے گھر گوشت تناول فرمایا اور نماز کے لیے نیا وضو کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے تو آپ نے دامن پکڑ لیا کہ وضو فرمائیے کہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ آگ کی پختہ اشیاء کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں کہ تمام اچھے کھانے آگ پر ہی پکتے ہیں یعنی تبدیل ہو چکا ہے۔

راویان احادیث:

آپ سے احادیث روایت کرنے والے صحابہ حسب ذیل ہیں۔ حضرت حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سلمٰی ام رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہا، انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

آپ کی احادیث میں سے ایک حدیث بخاری و مسلم نے روایت کی ہے اور اس کے علاوہ ابوداؤد نے بھی اور ابن ماجہ نے بھی آپ کی روایت کردہ احادیث کو نقل کیا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اسماء بنت ابی بکرؓ

آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی ہیں والدہ کا نام قتیلہ بنت عبدالعزیٰ تھا یہ سترہ آدمیوں کے بعد مسلمان ہوگئی تھیں ان کا لقب ذات النطاقین تھا کیونکہ آپ نے اپنے کمر بند کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم کا زادراہ باندھا اور دوسرے حصہ کو کمر میں باندھا۔

آپ کی شادی حضرت زبیر سے ہوئی اور جب آپ نے ہجرت کی تو اس وقت آپ حمل سے تھیں اور قباء میں پہنچ کر آپ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جنم دیا اور پھر آپ کی خلافت اور شہادت تک زندہ رہیں۔

ابتداً بہت تنگ دست تھیں بعد میں وسعت ہوگئی تھی۔

آپ تقریباً سو سال سے زیادہ زندہ رہیں لیکن آخر وقت تک آپ کا نہ تو کوئی دانت گرا نہ آپ کی عقل ونظر یا ہوش وحواس میں فرق آیا۔

جرات وحق گوئی:

آپ بہت جری خاتون تھیں جب آپ کے فرزند کو پھانسی دے دی گئی اور عرصہ تک ان کا بدن پھانسی پر ہی لٹکتا رہا تو ایک دن حجاج کے پاس چلی گئیں ان کے اور حجاج کے درمیان حسب ذیل سوال جواب ہوئے۔

حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیا اس شہسوار کے اترنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟

حجاج:

اس منافق کے اترنے کا؟ حضرت اسماء واللہ وہ منافق نہ تھا روزہ دار اور شب زندہ دار تھا۔ حجاج نکل جاؤ تم سٹھیائی ہوئی بڑھیا ہو حضرت اسماء واللہ میں سٹھیائی ہوئی نہیں ہوں میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ کہ بنی ثقیف سے ایک کذاب اور ایک ظالم پیدا ہوگا تو ہم نے مسلیمہ الکذاب دیکھ لیا اور ظالم تم ہو۔

اندازہ کیجئے ایک خاتون کس جرات سے سب سے بدترین حاکم کے سامنے گفتگو کر رہی ہے۔

علمی خدمات:

آپ کی خدمات میں یہ بات بھی کہی جائے گی کہ آپ نے عبداللہ بن زبیر جیسے شیر دل اور جبر واستبداد کو للکارنے والے علم وفضل کے پیکر کی تربیت کی اور شہسوار سیاست

ہوتے ہوئے بھی ان کے علمی پائے کا اس قدر بلند ہونا ہی اس عظیم ماں کی تربیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

روایت کردہ احادیث:

آپ نے آقا دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپن احادیث روایت کی ہیں جن میں وہ حدیث بھی شامل ہے جو ابھی پہلے درج کی گئی۔

راویان حدیث عبداللہ وعروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (بیٹے) عباد بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ' عبداللہ بن عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (پوتے) فاطمہ بنت منذر بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' عباد بن حمزہ بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ کیسان' عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ' صفیہ بنت حبب بن کیسان رضی اللہ تعالیٰ عنہا' ابن ابی ملیکہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

اسماء بنت عمیس

یہ خاتون حضرت میمونہؓ کو سوتیلی بہن ہونے کے ناطے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خواہر نسبتی تھیں علاوہ ازیں یہ حضرت جعفر طیار کے عقد میں تھیں اس اعتبار سے آقا دو عالمؐ کے ساتھ ان کا بھاوج کا رشتہ بھی تھا یہ دار ارقم کے قیام سے قبل مسلمان ہو گئی تھیں اور اپنے شوہر نامدار کے ساتھ حبشہ ہجرت کی اور وہیں پر عبداللہ بن جعفر محمد بن جعفر اور عون بن جعفر پیدا ہوئے۔

حضرت جعفر طیار کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح ہوا جن سے محمد بن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدا ہوئے اور پھر جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکاح کیا اور یحییٰ پیدا ہوئے۔

علمی خدمات یہ ایک عالمہ فاضلہ خاتون تھیں اور آقا دو عالمؐ سے اکثر مسائل دریافت کیا کرتی تھیں۔

آپ کے علم وفضل کے لیے جہاں آپ سے متعدد احادیث کی روایت کافی شہادت

ہے وہاں یہ بھی ایک بڑی شہادت ہے کہ یہ علم تعبیر الرویاء کی ماہر تھیں الاصابہ میں ہے۔

وکان عمر یسالھا عن تفسیر المنام ونقل عنھا اشیاء من ذالک۔

روایت کردہ احادیث کی تعداد ساٹھ ہے جو کہ بڑے بڑے چند صحابہ وبکثرت تابعین نے آپ سے روایت کی ہے۔

روایت کرنے والوں میں عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم صحابی ہیں جب کہ قاسم بن محمد عبداللہ بن شداد ام عون بنت محمد بن جعفر، سعید بن المسیب اور عروہ زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ جلیل القدر تابعین شامل ہیں۔

اسماء کے علم وفضل کی شہادت علامہ ذہبی نے تجرید اسماء الصحابہ میں یوں دی ہے۔

وکانت فاضلة جليلة.

آپ کے تفقہ پر دال یہ ایک بات ہی کافی ہے کہ جب آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی وصیت کے مطابق غسل دے دیا تو چونکہ مردہ نہلانے کے بعد غسل کرنا مستحب ہے لہٰذا آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ:

انی صائما وھٰذا یوم شدید السود فعل علی من غسل قالا الا.

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ خاتون حضور ﷺ کے بعد بھی علم وفضل کے حصول میں کوشاں رہیں۔

فاطمہ بنت قیس الفہریہ رضی اللہ عنہا

یہ صحابیہ خاتون جہاں صاحب جمال تھیں وہاں صاحب علم بھی تھیں یہ ابتداً تو ابو حفص بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تھیں بعد میں طلاق ہونے کے بعد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے اسامہ بن زید سے نکاح ہوا۔

علم و فضل و علمی خدمات:

• یہ خاتون علمی اعتبار سے اس قدر بلند پایہ رکھتی تھیں کہ تمام تذکرہ نگاروں کے الفاظ یہ ہیں۔

ذات حسن وجمال وعقل وکمال. كانت ذات عقل وافر وحسن بابر. لها عقل وكمال.

ان کے کمال و فضل پر یہ بات دال ہے کہ مقدہ ثلاث کے نفقہ کے بارہ میں صحابہ کرام میں اختلاف ہوا۔

حضرت عمر کا فتویٰ یہ تھا کہ اس کو نفقہ و سکنی ملنا چاہیے لیکن جب فاطمہ بنت قیس کی یہ روایت آپ تک پہنچی کہ حضور ﷺ نے انہیں نفقہ وغیرہ نہیں دلایا تھا تو آپ نے فرمایا کہ:

اپنے رب کی کتاب اور نبی ﷺ کی سنت کو ایک عورت کے کہنے پر نہیں چھوڑیں گے۔

لیکن اس کے باوجود ہوا یہ کہ اور دوسروں نے فتویٰ دیا کہ ایسی عورت کو نہ خرچہ ملے گا نہ مکان اور فاطمہ بنت قیس کی حدیث کو حجت قرار دیا اس لیے کہ ایک عدت کے ختم ہونے پر ارشاد حق ہے۔ لا تدری لعل الله يحدث بعدذالك امرا۔ تو مطلقہ ثلاث کے لیے اللہ تعالیٰ کیا صورت پیدا فرمائے گا کہ وہ تو طلاق دینے والے پر حرام ہو چکی ہے۔

اس مسئلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اختلاف ہوا لیکن وہ ان کی رائے کو یہ کہنے کے باوجود کہ فاطمة اتقی الله فقد علمت فی المعاش كان هذا ان کی رائے کو تبدیل کر سکتا تو درکنار اکثر صحابہ کی رائے کو ان کے موافق ہونے سے نہ روک سکیں۔

روایت کردہ احادیث۔ آپ نے آنحضرت ﷺ سے 34 احادیث روایت کی ہیں جن سے روایت قاسم بن محمد۔ ابوبکر بن الوجہم۔ ابوسلمہ بن عبداللہ۔ سعید بن مسیب عمروہ بن زبیر۔ عبداللہ بن اللہ بن عبید، اسود بن یزید، سلیمان بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

حضرت عائشہ و اُم مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ نے کی ہے۔

بخاری و مسلم نے ان کی چار احادیث کو روایت کیا ان میں سے ایک **لانفقه و لا سكنى للمعتده و اشقالها**۔ متفق علیہ ہے تین امام مسلم نے انفرادا روایت کی ہیں۔

(سہ ماہ منہاج لاہور۔ جلد 3 شمارہ 0-1 جنوری۔ 1985ء)

پردے کا ارتقاء واہمیت

مولانا ریاض الحسن نوری

دور قدیم میں پردہ:

صنف نازک کے لیے پردہ کا طریقہ ابتدائے آفرینش سے چلا آ رہا ہے۔ قرآن میں آدم وحوا کا ذکر ہے کہ انہوں نے پتوں سے جسم چھپایا۔ عہد نامہ قدیم میں بھی برقع کا لفظ ہمیں کئی جگہ ملتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت مشہور انگریزی۔ رسالہ لائف کا بائبل نمبر موجود ہے۔ اس خاص نمبر میں اس وقت کو ایک آرٹسٹ نے تصویر بند کیا ہے جب تین فرشتے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس انسانی شکل میں آئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو انسان سمجھ کر فوراً بھنا ہوا بکری کا بچہ ان کی تواضع کے لیے لے آئے۔ یہ تمام واقعہ قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ اس تصویر میں اس وقت کو بھی قلمبند کیا ہے جب کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی خوشخبری سنائی۔ اس تصویر میں جو صفحات 2726 پر دی گئی ہے دیکھایا گیا ہے کہ تین مہمان جن کے پر بھی ہیں دروازے سے دور بیٹھے ہیں جب کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام دروازے کے نسبتاً قریب بیٹھے ہیں اور دروازے کے پیچھے پردہ سے حضرت سارہ علیہا السلام کھڑی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی ہیں حالانکہ سارہ علیہا السلام بہت بوڑھی ہو چکی تھیں مگر اس کے باوجود روایتی پردے کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جب فرشتے نے ان کو بیٹے کی خوشخبری دی تو ان کو ہنسی آ گئی کیونکہ وہ اس عمر ہی سے گزر چکی تھیں کہ ان کے بچہ پیدا ہو سکے۔ ہم تصویر تو نہیں دے سکتے کیونکہ تصاویر اور وہ بھی پیغمبروں کی گناہ کبیرہ سے کم نہیں۔ البتہ ان کی گفتگو جو لائف رسالہ نے دی ہے اس کے چند فقرے سن لیجئے۔ یاد رہے کہ بائبل کے مطابق نعوذ باللہ ایک فرشتہ خود خدا ہی تھا۔ اور کھانا گھر سے باہر میدان میں فرشتے بھی

ہار رہے تھے۔ (نعوذ باللہ)

God said "Sarah shall have a son" In the doorway,s arah laughed, "withered as I am, still to know enjoyment and my husband so old !"

یعنی خدا (فرشتہ) نے کہا کہ سارہ کے لڑکا پیدا ہوگا۔ دروازہ کے پیچھے ڈیوڑھی میں کھڑی سارہ ہنس پڑیں اور فرمانے لگیں کہ میں بوڑھی پھونس ہو چکی ہوں کیا اس عمر میں بھی مجھے خوشی مل سکتی ہے اور میرا خاوند بھی اتنا بوڑھا ہو چکا ہے۔

جس طرح ہمارے مذہبی گھرانوں کی بوڑھیاں بھی سخت پردہ کرتی ہیں اور مہمانوں سے بات کرتی ہیں تو دروازے کے پیچھے ہی سے بات کرتی ہیں اسی طرح کا رواج حضرت ابراہیم کے گھرانے میں بھی تھا۔ یاد رہے کہ حضرت ابراہیم کا دور سائنسی ترقی کا اعلیٰ ترین دور تھا۔ اس زمانے کے لوگ سائنس اور ریاضی میں ان بلندیوں کو چھو رہے تھے جن تک ان کے بعد آنے والے یونانیوں کی رسائی نہ ہو سکی جو دراصل ان ہی کے خوشہ چین تھے۔ ایٹمی سائنس دان جارج گیماؤ نے لکھا ہے کہ جدید کھدائیوں کے بعد بجلی کے سیل کے برآمد ہونے سے ثابت ہو گیا کہ وہ لوگ بجلی کے ذریعے زیورات پر سونا چڑھاتے تھے۔[1]

پس ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کے دور کے عرب سائنس اور ریاضی میں اٹھارویں صدی کے یورپ سے بھی آگے تھے۔

یہ وہی ابراہیمؑ ہیں جو سب انبیاء کے باپ ہیں اور جنہوں نے ہمارے مذہب کے پیرو کو مسلم کا نام دیا۔ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے۔

قدیم یونان میں پردہ اور عورت:

یونان کی عریانی اور فحاشی کی داستانیں تو بہت مشہور ہیں۔ یہاں ان کا کوئی ذکر نہیں کریں گے۔ بلکہ صرف تصویر کا دوسرا رخ بیان کریں گے۔ جس سے ثابت ہوگا کہ ایسی سوسائٹی میں بھی پردہ کا رواج کتنا رہا ہے۔ اور یہ کہ گھریلو شریف عورت کی عزت ہر سوسائٹی میں رہی ہے۔

Hans Licht لکھتا ہے کہ جدید دور کا نظریہ کہ عورتوں کی دو قسمیں ہیں ماں اور بازاری پردہ عورت قدیم ترین یونانیوں میں بھی موجود تھا۔ اور اسی کے مطابق ان کا عمل بھی تھا۔ جب یونانی عورت ماں بن جاتی تو گویا اس نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا ماں بننے والی عورت کی جتنی عزت یونانی کرتے تھے اتنی کسی کی نہ کرتے تھے۔ ماں بننے کے بعد عورت کا کام گھر سنبھالنا اور بچے پالنا اور لڑکیوں کی نگہداشت ہوتا تھا حتیٰ کہ ان کی شادی کردی جائے۔

یہی مصنف ہومر کے جوابوں سے ثابت کرتا ہے کہ نوجوان لڑکیاں گھروں کی محدود زندگی میں خوش رہتی تھیں اگر ایسا نہ ہوتا تو مرد ہرگز ان حالات کے منہ بولتے عمدہ نظارے نہ پیش کرتا۔

Would Homer have been able to ceart so charming an idyl as the Nausica a scenes, if the greek "Young Girls" had felt unhappy in the confinement of their domestic duties?

بیوی کی بے وفائی کو وہ لوگ سخت برا خیال کرتے تھے اور ٹروجن وار محض اس مفروضے کی بنا پر لڑی گئی کہ ہیلن نے اپنے خاوند سے بے وفائی کی تھی۔ اسی وجہ سے یونانی کلچر میں ہمیں ایسے لوگ ملتے ہیں جو عورتوں سے نفرت کرتے تھے۔

پھر مصنف لکھتا ہے کہ ہومر کی نظموں میں ہمیں عورتوں کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شروع دور میں بھی عورتیں صرف اندرون خانہ تک محدود رہتی تھیں۔

کہتا ہے کہ وہ عورتیں سب سے اچھی ہیں جن کی اچھائی یا برائی کسی قسم کا بھی ذکر سوسائٹی میں نہیں کیا جاتا شاعر اس غیر شادی شدہ لڑکی کے متعلق بہت اچھے الفاظ استعمال کرتا ہے جو اپنی ماں کے ساتھ ہر وقت گھر میں رہتی ہے۔

شاعر ان عورتوں کے سخت خلاف ہے جو اپنے ناز و ادا دکھانے کی شائق ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے برائیاں پھیلتی ہیں اس وجہ سے وہ احمق اور خودستائی کی دلدادہ پنڈورا کا ذکر کرتا ہے جس نے اپنا بکس کھولا اور تمام انسانیت کو برائیوں اور مصیبتوں میں مبتلا کردیا۔

مصنف مزید لکھتا ہے کہ ایتھنز کے لوگ بلند پایہ علمی گفتگو مردوں کے لیے روٹی

کی مانند ضروری سمجھتے تھے لیکن ان کے نزدیک عورتوں کی نفسیات مختلف تھی اس وجہ سے ان کی عورتوں کو کمرہ میں ہی محدود رکھا جاتا تھا۔

It was this that banished the women to the women's chamber.

شادی کے بعد بیوی کو نسبتاً زیادہ آزادی مل جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی گھر ہی اس کی حکومت کا علاقہ رہتا تھا۔ اس بات کا ثبوت کہ یونانی عورتیں گھروں سے باہر نہ نکلتی تھیں اس واقعہ سے مل سکتا ہے کہ جب Chaeronea کی خوفناک شکست کی خبر ایتھنز پہنچی تو ایتھنز کی عورتیں صرف گھروں کے دروازوں تک پہنچیں جہاں سے وہ غمگیں آوازوں میں اپنے خاوندوں اور باپوں اور بیٹوں کی خیریت دریافت کرتی تھیں۔ لیکن اس کو بھی عورتوں اور ان کے شہر کے شایان شان نہیں سمجھا گیا۔

The Women of Athens only ventured as far as the house doors,(Lycurgus Leocrates.40)where half sensless with sorrow they inquired after husbands, fathers and brothers but even that was considerd unworthy of them and their city.(6)

مصنف مزید لکھا ہے کہ Piutarch کے فلاں بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عورتوں کو باہر نکلنے کی اس عمر تک آزادی نہ ہوتی تھی جب تک کہ لوگ یہ نہ پوچھ سکیں کہ یہ عورت کس کی بیوی ہے بلکہ یہ سوال کرسکیں کہ یہ کس کی ماں ہے۔

مصنف کے خاص بیان سے مندرجہ ذیل نتیجہ نکلتا ہے۔

" That unmarried girls in particular need to be guarded, and that house keeping and silence befit married women."

یعنی غیر شادی شدہ لڑکیوں کی خاص طور پر حفاظت کرنی چاہیے اور شادی شدہ عورت کے لیے گھر کی دیکھ بھال اور خاموشی ہی زیادہ مناسب ہے۔

مصنف کے مندرجہ ذیل بیان سے یونان کی شادی شدہ خواتین کے پردہ کا اندازہ ہوسکتا

ہے۔ مصنف سپارٹا کی عورتوں کے نیم عریاں لباس کا ذکر بطور تقابل ایتھنز کا حال یوں بیان کرتا ہے۔

Even the married women was obliged to retire into the interlor of the house to avoid being seen throught the window by a male passer by.

یعنی ایتھنز میں شادی شدہ عورت کا یہ فریضہ تھا کہ وہ گھر کے اندرونی حصوں ہی میں رہے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی راہگیر کی نظر کھڑکی میں سے خاتون خانہ پر پڑ جائے۔

مصنف لکھتا ہے کہ یونانیوں نے عورتوں کی تین طرح کی تقسیم کر رکھی تھی جو یقیناً بہادری کا کام نہ تھا۔ یونانی کہتے تھے کہ لطف اندوزی کے لیے فاحشہ عورتیں ہیں۔ ذاتی خدمت کے لیے داشتائیں یا لونڈیاں Concubines ہیں اور شادی شدہ عورتیں اس لیے ہیں کہ ہمارے لیے بچے پیدا کریں اور وفاداری سے ہمارا گھر سنبھالیں۔

افلاطون کے نزدیک غیر شادی شدہ لوگوں کو جرمانہ ہونا چاہیے اور ان کے شہری حقوق سلب ہو جانے چاہئیں۔ سپارٹا میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ غیر شادی شدہ لوگوں کو سزا دی جاتی تھی بلکہ دیر سے شادی کرنے والوں کو بھی سزا دی جاتی تھی ان عورتوں کے دلالوں کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورت موت کی سزا دی جاتی تھی۔

مصنف قدیم یونانی کتاب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس کا مصنف کہتا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد اپنی اولاد کی عزت اور اخلاق کے معاملے میں اتنے حساس تھے کہ جب ایک باپ کو پتہ چلا کہ اس کی بیٹی شادی کے وقت کنواری نہ تھی تو اس نے اسے ایک اکیلے مکان میں بھوکے گھوڑے کے ساتھ بند کر دیا اور بھوک سے مر گئی Scholiast کا بیان ہے کہ وہ گھوڑا جنگلی تھا جس نے پہلے اس لڑکی کو کھایا اور پھر خود بھی مر گیا۔

مخلوط تعلیم پاگل پن کے مترادف ہے:

نوائے وقت بابت 25 نومبر 1984ء صفحہ کے مطابق کویت میں مخلوط تعلیم کے خلاف سعودی عرب کے شیخ عبدالعزیز نے فتویٰ جاری کیا ہے۔ اس کے پیش نظر مغرب کے دانشوروں کی رائے بھی سنیئے جب تمام یونان کے لوگ ٹرائے کے خلاف جنگ میں مشغول

تھے کیونکہ اس کے شہزادہ پیرس نے یونانیوں کی بے عزتی ہیلن کے ساتھ بالجبر زیادتی سے کی تھی اور خزانے بھی لوٹے تھے۔ تو Thetis اپنے بیٹے کو دور لے گئی کہ وہ Lycomedes کی لڑکیوں کے ساتھ جزیرہ Sycros میں پرورش پائے اور جنگ کی خوفناکیوں میں حصہ نہ لے مصنف لکھتا ہے کہ میرے علم کی حد تک قدیم یونان میں مخلوط تعلیم کا یہ ایک واحد واقعہ ہے ورنہ یونانی اس سے کہیں زیادہ ذہین اور عقل مند تھے کہ اس جیسی شرارت آمیز برائی کو برداشت کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایسی بات ہے جیسے کہ گھوڑے اور بیل کو ایک ساتھ ہل میں جوت دیا جائے۔

مصنف کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

That so far as I know it is certainly the oldest perhaps a unique example of co education in Greek andtiquity the Greek were too intelligent to tolerate such mischief, they would have called it a yoking tougther of horse and ox.

مذکورہ بالا فقرہ کے حاشیہ میں مصنف لکھتا ہے کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ Odysseus نے ٹروجن کی لڑائی میں حصہ لینے سے بچنے کے لیے پاگل پن کا بہانہ کیا ثابت کیا کہ اس نے گھوڑے اور بیل کو ایک ساتھ ہل میں جوت دیا ہے۔

گویا مخلوط تعلیم کو رواج دینا مصنف کے نزدیک پاگل پن کے سوا کچھ نہیں۔

قرون وسطیٰ کا یورپ ایک وسیع پاگل خانہ:

یونان کے علم وعرفان کا دور یورپ سے ختم ہوا تو بتدریج یورپ قعر مذلت میں گرتا چلا گیا۔ مورخ ٹیلر اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ۔

Rape and incest characterize the sexual life of the english in the first millenium of our era, and homosexuality and hysteria the years that followed ......It is hardly too much to say that medival Europ came to resemble a vast lunatic asylum.

یعنی عورتوں سے بالجبر زیادتی اور محرمات سے زیادتی سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں کے دوران انگریز قوم کا خاصہ تھی۔اس کے بعد کے صدیوں میں ہم جنسی اور ہسٹریا اس قوم کا خاصہ بن گئی پس یہ کہنا کوئی زیادتی نہ ہوگا کہ قرون وسطیٰ کے یورپ نے ایک وسیع پاگل خانے کی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔

ان سب حالات کے باوجود عورتیں سٹیج پر بالعموم کام نہ کرتیں۔ڈراموں میں ایکٹنگ مرد ہی کرتے تھے۔

ڈاکٹر Richerd Lewinsohn M.D لکھتے ہیں۔

For two thousand yeras acting was a men profession, women never appeared on the stage in antiquity......All female parts in tragedy and literary comedy were played by males often adolescent youths......in shakespear,s plays all female parts were still played by youths.

یعنی دو ہزار سال تک ایکٹنگ خاص مردوں تک محدود رہی۔قدیم دور میں عورت کبھی سٹیج پر آ کر کام نہ کرتی تھی......کامیڈی اور ٹریجڈی تمام قسم کے سٹیج ڈراموں میں لڑکے ہی لڑکیوں کا پارٹ ادا کرتے تھے......شکسپیئر کے ڈراموں میں عورتوں کے تمام پارٹ نوجوان لڑکے ہی ادا کیا کرتے تھے۔

تبدیلی:

اسلامی تہذیب کا اثر یورپ پر مزید پڑا تو اس کے اثرات اور زیادہ گہرے ہوئے اور رفتہ رفتہ تبدیلی آنے لگی۔حالات بانیجا رسید کہ عورتیں گھوڑے پر جب سوار ہوتیں تو ٹانگیں ایک طرف رکھتیں۔مردوں کی طرح دونوں طرف ٹانگیں رکھ کر سوار ہونا بے حیائی خیال کیا جاتا تھا۔رفتہ رفتہ وکٹوریہ کا زمانہ آ گیا۔جس کی حکومت کے دوران سلطنت برطانیہ نے اتنی ترقی کی کہ اس پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔رچرڈ اس دور کے متعلق لکھتا ہے۔

In the victorian age ledies had no legs, anything

which might suggest that women possessed nether limbs, even for the purpose of walking ,was regarded as objectionable......

یعنی وکٹوریہ کے دور میں عورتوں کی ٹانگیں نہیں ہوتی تھیں۔جس بات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کی ٹانگیں چاہے وہ چلنے کی خاطر ہی ہوتی ہوں اسے قابل اعتراض سمجھا جاتا تھا۔عورت کے نچلے بدن کے اعضاء کا خیال ہی بہت بے حیائی سمجھا جاتا تھا کمر سے نیچے عورتوں کے کوئی چیز نہ تھی' سوائے سکرٹ کے بلکہ سکرٹ کی کیٹر تہوں پر اس قدر مایا لگا ہوتا کہ تیز ہوا کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

پھر سکرٹ کے نیچے گھٹنوں تک کا انڈر ویر پہنا جاتا تھا۔اشتہاروں میں ایسے دکھایا جاتا تھا کہ ان میں کوئی جوڑ نہیں کیونکہ مردوں کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ عورتیں نیچے کیا پہنتی ہیں۔عورتوں کے پیٹ بھی نہیں ہوتا یہ محض سرکس کا مذاق نہ تھا بلکہ اس دور کا آئیڈیل تھا۔

ڈاکٹر اپنے کمروں میں پتلے رکھتے تھے۔جس جگہ تکلیف ہوتی عورت اس پتلے پر انگلی رکھ کر بتاتی۔پھر ڈاکٹر کپڑے کے اوپر سے مریضہ کے جسم کو ہاتھ لگا کر دیکھتا۔ایسا بھی مریضہ کے خاوند یا اس کی ماں کی موجودگی میں ہوتا تھا ورنہ کسی عورت کا اکیلی کسی ڈاکٹر کے ہاں جانا بے شرمی سمجھا جاتا تھا

ٹیلر وکٹورین دور کی اخلاقی اصلاح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لوگوں نے اخلاقی اصلاحات کو کافی حد تک قبول کیا۔تھیٹروں میں الو بولنے لگے اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

And to a considerable extent people accepted the new standard......Theaters were desterted.

اس دور میں ہندوستان کے مغلیہ حکمران شراب و کباب میں مست تھے۔جب محمد شاہ رنگیلے کو خفیہ رپورٹ دشمنوں کے متعلق آئی تو اس نے اس رپورٹ کو شراب میں ڈال کر کہا۔

اس دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولے۔

اس کے برعکس اسی دور میں انگریزوں کی اخلاقی حس اتنی تیز ہو چکی تھی کہ جس

سال مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے فوراً بعد 1858ء میں انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں بل پیش ہوا کہ شادی شدہ شخص کو بدکاری کی سزا موت ملنی چاہیے۔ پس اعلیٰ اخلاق کی بناء پر انگریزوں کو فتح ہوئی اور دہلی اور لکھنو جہاں نوابوں کے بیٹے تہذیب سیکھنے بیسواؤں کے ہاں جاتے تھے ان کو شکست ہوگئی۔

لیکن فتوحات عظیمہ اور دولت کی فراوانی کے بعد رفتہ رفتہ انگریزوں کے اخلاق گرنے لگے سائیکل کے آنے کے بعد عورتوں کے سکرٹ اونچے ہونے لگے اور جس سلطنت پر کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا اس کو بداخلاقی اور جنسی بے راہ روی گھن کی طرح کھانے لگی۔

اسی عرصے میں جنگ عظیم اول میں شکست کے بعد یورپ میں ایک نئی قوت ابھرنے لگی۔ ہٹلر کو آپ چاہے جتنا برا کہیں لیکن اس نے اپنی قوم کو اس قدر ترقی سے ہم کنار کیا کہ تمام یورپ لرزنے لگا۔ ہٹلر نے عورتوں کو دوبارہ یہ سبق دینا شروع کیا کہ تمہارا مقام گھر ہے نہ کہ بازار عورتوں نے اسے خوشی خوشی قبول کیا' ہٹلر نے عورتوں کو نیک اور مردوں کا چالباز بتایا تصویر کا یہ رخ بھی سامنے رہے۔

جرمنی کا معاشرہ سائنسی دور کا اعلیٰ معاشرہ تھا۔ جس نے آئن سٹائن جیسے سائنس دان پروان چڑھائے۔

نازی جرمنی اور پردہ:

ہٹلر کوئی ملا نہیں تھا۔ وہ بیشک ظالم تھا اور اس نے دنیا کو ایک مہلک جنگ میں دھکیل دیا۔ لیکن وہ اتنا باشعور ضرور تھا۔ اور جانتا تھا کہ دنیا کو فتح کرنے اور سائنسی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ان کی عورتوں کا اصل مقام گھر ہو اور وہ انجمن کی شمع نہ بنیں۔ نازی جرمنی کی سوشل تاریخ رچرڈ گرن برگر نے لکھی ہے اور اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

Woman,s role in Socitey......The slogan kids, kirk and kitchen.The cry woman,s place is home found an ever-wide -recho......hither......assured a deligation of

women.....in the Third Reich every woman would have a husband.....one of the earliest nazi party ordinances excluded women for ever from all leading positions in the party our displacement of women from public life occurs solely to restore their essential Jignity to them.....it it not that we did not respect women enough but we resprcted them too much that we kept them out of the miasma of parlimentary democracy.

یعنی عورت کا سوسائٹی میں کیا رول ہے؟ عورتوں کے لیے اس دور کا نعرہ بچے چرچ (خدا) اور باورچی خانہ تھا۔ ہٹلر کے پاس جب عورتوں کا وفد حقوق کے سلسلے میں بات کرنے آیا تو اس نے کہا کہ نازی جرمنی میں ہر عورت کو خاوند مل جائے گا۔ پارٹی کے ابتدائی قوانین کی رو سے ہی عورتوں کو پارٹی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز نہ کرنے کا اصول مرتب کر لیا گیا تھا۔ ہٹلر کا کہنا تھا کہ ہم نے عورتوں کو پبلک لائف سے جو علیحدہ کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کو عزت کا مقام دینا چاہتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ہم ان کی عزت نہیں کرتے بلکہ چونکہ ہم ان کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں اس لیے ہم ان کو پارلیمنٹری جمہوریت کی گندگی سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔

آگے چل کر مصنف لکھتا ہے۔

پولیس چیف کے آرڈر تھے کہ اگر کوئی عورت سگریٹ پیتی نظر آئے تو اسے فوراً روک کر ایک جرمن عورت اور جرمن ماں کے فرائض یاد دلائے جائیں۔ جو عورت پوڈر یا لپ سٹک لگا کر آتی تو اسے عورتوں کو لیگ کی میٹنگ میں شامل نہ ہونے دیا جاتا اور اگر کوئی عورت پبلک میں سگریٹ پیتی نظر آجاتی تو اس کی ممبر شپ ختم کر دی جاتی۔ عورتوں کو سپارٹا کی سادگی سکھائی جاتی کہ وہ کاسمیٹک کے بغیر گزارہ کریں سخت بستروں پر سوئیں اور مزیدار کھانے پکانے کے سلسلے میں زیادہ باریکیاں نہ دکھائیں۔

پبلک لائف سے عورتوں کو نکال کر اس کا یہ مداوا کیا گیا کہ عورتوں کی الگ لیگ بنائی گئی جس کے تحت وہ مردوں سے الگ رہ کر اپنے طور سے رفاہ عامہ اور سوشل ورک

کا کام کرتی تھیں' مصنف مزید لکھتا ہے کہ نازی زنانہ ٹیچرز ایسوسی ایشن نے کہنا شروع کیا کہ خواتین استانیوں کو بھی وجود قائم رکھنے کا حق ہے۔ بلکہ بچوں کی صحیح پرورش کے لیے ضروری ہے کہ ان کو بہترین ٹریننگ ملے۔ 1937ء میں مشہور نازی خاتون لیڈر فمینٹ کو سرکاری طور پر خاموش کر دیا گیا۔ عورت کی آزادی کی دیگر وکالت کرنے والی عورتوں نے عورتوں کی تعلیم میں مواقع کی کمی کے متعلق نازیوں کے اصولوں کے اندر رہ کر بات کرنی شروع کی یعنی اس کو تسلیم کرتے ہوئے کہ عورتوں اور مردوں کے دائرہ کار علیحدہ علیحدہ ہیں۔ انہوں نے کہنا شروع کیا کہ عورت ڈاکٹر تھکی ہوئی ماں اور بلوغت کے قریب لڑکیوں کو بہتر جسمانی اور روحانی آسائش فراہم کر سکتی ہے۔ استانیاں لڑکیوں کو بیالوجی وغیرہ کی تعلیم زیادہ مناسب طریقہ سے دے سکتی ہیں۔ خاتون وکلاء بچوں اور عورتوں کے طلاق مقدمات میں بہتر کام کر سکتی ہیں خاتون سائنس دان اور ماہر اقتصادیات گھریلو معاملات 'شہری پلیننگ اور ہاؤسنگ پالیسی بہتر طور پر مرتب کر سکتی ہیں۔ لیکن علمی پیشہ ور خاتون کا زوال شروع ہو گیا......

..........illustartes the erosion of the position of professional and academic women(18)

مصنف لکھتا ہے کہ میک اپ کو زور وشور سے غیر جرمن فعل قرار دیا گیا ان کا کہنا تھا کہ سب سے خلاف قدرت یہ چیز ہے کہ سڑک پر کوئی جرمن ایسی نظر آ جائے جس نے خوبصورتی کے تمام قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چہرہ پر مشرقی جنگی رنگ لگا رکھا ہو۔[19] ان باتوں کی وجہ سے اگر بس میں کوئی عورت میک اپ کیے نظر آ جاتی ہے تو اسے بیسوا ت لے غدار وطن کے نعرے سننے پڑتے یاد رہے کہ پہاڑی علاقوں کے جو لوگ جن میں بعض کی عمریں سو سال سے تجاوز کرتی ہیں اور حسن میں بھی میدانی لوگوں سے برتر ہوتے ہیں۔ کاسمیکس تو کیا ٹوتھ پیسٹ سے بھی ناآشنا ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں پاکستان کے سوشلسٹ بھی منہ بند کیے رہتے ہیں اور انہوں نے بھی کبھی اس زہریلی اور جنسی جذبات ابھارنے والی اشیاء پر فضول خرچی کے

خلاف کوئی آواز بلند نہیں کی حالانکہ اس پر پاکستان میں بھی امیر تو امیر غریب شہری عورتیں بھی بساط کے مطابق کافی خرچ کرتی ہیں جس کا کل میزانیہ اربوں تک پہنچتا ہے۔جمہوری گورنمنٹ چونکہ ٹیکس کا بیسواں حصہ بھی نہیں ملتا۔کمپنیاں ایکسائز والوں سے مل کر ٹیکس کی رقم کا 80 فیصد حصہ خود کھا جاتی ہیں۔گویا اس طرح سے عوام کی جیبیں تو کٹ جاتی ہیں لیکن حکومت کو اس کا عشر عشیر بھی وصول نہیں ہوتا۔کاسمیٹکس کی برائی ہو یا سگریٹ نوشی کی ہو یا ریفل وغیرہ کے نام سے قمار بازی ہو یا فلموں کے نام سے جنسی نمائش ہو۔برائیوں کی اجازت دے کر اس کی فیس یا ٹیکس لینے کا طریقہ حکومتوں نے کیتھولک پادریوں سے ہی سیکھا ہے جو گناہوں کے پرمٹ جاری کرتے تھے۔اور اس کی فیس وصول کرتے تھے۔یا روپیہ لے کر گناہ معاف کرتے تھے۔ان خرابیوں کے ردعمل میں پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا۔

رچرڈ گرن برگر دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

......girls who infringed the code perming their hair instead of wearing plaits......had it ceremoniously shaved off as punishment......white blowas dark searves virtually ankle length skirts and sturdy shoes......and just before the war calf length boots were becoming popular.

یعنی بقول مصنف انیسویں صدی کے ابتدائی عورتوں کی چوٹیوں کو آئیڈیل قرار دیا گیا اور جو عورت نے فیشن کے بال بنانا چاہتی مثلاً وہ مصنوعی طور سے بالوں کو گھونگریالے بناتی تو سزا کے طور پر اس کا سر مونڈ ڈالا جاتا۔

نازیوں نے عورتوں کو مکمل طور پر ستر عورت کی تلقین کی۔انہوں نے عورتوں کو ٹخنے تک تہ در تہ چنن والی سرکٹ پہننے پر مجبور کیا۔(جب کہ باقی یورپ میں گھٹنوں تک سکرٹ کا رواج تھا) سینوں کو چادر یا ڈوپٹے سے ڈھانپنے کی بجائے قمیض کے اوپر سے مزید ایک سفید بلاؤز استعمال کرنے کا حکم دے کر ان کو مکمل پردہ پوشی کا بندوبست کیا۔اس کے بعد سر پر کالے رنگ کے بڑے بڑے رومال باندھنے کا حکم دیا۔اور پیروں میں پنڈلیوں تک بوٹ

پہننے کا رواج جنگ سے پہلے عام ہو چکا تھا۔

گویا ہٹلر نے چہرہ پر نقاب کا حکم تو نہیں دیا لیکن جو مذکورہ بالا لباس مقرر کیا۔ اس میں ستر عورت کی اس سے زیادہ پردہ پوشی تھی جو آج کل پاکستانی عورتوں کے فیشنی برقعوں میں ہوتی ہے جن کو پہن کر وہ اکثر منہ کو کھلا رکھتی ہیں۔ ہٹلر نے جو کچھ کیا وہ مذہبی بنیاد پر نہیں کیا۔ وہ خدا کو مانتا بھی نہیں تھا۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ بھی خدا پر ایمان لے آیا تھا۔ بہر حال اس نے وہی اقدامات کیے جو اس کی قوم کی مادی ترقی کے لیے ضروری تھے۔ اور جس سے قوم کی جلد سائنسی وعلمی ترقی میں رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے۔

تاریخ انسانی میں روحانی ترقی سے قطع نظر مادی ترقی اور فوجی فتوحات کی دو مثالیں عظیم ترین ملتی ہیں۔ ایک تو اسلامی انقلاب جس کی ابتداء اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمائی اور خلیفہ دوئم کے دور تک جتنی ترقی اور فتوحات مسلمانوں نے جس تیزی سے کیں۔ اس کی کوئی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے!

دوسری مثال غالباً نازی جرمنی کی ہے۔ ہٹلر نے ایک سخت شکست کے بعد تباہ حال قوم کو جس تیزی سے ابھارا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ چند دنوں کے اندر یورپ کے بیشتر حصہ پر قبضہ کر لے اور جس حکومت پر سورج غروب نہ ہوتا ہو اس کا ناطقہ بند کر دے۔ اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔ درحقیقت انگریزوں کی وسیع حکومت کی پناہ کاری۔ ہندوستان کی آزادی بھی ہٹلر کی مرہون منت ہے۔ اگر ہٹلر اپنے غرور میں روس پر حملہ کی غلطی نہ کرتا تو تاریخ آج کچھ اور ہی ہوتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون یہی رہا ہے کہ وہ مغروروں کا سر ضرور نیچا کرتا ہے۔

اگر کسی قوم کو تیزی سے ترقی کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عورتوں کو قرآنی حکم وقرن فی بیوتکن پر عمل کرائے۔ ہٹلر نے بھی اپنے ملک کی عورتوں سے اس پر عمل کرایا رچرڈ گرن برگر لکھتے ہیں۔

......Nazi prescribed context of sex -coditioned spheres of activity ......married women doctors aand civil servants were dismissed immediately after the seizure of

power.....From June,1936 onwards womens could no longer act as judges or public prosecutors and female Assessoren (Assistant Judges, Assitant Teachers and so on were gradually dismissed womens were declard ineligible for jury service on ground that they cannot think logically or reason objectively, since they are ruled only by emotion(22)

یعنی نازیوں کا مقولہ یہ تھا کہ عورتوں اور مردوں کا دائرہ کار علیحدہ ہے اس وجہ سے انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی شادی شدہ عورتوں کو جو ڈاکٹر یا سرکاری ملازم تھیں نوکری سے برطرف کر دیا۔ 1936ء میں عورتیں جج سرکاری وکیل کے بطور کام کرنے سے بھی روک دی گئیں پھر آہستہ آہستہ نائب ججوں نائب ٹیچروں کے مقام سے بھی رخصت کر دی گئیں۔ یہ اعلان کیا گیا کہ عورتیں بطور جیوری بھی کام نہیں کر سکتیں کیونکہ وہ منطقی طور پر سوچ نہیں سکتیں۔ اور مدلل طور پر بحث نہیں کر سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر جذبات حاوی رہتے ہیں۔ پھر منصف لکھتا ہے کہ:

The new Regime proved its claim to be better protectors of family life by imposing curbs on equality of women abortion homosexuality and(conspicous) Prostitution Beggers were cleared from street .....

یعنی نئی حکومت نے خاندانی زندگی کے بہتر محافظ ہونے کے دعوے کو یوں ثابت کیا کہ عورتوں کی برابری اسقاط حمل ہم جنسی تعلقات اور قحبہ گری پر قدغن لگا دی گئی۔ فقیروں کو سڑکوں سے ہٹا دیا گیا وہ عورتوں کے لیے تکلیف دہ ثابت نہ ہو سکیں۔ شادی کے لیے قرض بچوں کے لیے وظیفے اور خاندانی الاؤنس مقرر کیے گئے شادی کے وقت ہزار مارک قرض دیے جاتے تھے۔ پھر بچوں تک ہر بچے کے پیدائش پر قرض کا چوتھائی حصہ بطور تحفہ معاف کر دیا جاتا۔ پھر قرضہ میں معافیوں کے علاوہ یہ بہت معمولی اقساط میں وصول کیا جاتا تھا یعنی اگر میاں بیوی دونوں کماتے ہوں تو ہر ماہ صرف 3 فیصد قرضہ وصول کیا جاتا اور اگر صرف مرد ہی کماتا تو ایک فیصد قرضہ ہر ماہ وصول کیا جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر بچہ

کی پیدائش پر الگ سے کچھ رقم انعام ملتی۔ جو ایک بچہ کے لیے زیادہ سے زیادہ سو مارک ہوتی اور جس کی کلی تعداد ایک خاندان کے لیے ہزار مارک سے متجاوز نہ ہوتی۔ گویا ہزار مارک قرضہ بھی تقریباً معاف ہی ہو جاتا اور مزید ہزار مارک تک بچوں کے پیدا ہونے پر انعام بھی مل جاتا تھا۔ 1933ء سے 1938ء تک کل گیارہ لاکھ سے زیادہ شادی کے قرضے دیے گئے جن میں سے 9 لاکھ 80 ہزار کے قرضے بچوں کی پیدائش پر معاف کر دیے گئے یہی نہیں بلکہ بچے پیدا کرنے والی ماؤں کو سوسائٹی میں عزت اور بلندی کا وہی مقام دیا جاتا تھا۔ جو کہ سرحد پر لڑنے والے بہادروں کو دیا جاتا تھا کیونکہ بچہ کی پیدائش کے وقت ملک وقوم کی خاطر یہ مائیں بھی اپنی جان کو اس طرح خطرہ میں ڈالتی تھیں جس طرح کہ سپاہی توپوں کے گولوں کے سامنے جان کو خطرہ میں ڈالتا تھا۔ ان عورتوں کی اتنی زیادہ عزت افزائی حکومت اور عوام کرتے تھے کہ ٹراموں اور بسوں میں لوگ کود کر اپنی سیٹ سے علیحدہ ہو جاتے اور سیٹ کسی حاملہ ماں یا ایسی ماں کو دے دیتے وہ چاہے حاملہ نہ ہوتی لیکن اس کے ساتھ چھوٹے بچے ہوتے۔

نازیوں نے سائنسی ترقی کے لیے اخلاقی اصلاح اور ترقی کو ضروری خیال کرتے ہوئے مزید بہت سے قدم اٹھائے۔

مصنف لکھتا ہے کہ میکلنبرگ کے پولیس چیف نے قانون بنا دیا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کا کوئی لڑکا یا لڑکی اگر کھلم کھلا سگریٹ پیتا دیکھا گیا تو اسے 150 مارک جرمانہ کیا جائے گا اور دو ہفتہ کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔ 9 مارچ 1940ء میں نوجوانی کے لیے قانون بنایا گیا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کا کوئی لڑکا یا لڑکی شام کے اندھیرے کے بعد گلیوں میں نہیں گھومے گا۔ مزید کسی ہوٹل یا سینما میں 9 بجے کے بعد بالکل نظر نہیں آئے گا۔ سوائے اس کے کہ کوئی بزرگ اس کے ہمراہ ہو۔ 1944ء میں قانون بنایا گیا کہ نوجوان اپنے بزرگوں کے بغیر ان فلموں کو بھی شام کے وقت نہیں دیکھ سکتے جن فلموں کا خاص بچوں کے لیے اجازت نامہ دیا گیا ہو۔ ایک موقعہ پر بعض نوجوانوں نے کہا کہ ہم سولہ سال کی عمر میں اچھے سپاہی بن کر میدان میں قتل ہو سکتے ہیں لیکن اٹھارہ سال کی عمر تک بڑوں کی فلموں

کو دیکھنے کے قابل نہیں ہو سکتے' بڑوں کی فلمیں کیسی ہوتی تھیں؟ مصنف کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ فلموں سے غیر اخلاقی عشق بازی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور فلم سازوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسی فلمیں بنائیں جن سے واضح ہو کہ نکاح کا رشتہ ہرگز نہیں ٹوٹ سکتا اور جن سے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو وارننگ مل جائے۔ مزید جنگی جذبہ ابھارنے اور جنگی تکنیک سکھانے کے لیے فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے گورنگ نے میدان جنگ سے دس ہزار پیادہ فوج اور ایک ہزار سوار فوج اور سو توپیں منگوائیں تاکہ مطلوبہ فلمیں تیار ہو سکیں چاہے اس سے جنگی قوت میں کمی ہی کیوں نہ ہو۔

یاد رہے کہ نازی مذہب کے سخت دشمن تھے۔ وہ خاص قسم کے سوشلسٹ تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے۔ کہ مخلوط سوسائٹی فلم گانے' سگریٹ پینے والی' اور راتوں کو دیر تک جاگنے والی اور فیشن پرست' آرام طلب سوسائٹی نہ صحیح طور پر محنت طلب سائنسی علم حاصل کر سکتی ہے اور نہ جنگ میں فتح حاصل کر سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ایسے اقدامات کیے جو بظاہر مذہبی لوگوں کی مانند تھے۔

مشہور امریکی ماہر Galbraith لکھتا ہے کہ پچھلی جنگ عظیم کے دوران جرمنی میں عورتوں کو جنگی کاموں میں نہیں لگایا گیا۔ جرمنی میں WAC یا Waves کی مانند عورتوں کی کوئی تنظیم نہیں بنائی گئی تھی۔ سوائے کھیتی باڑی کے عورتیں کام نہیں کرتی تھیں۔

عورتوں سے کام نہ لینے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نازیوں یعنی نیشنل سوشلسٹوں کا اصول یہ تھا کہ عورت کا مقام اس کا گھر ہے یا بچے پیدا کرنے کا کمرہ۔

جیسے سیل مین کا کمال یہ ہے کہ سائبیریا میں رہنے والے کو فریج فروخت کرے اسی طرح لیڈر شپ کا کمال یہ ہے کہ عورتوں میں ان تمام طریقوں کو رائج کر دے جن کو جدید عورتیں پسند نہ کرتی ہوں اور پھر وہی عورتیں خوشی خوشی ان چیزوں کو اپنا لیں۔

ہٹلر نے نہ صرف عورتوں میں باپردہ لباس کو مقبول بنایا اور پوڈر و لپ سٹک سے ان کو متنفر کیا بلکہ وہ ان کا ہیرو بھی بن گیا۔ عورتیں اس کے احکام نہ صرف مانتی تھیں بلکہ اس پر فدا بھی تھیں لیڈر بھی تسلیم کرتی تھیں۔ ہٹلر کا نعرہ بلند کرتی تھیں۔ اس نے نوجوانوں پر

پابندیاں لگائیں لیکن ان کی محبت کم نہ ہوئی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو انہوں نے ایسی دنیا میں جینا گوارہ نہ کیا جس میں ہٹلر نہ ہو۔عورتوں نے مردوں سے زیادہ بڑے پیمانہ پر خودکشی کر کے ہٹلر کے عظیم اور محبوب لیڈر رہونے کا ثبوت مہیا کیا۔ اگر پاکستان میں کوئی واقعی سمجھدار لیڈر ہو تو وہ عورتوں کو حیا اور پردہ کا سبق دے کر بھی ان کا محبوب لیڈر بن سکتا ہے۔نفسیاتی اصولوں سے تبلیغ کے ذریعے ہر چیز ممکن ہے۔

عورتوں کی آزادی کی جدید تحریکات:

نازیوں یعنی جرمنی کے سوشلسٹوں نے سوشل زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا وہ کوئی ہٹلر کی ذاتی اپچ نہ تھی اور نہ ہی مذہبی اقدام تھا یہ تبدیلیاں دراصل جرمنی کے چوٹی کے سائنس دانوں اور ماہرین نفسیات کی تحقیقات تھیں جن کو ہٹلر نے عملی جامہ پہنایا۔ فرائیڈ اور اس کے بعد اس کے شاگردوں نے نفسیات میں تحقیقات کیں جس نے ساری دنیا کو متاثر کیا۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس میں جرمنی نے تمام مغربی دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اور ایٹم بم بھی دراصل جرمن سائنس دانوں ہی کا کمال تھا۔ آئن سٹائن کو بھی جرمنی ہی نے پیدا کیا اور پروان چڑھایا۔

فرائیڈ کے لائق ترین شاگرد کادل ابراہیم نے خاص عورتوں کے کامپلیکس بیالوجی کے متعلق اپنے تحقیقاتی مقالات میں ایک بہت عمدہ مقالہ لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ کامپلیکس بیالوجی اور فیزیالوجی کے اثرات کی بنا پر پیچیدہ کامپلیکس ہے اس لیے اس پر ہم ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے بہت سی عورتیں عارضی طور سے یا ہمیشہ کے لیے بچپن یا بڑے ہو کر اس کا نشانہ بنتی ہیں۔ نفسیاتی تجزیوں سے واضح ہوا ہے کہ عورتوں کی بہت بڑی تعداد مرد بننے کی خواہش کو چھپائے رکھتی ہے...... بہت سی عورتوں کو اس کا واضح احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ عورت ہونے کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ لیکن اس نفرت کی وجہ سے اکثر لاعلم ہوتی ہیں..... تقریباً ہر عورت میں اس کامپلیکس کا زیادہ بالکل خفیف اثر پایا جاتا ہے۔

بہت سی عورتیں اپنے عورت ہونے کے رول سے پوری طرح مطابقت پیدا نہیں

کر سکتیں ان کے لیے ایک راستہ یہ بھی کھلا ہوتا ہے کہ عورت و مرد دونوں کا کردار ادا کریں جسے ہم جنسیت کہا جاتا ہے۔

اب مصنف کے خاص الفاظ ملاحظہ فرمائیں وہ لکھتے ہیں۔

The love to exhibit their masculinity in their dress, in their way of doing their hair,and in their general behaviour: in Some Cases their homosexuality does not break,through to consciousness.the Repressde wish to be male in here Found in a sublimated form in the shape of masculine pursutis in intellectual and professional character and other allied interests, Such women do not. however.Consciously deny their femininity but usually proclaim that these interests are just as much feminine as masculine ones.They consider that the sex of a person has nothing to do with his or her capacities,Specially un the mental field. This type of women is well represented in the woman.s movement of today.

یعنی یہ عورتیں اپنی مردانگی اپنے لباس بال رکھنے اور بنانے کے طریقوں اور اپنے دیگر طور وطریق میں ظاہر کرتی ہیں۔ بعض عورتوں میں مردانہ پن واضح نہیں ہوتا بلکہ مرد بننے کی دبی ہوئی خواہش مردوں کے شوق اپنانے اور ان کی راہ پر چلنے اوران کے پیشے اپنانے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے یہ عورتیں اپنے عورت ہونے کا برملا انکار نہیں کرتیں بلکہ وہ یہ کہتی ہیں کہ یہ شوق جیسے مردوں کے لیے ہیں ویسے ہی عورتوں کے لیے بھی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ کسی شخص کی جنس کا اس کی کارکردگی سے کوئی تعلق نہیں خاص کر دماغی میدانوں میں۔ اس قسم کی عورتیں جدید دور کی آزادی نسواں کی تحریکوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ہٹلر کے دور کا نسوانی انقلاب جدید سائنس ونفسیات کی روشنی میں لایا گیا تھا۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا اس کی بنیاد محض عقل منطق اور جدید تحقیقات یعنی نفسیات' فزیالوجی اور بیالوجی کی تحقیقات پر مبنی تھی حال ہی

میں امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ماڈرن وومن ہے۔اس ایک مرد صحافی لنڈ برگ اور خاتون ماہر نفسیات ماریانا۔ایف فارنہم ایم۔ڈی نے لکھا ہے جو نفسیاتی امراض کی مشہور امریکن معالج بھی ہیں اِس کتاب کے نام کے نیچے عرفی نام The Out Sex یعنی گم شدہ جنس کا لفظ درج ہے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید امریکی دنیا سے عورت کی جنس ہی معدوم ہو چکی ہے۔اس کتاب کے پہلے باب کا عنوان Chimaera or Modern Women یعنی آگ کی پھنکار نے والی بلا یا جدید عورت مصنفین لکھتے ہیں کہ امریکہ میں آج عورت ہونا گذشتہ ادوار سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔آج کا دور تاریخ کا سب سے غم زدہ دور ہے۔روز بروز غم اور پریشانیاں بڑھتی جارہی ہیں۔اس کا سارا چکر عورتوں کے گرد گھومتا ہے۔اگر چہ اس چکر کو مردوں نے حرکت دی ہے۔اس کے آٹھویں باب میں آزادی کی تحریکات نسواں کا ذکر ہے کہ یہ عورتیں نسوانیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔یہ عورتیں صاف انکار کرتی ہیں کہ عورت کا کوئی خاص دائرہ کار نہیں۔وہ اپنے عورت ہونے ہی کا انکار کرتی ہیں۔یہ عورتیں شادی کو بھی ختم کرنا چاہتی ہیں۔آج کے دور سے بہت قبل عورتوں نے کہا تھا کہ ہمارے قانون میں اصل غلامی تو شادی کی غلامی ہے۔

Marriage,said " Mill is the only actual bondage known to our law"

ایک اور مصنف سٹیفن بار۔لے لکھتا ہے کہ اسے امریکہ کی سیاست کے دوران تحریک آزادی نسواں کی خواتین ملیں جو کہتی تھیں۔کہ اب امریکہ میں ایماندار عورتیں صرف فاحشہ عورتیں ہی رہ گئی ہیں جو سروس کی فیس لینے کو بہتر سمجھتی ہیں بجائے اس کے کہ وہ جنس کے عوض تمام عمر ایک خاوند کے پابند رہیں یہ یورپ کی تحریک آزادی نسواں کے نظریات ہیں۔

روس اور پردہ:

یہ حقیقت ہے کہ جرمنی کو یورپ یا امریکہ شکست نہ دے سکتے تھے۔لیکن ہٹلر سے

دو غلطیاں ہوئیں۔ اول تو اس نے نسل پرستی کے تعصب میں یہودی سائنس دانوں کو جنہوں نے جرمنی کی بدولت ایٹمی سائنس میں کمال حاصل کیا تھا ملک سے نکال دیا اور دوسری غلطی یہ تھی کہ سائنسی ترقی میں کمال حاصل ہونے کی وجہ سے مغرور ہو جانے کی بنا پر اس نے روس پر حملہ کر دیا۔ روس میں بھی اگر اخلاق یافتہ قوم بستی ہوتی تو شاید وہ بھی ہٹلر کا مقابلہ نہ کر سکتی لیکن روسیوں کی اخلاقی حالت بہر حال یورپ سے بہتر تھی۔ دوسرے روس کی برف باری بھی ان کے لیے نعمت ثابت ہوئی۔ ساتھ ساتھ سٹالن نے عوام کو عبادت کے وقت خدا سے دعائیں مانگنے کے لیے کہنا شروع کر دیا اور روس میں مخلوط تعلیم پر پابندی لگادی اور لڑکوں لڑکیوں کے تعلیمی ادارے الگ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی تفصیلات پلیکن کی مطبوعہ کتاب Soviet Education میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یا اردو کی مشہور کتاب سات سمندر پار میں۔

اس سلسلے میں ہم بتا دیں کہ روسی کمیونزم کے شروع کے دور میں؟ اور مذہب کی مخالفت میں بے حد جنسی آزادی دے دی گئی حتیٰ کہ نکاح کی رسم کو غیر ضروری قرار دے دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد جو تباہی اور بے راہ روی ہر طرف پھیلی تو لینسن ہی کے دور میں تبدیلی شروع کر دی گئی۔ کیونکہ مادر پدر آزاد سوسائٹی صنعتی ترقی کر سکتی تھی اور نہ علمی۔ رفتہ رفتہ سٹالن کے دور میں حالت یہ ہوئی کہ مخلوط تعلیم کے خلاف احکامات جاری کر دیئے گئے۔ جب سویتلانہ نے سکول کے زمانے میں سٹالن کی سالگرہ کے مواقع پر لوگوں کے کہنے سے اپنی تصویر بھیجی جس میں وہ مسکرا رہی تھی تو اسے وہ تصویر بری لگی۔ سویتلانہ لکھتی ہے کہ وہ نیچی نگاہیں اور فرمانبرداری کو پسند کرتا تھا اور اسے حیا سے تعبیر کرتا تھا۔

مزید سویتلانہ لکھتی ہے کہ وہ لباس کے سلسلے میں بھی مجھ پر سختی کرتا تھا اور مجھے ایسی باتیں کہتا کہ میں رونے پر مجبور ہو جاتی۔ مثلاً وہ کہتا کہ تم نے یہ چست سوئیٹر کیوں پہن رکھا ہے؟ اب تم بڑی ہو گئی ہو تم کو ڈھیلا لباس پہننا چاہیے۔ اسکے بعد میں یہی کر سکتی تھی کہ اس کے کمرے سے باہر آ جاؤں۔

گویا سٹالن نے ہٹلر کی مانند خاص قسم کا ڈھیلا بلاؤز پہننے کا حکم تو نہیں دیا لیکن کم

ازکم اپنی بیٹی کو وہ چست لباس سے ضرور روکتا تھا۔ غالباً مخلوط تعلیم کو خلاف قانون قرار دیئے کا خیال بھی اسے سوتیلا نہ کو جوان ہوتے ہوئے دیکھ کر پیدا ہوا سٹالن کے مرنے کے بعد مخلوط تعلیم روس میں عام طور پر دوبارہ رائج کر دی گئی۔ اور بہت سی پابندیاں ختم کر دی گئیں۔ لیکن اس کا کافی اثر ازبکستان وغیرہ کے علاقوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں ابھی تک باقی ہے۔ 1967ء میں امریکی صحافیوں کی ایک جماعت روس گئی تاکہ وہ یہ اندازہ لگائے کہ اب روس میں پچاس سال بعد کیا حالات میں وہ لکھتے ہیں۔

Secusion for women which is about the least,Russian " Parctice one might advocate among a people who only in the 1920's allowed their women to be unveiled. has reappeared in uzbekistan......not among the "backward"peasants, but amnong a few well-educated women party members who belong to the intelligentsia.and the idea. A kind of revese snobbery has been so appealing that it has spread to women of other ethnic groups that had no tradition of seclusion.

یعنی عورتوں کے لیے علیحدگی اور غیر مخلوط طرز زندگی جو کہ روسی طرز رہائش کے خلاف تھی اس کی وکالت ایسی قوم نہیں کر سکتی تھی جس نے ابھی 1920ء میں نقاب کا استعمال ترک کیا ہو۔ لیکن عورتوں کی علیحدگی ازبکستان میں دوبارہ نمودار ہوگئی ہے۔ نہ صرف پس ماندہ کسانوں میں بلکہ کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین میں بھی اس کا رواج دوبارہ شروع ہوگیا ہے۔ جو کہ پارٹی ممبر اور دانشور طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہ طریقہ جو کہ گویا جدیدیت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے ان نسلوں میں بھی پھیل گیا ہے جن میں پہلے بھی کبھی عورتوں کی علیحدگی کا رواج نہیں رہا تھا۔

صحافیوں کا اس سے مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی علیحدگی اور غیر مخلوط سوسائٹی کا رواج نہ صرف ازبکستان کی مسلمان دانشور عورتوں اور پارٹی ممبروں میں مقبول ہوا ہے بلکہ عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی ایسی خواتین میں بھی مقبول ہو رہا ہے جن کے آباؤ اجداد

میں بھی کبھی پردہ کا رواج نہ تھا۔

پاکستانی عورت اور گناہ کبیرہ:

روس سے ناچنے والیوں کا طائفہ جو پاکستان آیا تھا۔ ان ناچنے والیوں کا لباس ہماری پاکستانی عورتوں کے لباس سے زیادہ پردہ پوش ہے۔ ٹخنوں سے نیچے تک چلن دار قمیصیں اور سر پر بڑے بڑے رومال ہیں ایک تصویر میں بڑے دوپٹے لپیٹے ہوئے جن میں سے ایک بال بھی نظر نہیں آ رہا۔ ایک عورت نے تو چادر گرم موسم میں بھی پوری طرح لپیٹی ہوئی ہے کہ سینہ مکمل مستور رہے (نوائے وقت جمعہ میگزین 2 تا 8 نومبر 84ء) یاد رہے کہ یہ کوئی خواتین خانہ نہیں ہیں بلکہ پیشہ ور ناچنے والیاں ہیں جن کا لباس ہماری ان پاکستانی لیڈر خواتین سے کہیں زیادہ باپردہ ہے جنکی تصاویر ہمارے روزناموں کی روزانہ زینت بنتی ہیں سر ڈھکنا تو ہماری نمازی خواتین نے بھی سوائے نماز کے بالکل ترک کر دیا ہے حالانکہ سر شرعاً ستر عورت میں شامل ہے جس کا کھلا رکھنا یقینی اور اجتماعی طور سے گناہ ہے۔ اگر اسے صغیرہ بھی قرار دیا جائے تو یہ اصول سب کو معلوم ہے کہ اصرار سے صغیرہ کو کبیرہ قرار دیا جاتا ہے تو ہمارے علماء کو عورت کی پوری اور نصف دیت پر تو اصرار ہے لیکن اس گناہ کبیرہ کے عام ہو جانے سے ان کے ابرو پر بل نہیں آتے کیونکہ اس کا عام رواج ہو چکا ہے۔

آج کل شہادت کا بھی مسئلہ چل رہا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ سوال بھی اہم ہے کہ جو عورتیں یا مرد گناہ صغیرہ پر اصرار کرتے ہیں یعنی لگاتار گناہ صغیرہ کیے جاتے ہیں ان کی گواہی کہاں تک عدالت میں مقبول ہو سکتی ہے؟ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ فاسق مرد کی گواہی صفر یعنی بالکل نامقبول ہوگی اور متقی عورت کی گواہی بہر حال مقبول ہوگی اور فاسق ہزار مرد بھی ہوں ان سے بہر صورت متقی عورت کی حیثیت بلند ہوگی۔

امریکہ میں عورت کی تذلیل:

سٹیلے اور پارسل وغیرہ ماہرین لکھتے ہیں جس کا ملخص یہ ہے کہ جدید تہذیب نے عورتوں کی خوبصورتی کی حد سے زیادہ اہمیت کا ذکر کر کے ان کو کاسمیٹک کے استعمال پر مجبور

کر دیا ہے۔ امریکہ میں ہر شخص خوبصورتی کے مقابلوں کو ہر شام گھنٹوں دیکھ سکتا ہے جنسی اشیاء کو گوشت کے ٹکڑوں کی مانند نمائش میں دیکھنے دکھانے کا مقابلہ کم عمر مثلاً 8 تا 13 سال کی لڑکیوں میں بھی پھیل گیا ہے۔ مائیں بھی ان مقابلوں کو دلچسپی سے دیکھتی ہیں۔ ایک ماہر Hoygs کہتا ہے۔

No more delumanised victim can be found...... than Marilyn Monroe......wholly unrealised female destroyed her, Hers was a feminine American tragedy.

یعنی میری لین منرو سے بڑھ کر مثالی شکار نہیں مل سکتا جس میں سے انسانیت کو نکال باہر کر دیا گیا ہو۔ اس کو عورت ہونے کا احساس پیدا نہ ہو سکا۔ اس وجہ سے وہ تباہ ہو گئی (خودکشی کر لی) یہ ایک امریکی عورت کی ٹریجیڈی ہے۔ مردوں کی تابع سوسائٹی میں ٹانگوں سینوں کولہوں وغیرہ کی نمائش کی جاتی ہے۔ پھر اس بناپتی عکس سے پوری قوم شہوانی جذبات اور عورتوں کی تذلیل سے تسکین حاصل کرتی رہتی ہے۔ اسکے بعد سٹینلے وغیرہ لکھتے ہیں کہ امریکن اخبارات۔ رسائل وغیرہ سے وہاں کے عورت دشمن ذہنی مرض Antiwoman phobia کا مکمل ثبوت مل جاتا ہے۔ اس لٹریچر سے لوگ بدکاری، قتل اور اذیت رسانی سیکھتے ہیں۔ یہ لٹریچر مردوں کے لیے ہوتا ہے جس میں ہر طرح عورت کی تذلیل ہوئی ہے۔ رسل کہتا ہے کہ عورت کو بطور انسان نہیں دیکھا جاتا بلکہ محض ایک چیز Things کے طور سے دیکھا جاتا ہے اور بالجبر زیادتی اساسی طرز فکر کا نتیجہ ہوتی ہے۔[41]

ژنگ لکھتا ہے کہ مردوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے جتنی محنت شاقہ امریکن عورت کو کرنی پڑتی ہے اتنی دنیا میں کسی ملک کی عورت کو کرنی نہیں پڑتی۔ طرح طرح کی مالشیں اور نہ معلوم کیا کیا جتن کرتی ہیں۔ W.L George لکھتا ہے کہ تقریباً تمام عیسائی علماء عورت کو خطرہ سمجھتے تھے اور اس وجہ سے عورتوں سے نفرت کرتے تھے۔ یہ عیسائی بھی یہودی یونانی اور رومن نظریہ کے مطابق سمجھتے تھے کہ انسان دراصل صرف مرد ہی ہے اور عورت محض دم کی مانند ہے اور یہ انسان سے نچلے درجے کی مخلوق Sub Man ہے۔

Mildred Daley Pagelow ہے کہ یورپ میں 70 لاکھ عورتوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

جب ظلم کے خلاف آواز کے لیے تمام دنیا سے عورتیں بلجیئم میں جمع ہوئیں اسی وقت ایک فلم Snuff نسوار نامی میں جس طرح عورتوں کو اذیت دینے ۔ بالجبر زیادتی کرنے قتل اور اپاہج بنانے کے سین دکھائے گئے تھے وہ ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایکٹنگ نہیں بلکہ سچ مچ یہ مظالم کیے جارہے ہیں لوگوں کا کہنا تھا کہ سین اصلی تھے یعنی واقعی سچ مچ ظلم اور حقیقی قتل کر کے فلم بنائی گئی تھی۔

اگر ہم سابقہ 20 سال کی تاریخ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ لاتعداد ایسے قاتل گزرے ہیں جنہوں نے بالجبر زیادتی کے بعد اتنی بچیوں اور عورتوں کو قتل کیا کہ ان کو تعداد بھی یاد نہیں۔

بقول مشہور عالم ماہر نفسیات ژنگ ہر قوم کا ایک اجتماعی تحت الشعور ہوتا ہے۔

The Collective unconscious is a real fact in human affairs.

پس ہم یورپ کی سوشل تاریخ سے اس واضح نتیجے پر Lee. H. Bowker سے متفق ہیں کہ یورپ کے اجتماعی تحت الشعور میں عورت سے نفرت اور اس کی تذلیل کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔اس کا واضح اثر ہمیں وہاں کی عدالتوں اور محکمہ پولیس میں آج نظر آتا ہے۔

عدالتوں کا سلوک:

کہنے کو تو امریکی عورت نے آزادی حاصل کر لی خود عدالتیں ان سے جو سلوک کرتی ہیں متعدد عدالتی فیصلوں سے واضح ہو جاتا ہے۔

پھر مصنف لکھتے ہیں۔

As has been previously discussed the jury is more likely to sympathise with the assailant particularly when there is evidence of the parties having formerly some sort of interaction. Male jurors

are especially likely to be unsympathetic to prosecution in such situations.

یعنی جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔اس بات کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ جیوری حملہ آور سے زیادہ ہمدردی رکھے۔خاص طور سے ایسی صورت میں جبکہ یہ بات سامنے آ جائے کہ حملہ آور اور عورت میں پہلے سے واقفیت تھی۔

جیوری کے مرد ممبر تو خاص طور پر سزا دینے کے حق میں نہیں ہوتے کیونکہ وہ اپنا ناطہ مظلومہ عورت کی نسبت ظالم مرد سے زیادہ جوڑتے ہیں۔

اصلاحی اقدامات:

کم عمر نوجوانوں کی جنسی حرکات کو روکنے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ ایسے مواقع ہی نہ دیئے جائیں کہ کسی قسم کی بے راہ روی پیدا ہو سکے۔اس کا طریقہ یہی ہے کہ بڑی بوڑھی لڑکیوں پر پابندیوں اور دیکھ بھال کو کڑا کر دیں اور ان کی سوسائٹی کو مزید غیر مخلوط بنایا جائے۔چین کے ایک اسکول کا حال جو 1964ء میں ہوانگ نے بیان کیا ہے۔ اور سویت یونین کا جو ذکر Mace نے 1963ء میں تحریر کیا ہے ان کی تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اقدامات سے نوجوانوں کی بے راہ روی کو اگر بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا تو کم ضرور کیا جا سکتا ہے۔لیکن اگر ہم یہ نتائج حاصل کرنے کے متمنی ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کمیونسٹوں کی مانند سخت ڈسپلن اور نظم قائم کریں اور لڑکے لڑکیوں کی آزادیوں میں کمی کر دیں۔

ہم روسی چینی یا نازی سوشلزم کے ہرگز طرفدار نہیں ہیں اور نہ ہی انگریز محققین کے طرف دار ہیں۔لیکن یونانیوں سے لے کر جدید دور کے عقلمند سوشلسٹ' ماہرین نفسیات اور چوٹی کے مفکر سائنس دان سب ہی اس کے قائل ہیں کہ سوسائٹی کو بے راہ روی اور اس کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ مغرب کی مادر پدر آزادی کے بجائے غیر مخلوط معاشرہ قائم کیا جائے مرد اپنے دائرہ کار میں کام کریں اور عورتیں اپنے دائرہ کار میں

کام کریں۔ جہاں یہ دونوں دائرے ملتے ہوں تو بوڑھی عورتیں اور بوڑھے مرد Laison رابطہ کا کام دے سکتے ہیں عورتوں کے کالج سکول یونیورسٹیاں الگ ہوں۔ ان کی فیکٹریاں بھی الگ ہوں۔ جن فیکٹریوں میں عورتیں کام کریں اس میں مرد ملازم یا افسر نہ ہوں۔ خاص حالات میں چند مقامات پر بوڑھے لوگوں سے کام لیا جا سکتا ہے جو عمر رسیدہ ہونے کے علاوہ نیک خدا ترس اور با اخلاق بھی ہوں۔

ایک خاتون مصنف کیرل سمارٹ لکھتی ہیں کہ ہمیں ان حالات کو بالکل تبدیل کر دینا چاہیے جن سے بے راہ روی پیدا ہوتی ہے اور ان کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہمت افزائی کرنی چاہیے ان کے خاص الفاظ یوں ہیں۔

To encourage ....the removal of conditions conducing to promiscuity

ڈبلیو' وائی' ایم سی' اے نیو پارک کی خاتون پروگرام ڈائرکٹر لکھتی ہیں کہ فلم ایک ایسی چیز ہے جس سے خلاف توقع عورتوں کے جذبات بھی برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔

پس مذکورہ بالا خاتون پروگرام ڈائرکٹر کے بیانات سے یہ نتیجہ واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ بے راہ روی روکنے کے لیے ضروری ہے کہ عورتیں چست لباس نہ استعمال کریں بلکہ باپردہ لباس استعمال کریں اور یہ کہ فلم دیکھنا عورتوں کے لیے بھی بے راہ روی کا باعث بن سکتا ہے۔ اخبارات میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ فلم ایکٹرس بننے کے لیے چھوٹے شہروں کی لڑکیاں بڑے شہروں کا رخ کرتی ہیں اور یہ سفر ان کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔

پس جو لڑکیاں یا عورتیں چست لباس پہن کر سڑکوں پر نکلتی ہیں وہ چاہے خود بہت ہی پارسا ہوں یا بے حس ہوں لیکن بہت سے مردوں کے لیے وہ گناہ میں ملوث ہونے کا سبب بن جاتی ہیں۔

یہ بات تو آپ نے سنی ہوگی کہ نیکی کی طرف رغبت دلانے والے کو بھی نیکی کا ثواب ملتا ہے اسی طرح برائی کی طرف رغبت دلانے والے کو بھی برائی کا گناہ ملتا ہے۔ اس میں عورت مرد کی کوئی تفریق نہیں۔ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ مدینہ کی عورت

ایک حسین نوجوان کے لیے اشعار پڑھ رہی ہے تو آپ نے اس عورت کو کچھ نہیں کہا لیکن اس نوجوانوں کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا اور کہا کہ تو اور عمرؓ ایک شہر میں نہیں رہ سکتے۔ پھر کچھ دنوں بعد ایسے واقعہ کے بعد اس کے چچازاد بھائی کو جو بہت حسین تھا مدینہ سے جلاوطن کر دیا۔

دور جدید کا چوٹی کا ماہر نفسیات لکھتا ہے کہ میرے لیے خوبصورت عورت خوف کا باعث ہوتی ہے اصولی طور پر خوبصورت عورت سے سخت مایوسی پیدا ہوتی ہے۔

مزید ژنگ کے مطابق امریکن شادیاں سب سے غم زدہ تباہ کن ہوتی ہیں۔

بقول ژنگ امریکہ دنیا کا سب سے غم زدہ ملک ہے۔

America is the most tragic country in the world.

بیوہ کی تنخواہ کا مالک بھی خاوند بن جاتا ہے اور اس طرح سے یہ تنخواہ بھی بیوی کو شادی شدہ ہونے کی صورت میں مظلوم بیوی کو نہیں ملتی۔

جدید قرون وسطیٰ کا یورپ پاگل خانہ سے بدتر ہے:

بدترین پاگل پن کی نشانی عجیب وغریب ظالمانہ جنسی حرکتیں۔ بے مقصد قتل اور وہ بھی تھوک کے حساب سے اور اجتماعی بے مقصد خودکشی سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ چیزیں قرون وسطیٰ کے وسیع یورپی پاگل خانہ میں شاذ ونادر پائی جاتی تھیں یہ بیسویں صدی کی پیداوار ہیں۔ 1960ء میں ایک کتاب چھپی تھی جس کا نام ''قتل کا انسائیکلوپیڈیا'' تھا۔ 1982ء میں دوسری کتاب چھپی تھی جس کا نام ہے۔ Encyclopedia of Modern Murder یعنی جدید دور کے قتل کا دارالمعارف اس کے دیباچہ میں 1960ء کے بعد کے جدید ترین دور کو قتل کا زمانہ ''Age of Murder'' کا نام دے کر مصنف لکھتا ہے کہ 1960ء میں سابق کتاب کی تکمیل کے بعد سے مہذب دنیا میں تشدد کا نیا خوفناک دور شروع ہو گیا ہے اس دور کی خاص بات بے مقصد قتل ہے اکتوبر 1982ء میں نامعلوم شخص نے دواؤں کے دو کانوں میں جا کر درد دور کرنے والی دواؤں کی شیشیوں میں خطرناک ترین زہر کے کیپسول ڈالنے شروع کر دیئے۔ سب سے پہلے بارہ سال کی لڑکی

موت سے ہم آغوش ہوئی اور چند دنوں میں سات اموات ہوگئیں۔ایک ہفتہ بعد کسی نے آنکھوں کی دوائی میں تیزاب ملانا شروع کر دیا۔جو دوا استعمال کرتا تو وہ درد و کرب سے چیخنے لگتا۔چند ہفتوں میں امریکہ میں سو سے زیادہ اشخاص نے اس واقعہ کے بعد اس طرزِ عمل کی نقالی کی پھر کچھ سر پھروں نے ٹافیوں میں زہر ملانا شروع کر دیا یا سیب وغیرہ میں بلیڈ یا سویاں ڈالنی شروع کر دیں۔حکومت نے بچوں کے لیے وارننگ نشر کی اور لاتعداد بچوں کو ہنگامی طور پر ہسپتال لے جانا پڑا۔

نومبر 1980ء میں دو کم عمر نوجوان لاس اینجلس کی سڑکوں پر نکلے اور بیس منٹ میں بغیر وجہ کے چار آدمیوں کو مار ڈالا۔تین دن بعد تین نوجوان نکلے اور اس ڈرائیور کو جو سگنل کی بناء پر رکا ہوا تھا گولی ماردی تھی اور ہنستے ہوئے بھاگ گئے۔ایک نقب زن گھر میں داخل ہوا اور ماں اور پھر اس کے کھیلتے ہوئے بچے کو مار ڈالا۔دو چوروں نے ایک لڑکی اور اُس کے ساتھی کو روک کر انکے روپے لے لئے پھر بغیر وجہ لڑکی کو گولی ماردی۔تین آدمی کار میں سے نکلے ان میں سے ایک نے گردن باہر نکالی اور انجان بچے کو گولی ماردی۔

نفسیاتی طور پر شاید کسی جرم کو بالکل بے مقصد کہنا بالکل صحیح بات نہ ہو۔جائس ہف وغیرہ قاتلوں کا کہنا تھا کہ ان کو آدمی مارنے میں وہی لطف آتا ہے جو ہرن یا پرندوں کے شکار میں آتا ہے 1960ء سے پہلے اس قسم کے جرائم بالکل نادر تھے اور جو ہوئے بھی وہ 1950ء تا 1960ء میں ہوئے اگلی دہائی میں ایسے جرائم بڑھنے شروع ہوگئے۔نومبر 1966ء میں سمتھ نے پانچ عورتوں اور ان کے دو بچوں کو زمین پر لیٹنے کا حکم دیا۔پھر سب کے پیچھے سے سروں میں گولی ماری دی۔بعد میں اس نے بتایا کہ ایسا اس لیے کیا تاکہ لوگ مجھے جان جائیں اور میرا نام ہو۔اس کے استادوں نے بتایا کہ یہ شخص مثالی طالب علم تھا اور اس سے تشدد کے رجحانات بالکل نہ تھے۔اگلے صفحات میں آپ کو درجنوں ایسے واقعات ملیں گے۔

قدیم دور میں یونان کے ظالم حکمران اور روما کے شہنشاہ اس طرح کی چیزیں کیا کرتے تھے مشکل یہ ہے کہ آج کے دور میں لاکھوں انسان ایسے ہیں جن کے پاس فالتو

وقت بھی ہے اور روپیہ کے ساتھ آرام و آسائش بھی حاصل ہے۔ آرام و آسائش سے بوریت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن بدن زیادہ سے زیادہ مجرم کیلی گولا کی مانند ہو گئے ہیں جس نے خلیج میں بہت سے جہازوں کا پل بنوایا وہاں جا کر لوگوں کو سمندر میں دھکا دینا شروع کر دیا۔ یونان کا Phalaris انسانوں کو زندہ بھون دیا کرتا تھا۔ اور فیرا کا سکندر لوگوں کو کتوں سے پھڑوا کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ آج کے دور میں لاکھوں لوگ اتنے آرام و آسائش میں رہتے ہیں اور وہ وقت بھی ان کے پاس فالتو ہوتا ہے کہ یونان کے جبار اور روما کے بادشاہ بھی ان پر رشک کرتے۔ اسی وجہ سے آج کے مجرم قدیم رومن شہنشاہوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ تھوک کے حساب سے قتل کرنے والوں کے دماغ میں خرابی ہوتی ہے یا ان کی شخصیت ہی ایسی ہوتی ہے...... یہ لوگ سنسنی خیزی کی خواہش کی تکمیل میں قتل کرتے ہیں۔ اس کتاب میں رومن بادشاہوں جیسے بہت سے واقعات ملیں گے۔ لیکن سینکڑوں اور بھی ہیں جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بے مقصد قتل کرنے والے لوگوں میں بہت سے لوگ عام لوگوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر میں ہم غصے کا احساس پاتے ہیں۔ یہ کسی نہ کسی کو قصوروار گردانتے ہیں۔ انگریز ناولسٹ میریز کہتا ہے کہ معیار زندگی کے بلند ہونے اور تعلیم کے عام ہو جانے سے لوگوں کو حقوق کا زیادہ احساس ہو گیا ہے...... 1976ء میں تین امیر نوجوانوں نے 26 بچوں سے بھری ہوئی بس اغوا کر لی اور 5 ملین ڈالر کا مطالبہ کر ڈالا۔ اگرچہ بچے بعد میں کسی طرح بھاگ نکلے اور ان کو کچھ نہ مل سکا' لیکن اس اغوا کی وجہ یہ تھی کہ ان تین میں سے ایک کو ایک قصبے کے لوگوں سے شکایت تھی اور وہ اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن ایک قصبہ سے شکایت کا بدلہ دوسرے قصبے کے بچوں کے اغوا سے کیسے لیا جا سکتا ہے۔ ایک رومن بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کے قتل کا بدلہ یوں لیا تھا کہ اس شہر کے لوگوں کی دعوت کی اور پھر سب کو قتل کرا دیا۔ لیکن بچوں کی بس کا اغوا تو پاگل پن ہے۔ لیکن اغوا کرنے والے پاگل نہ تھے۔ ایسے واقعات جادوئی Magical سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کی مثال شترمرغ کے اپنے سر کو ریت میں چھپا لینے سے دی جا سکتی ہے۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ریگستان کے ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تم چھتری کیوں اٹھائے پھر رہے ہو۔اس نے کہا کہ یہ میں نے انگلینڈ میں خریدی تھی۔اس میں جادو کی۔خاصیت ہے۔اگر چاہتے ہو کہ بارش ہو جائے تو اس چھتری کو گھر چھوڑ کر باہر نکل پڑو۔اسی قسم کا جادوئی سوچ پیٹرک میں بھی پائی جاتی تھی جس نے ایک لڑکی کو قتل کیا اور اس کے اعضاء بھی کاٹ ڈالے۔یہ واقعہ برمنگھم میں 1959ء میں ہوا۔قاتل نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ عورتوں سے بدلہ لینا چاہتا تھا کیونکہ ان کی وجہ سے اس میں جنسی کھچاؤ پیدا ہوتا ہے۔دونوں باتوں میں کوئی منطقی تعلق نہیں ہے۔ جدید دور میں یہ جادوئی سوچ صرف مجرموں یا بے وقوفوں میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ نوبل پرائز حاصل کرنے والے Elias Canetti نے اخبارات میں اعلان کرایا کہ وہ اپنی یادداشتیں انگلینڈ میں نہیں چھپوائے گا۔کیونکہ انگریزوں نے اس کی سابقہ کتب کی پذیرائی نہیں کی تھی لیکن اگر چہ یہ سچ بھی ہے تو قصور کس کا ہے۔پھر اس انتقام کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ خود مصنف ہی کی رائلٹی کم ہو جائے۔یہاں بھی جادوئی سوچ کارفرما ہے۔جس طرح کہ خود شخص کے پیر کا انگوٹھا چارپائی سے ٹکرا گیا تو اس نے اپنی بیوی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔یہی جادوئی سوچ ہی لیڈر اور قاتل چارلس مین میں بھی پائی جاتی تھی۔جس کے گروہ نے تھوک کے حساب سے جنسی جرائم اور قتل کیئے۔اسی طرح کی سوچ امریکہ کے نسلی گروہوں میں بھی پائی جاتی ہے۔جس میں گورے کالوں کو یا کالے گوروں کو قتل کرتے ہیں۔حساس آدمی کی مثال ایسے شخص کی ہو جاتی ہے جس پر مسمر یزم کر دیا ہو۔وہ مصیبتوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنی شروع کر دیتا ہے۔یہ چیز مارکس منسین دونوں میں پائی جاتی تھی کہ انسانیت کی مصیبتوں کے ذمہ دار دوسرے لوگ ہیں۔پھر مارکس نے ان کو سرمایہ دار یا بورژ دوا کہہ دیا اور منسین نے ان کو سور کہ کر قتل کر دیا اور ان سے جنسی جرائم کا ارتکاب کیا۔

امریکی ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورت کھانا اور پینا ہے جب اس کو یہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو پھر دوسری چیزیں سوجھتی ہیں۔مثلاً سوسائٹی میں مقام حاصل کرنے کی سوجھتی ہے۔پھر مصنف لکھتا ہے:

A little over two centuries ago most time concerned that basic level of need. food and drink.people stole or murdred to stay alive ,sex crime was almost unknown......by the mid-twentieth century......since most civilized countries were welfare states and a man was no longer likely to strave,but sex crimes had become common place.

یعنی دو سال سے کچھ پہلے جرائم کا ارتکاب نبیادی ضرورت یعنی روٹی پانی کی خاطر ہوتا تھا۔لوگ زندہ رہنے کی خاطر جرائم کرتے تھے' جنسی تعلقات تقریباً نا معلوم تھے ....بیسویں صدی کے وسط میں چونکہ مہذب ممالک میں اکثر فلاحی ریاستیں قائم ہیں اور کسی کے بھوکے مرنے کا امکان نہیں رہا۔اس لیے اسطرح کے جرائم بڑھ گئے۔

روسیو کے فلسفہ کا اثر عورتوں پر یہ پڑا کہ انہوں نے بھی آزادی کا نعرہ لگایا۔لیکن یہ نتیجہ جو مغرب میں نکلا ہے۔وہ آپ کے سامنے ہے۔وہاں عورت کی تذلیل ہی نہیں۔بلکہ اس پر تشدد اوران کا جنسی قتل بھی روز بروز زور افزوں ہے۔ہر روز امریکہ میں ہزار عورتوں سے بالجبر زیادتی کی جاتی ہے اور مجرموں کو وہاں کی عدالتیں بری کردیتی ہیں۔تھوک کے حساب سے جنسی قتل اتنے بڑھ چکے ہیں کہ پچاس سال پہلے کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

پاکستان کے کالجوں کی لڑکیاں تو شاید یہ سمجھتی ہیں کہ اگر انہوں نے سر پر ڈوپٹہ لے لیا تو وہ غلام بن جائیں گی اور سر کھلا رہا تو گویا آزادی سے ہم کنار ہیں۔اسلام سے محبت کا دعویٰ بھی ہے اور پھر سر پر دوپٹہ تک پہننے کو عار سمجھنا اور اسلامی اقدار کو برا سمجھنا اسلام کہلائے گا یا منافقت یا کفر۔اس کا فیصلہ ناظرین پر ہے۔یہ تو ایمان کا مسئلہ۔پردہ نہ کرنا تو فسق ہے لیکن پردہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا تو کفر تک پہنچتا ہے۔

مغرب کے مرد کا یہ حال ہے کہ خود تو ٹائی باندھتا ہے۔سردی میں گلے کو بند رکھتا ہے۔گرم موزے پتلون پہنتا ہے اور عورت کو کہتا ہے کہ تمہاری آزادی اس میں ہے کہ گریبان کھلا رکھو ٹانگیں ننگی رکھو تاکہ تمہاری نمائش سے ہم لطف اندوز ہوتے رہیں۔اور عورتیں بے وقوف بنی ہوئی ہیں اسی آزادی پر خوش ہیں۔یہ جادوئی سوچ کی ایک مثالی ہے۔

مغربی دنیا پر بے حجابی کے اثرات:

بے حجابی، مخلوط تعلیم اور مخلوط سوسائٹی کے باعث مغربی دنیا آج ایک وسیع پاگل خانہ بنی ہوئی ہے مورخ ٹیلر لکھتا ہے کہ قرون وسطیٰ کا یورپ عورتوں سے بالجبر زیادتی اور محرمات سے بدکاری کی کثرت کی وجہ سے ایک وسیع پاگل خانہ بنا ہوا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کا یورپ اس دور کے یورپ سے مختلف نہیں۔ البتہ منافقت بڑھ گئی ہے۔ انیسویں صدی میں جب کہ انگلستان کی حکومت پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ یہ حال تھا کہ جب چاہے خاوند اپنی بیوی کے گلے میں رسی ڈال کر اسے مویشیوں کے بازار میں جا کر چند ٹکوں کے عوض فروخت کر سکتا تھا۔ اب یہ چیز نہیں رہی لیکن بیوی خاوند کی ویسے ہی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور امریکہ میں بہت سے خاوند بیویوں کو ان کی مرضی کے خلاف آپس میں وقتی طور پر تبدیل کر لیتے ہیں۔ جسے Wipe Swapping کہا جاتا ہے کہ [54] بالجبر زیادتی کا یہ حال ہے کہ امریکن پولیس کے مطابق 1973ء میں بالجبر زیادتی کے 159670 واقعات ہوئے یعنی تقریباً 440 واقعات روزانہ ہوتے ہیں اور روز بروز تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مصنفین لکھتے ہیں کہ جب عدالت میں ایسے مقدمات پیش ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مظلومہ پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے اور مظلومہ کی عدالت میں تذلیل ہوتی ہے۔ [55] یہی بات ایک خاتون مصنفہ نے بھی لکھی ہے۔ وہ فرماتی ہیں۔

Deed it may be argued still that in atemporary rape cases the victim is on still rather than accused(56)

مصنفہ مزید لکھتی ہیں کہ بالجبر زیادتی کی اطلاعات پولیس تک بہت کم پہنچتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

rape is well known as an offence which is Grossly under reported(57)

پس ہم کہ سکتے ہیں کہ پولیس کے بیان میں 440 روزانہ واقعات کے مقابلہ میں اصل جرائم اس سے کم از کم دوگنے ہوتے ہیں یعنی ہزار عورتوں کے ساتھ امریکہ میں روزانہ

بالجبر زیادتی کی جاتی ہے۔اس جرم میں امریکہ میں 1970 سے 1975 تک 48 فیصد اضافہ ہوا دو ماہ سے لے کر 85 سال کی عورت اس ظلم کا شکار بنتی ہے۔

پھر جو قحبہ گری فریقین کی مرضی سے مغربی ممالک میں کثرت سے ہوتی ہے۔وہ الگ ہے یہ دونوں چیزیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں عورتوں کا استحصال اس کثرت سے ہوتا ہے کہ مشرق میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔

عورتوں کی انٹرنیشنل رپورٹ کے مطابق جو امریکن صدر کو پیش کی گئی بالجبر زیادتی کے 49 فیصد واقعات میں تو سرے سے کوئی گرفتاری نہیں ہوتی۔ پھر جو بڑے لوگ گرفتار بھی ہوتے ہیں ان میں سے 58 فیصد کے خلاف سرے سے کوئی مقدمہ ہی نہیں چلایا جاتا۔ پھر ان میں سے بھی آدھے لوگ رہا کر دیے جاتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو قانون ہی ایسا ہے کہ جرم ثابت کرنا مشکل ہے۔دوسرے مظلومہ گواہی دیتے ہوئے بھی ڈرتی ہے۔[۵۸] پولیس کا سلوک زیادتی سے چھ گنا افسوس ناک ہوتا ہے۔

پھر آنسہ کارل کے نزدیک جنسی غیر مساوات اور عورتوں کے وسیع پیمانے پر استحصال کا سب سے بڑا ثبوت بالجبر زیادتی اور قحبہ گری ہے۔

Sexual diffentiation and exploitation are the basis of both prostitution and rape.

مذکورہ بالا بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ مغرب میں مساوات مرد و زن تو دور کی بات ہے وہاں تو عورتوں کا استحصال بہت بڑے پیمانے پر جاری ہے۔آنسہ کیرل مزید لکھتی ہیں۔

......So it can be seen that the chances of a conviction for rape are extremely small-

یعنی بالجبر زیادتی کے کسی مجرم کو سزا ملے۔جدید عدالتوں میں اس کا امکان بہت ہی کم ہے۔مزید لکھتی ہیں کہ انگلینڈ اور امریکہ میں اس جرم کے مجرموں کو شاذ و نادر ہی سزا ملتی ہے۔

عام خیال یہی ہوتا ہے کہ جس ملک میں جنسی آزادی بہت ہو اور قحبہ گری عام ہو کم از کم وہاں مائیں۔بہنیں اور بیٹیاں اپنے بیٹوں بھائیوں اور باپوں سے تو پوری طرح محفوظ

رہتی ہوں گی۔لیکن آج بھی یورپ وامریکہ میں وہی قرون وسطیٰ میں کم ازکم زبانی کلامی تو محرمات سے بدکاری کو برا سمجھا جاتا تھا۔لیکن اب تو کھلم کھلا اس بات کا پروپیگنڈا شروع ہوگیا ہے۔یہی نہیں بلکہ اس موضوع پر فلمیں بھی بنناشروع ہوگئی ہیں۔1920ء میں امریکہ میں صرف 6 فلمیں ایسی بنائی گئی ہیں جن میں محرمات سے نکاح دکھایا گیا تھا۔جب کہ 1960ء میں 79 فلمیں صرف اسی موضوع پر تیار ہوئیں ہفتہ وار امریکی رسالہ ٹائم نے اس موضوع پر جو مضمون چھاپا اس کا فقرہ ملاحظہ ہو۔

Arguing that the incest taboo is dying of its own irrelevance.

یعنی نکاح محرمات کو برا سمجھنا معقول بات ہے اس لیے یہ اپنی معقولیت کی وجہ سے ختم ہورہا ہے۔

ریسرچ سائنس دان ڈاکٹر۔

ڈیوڈ فنکل ہورنے جنسی مظلوم بچوں سے متعلق کتاب لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ محرکات میں سے بچے زیادہ تر شکار بنائے جاتے ہیں۔پھر سوسائٹی اس زیادتی کو برائی اور پسندیدگی کے ملے جلے **Anbivalant** جذبات سے دیکھتی ہے وہ لکھتے۔

On the other hand , unlike sexual aabuse, which is almost never joked about. incest is often the subject of ribald humor.innuendo and be like.

یعنی عام بے راہ روی کا مذاق نہیں اڑایا جاتا لیکن محرمات سے زیادتی کو مذاق میں ٹالا جاتا ہے۔مذکورہ تعلم سے ثابت ہے کہ محرمات سے زیادتی میں ان کو نہ صرف اذیت دی جاتی ہے بلکہ تذلیل بھی کی جاتی ہے۔خبر کا پہلو تو واضح ہے۔لیکن خاندانی عزت کی خاطر شکایت زبان پر نہیں لائی جاتی۔

نئی اور پرانی نسل یعنی باپ یا دادا کے بیٹی یا پوتی وغیرہ سے تعلقات میں تقریباً صرف لڑکیاں ہی شکار بنتی ہیں۔

یعنی لڑکیوں کے لیے خاندان جنسی طور پر زیادہ خطرناک ماحول اختیار کر

گیا ہے.........سوشل ورکر بتاتے ہیں کہ باپ بیٹی کے تعلقات بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور وبائی صورت اختیار کر رہے ہیں۔

مغرب میں عورت کا استحصال

مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یورپ میں عورت بیوی ہو بیٹی ہو، بہن ہو فیکٹری یا دفتر میں ملازم ہو ہر صورت میں وہ کثرت سے جنسی ظلم کا شکار ہوتی ہے۔ مغرب کے تو چوٹی کے فلسفی مثلاً نطشے جیسے لوگ بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اگر عورت کے پاس جا رہے ہو تو اپنا کوڑا نہ بھولنا۔ وہاں عورتوں کی چیخوں اور اذیت ملنے پر چیخ و پکار کو ٹیپ کیا جاتا ہے اور پھر یہ سب مارکیٹ میں مہنگے داموں بیچے جاتے ہیں۔

ایف۔ بی۔ آئی کے مطابق امریکہ میں 25 فیصد قتل خاندان کے اندر ہوتے ہیں اور ان میں سے آدھے قتل کے واقعات میں خاوند بیوی کو قتل کرتا ہے یا بیوی خاوند کو بیویاں عموماً اپنے بچاؤ کی خاطر ہی خاوند کو قتل کرتی ہیں۔ امریکہ میں 23 ریاستوں میں زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے پر مقدمہ نہیں کر سکتا اس وجہ سے کوئی خاوند بیوی کو زخمی کر دے تو وہ مقدمہ نہیں کر سکتی۔

کسی ایک عدالت نے حال ہی میں ایک فیصلہ سنایا کہ اگر بیوی کو خاوند مار پیٹ میں زخمی کر دے تو وہ علاج کے لیے بذریعہ عدالت پر خرچ طلب نہیں کر سکتی نیویارک میں اگر کسی خاوند پر خاندانی جرم کی بنا پر مقدمہ قائم ہو تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عدالت سے اپنے دفاع کے لیے سرکاری خرچ پر وکیل حاصل کرے بیوی کو کوئی ایسا حق حاصل نہیں اور بیوی کو خود اپنے طور پر وکیل کا بندوبست کرنا ہوگا۔

تنخواہوں میں تفاوت:

جو عورتیں ملازمت کرتی ہیں وہ جس طرح جنسی شکار بنتی ہیں اور جس سے ان کی بیٹیوں کے بھی جنسی شکار بننے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے متعلق آپ پڑھ چکے

ہیں۔ لیکن یہ بھی سن لیجئے کہ ملازم عورتوں کو اسی ملازمت کے لیے تنخواہیں بھی مردوں سے تقریباً نصف ملتی ہیں 1970ء میں امریکہ میں عورتوں کی تنخواہیں مردوں کا 59 فیصد تھیں۔

امریکہ کی سٹیٹ Louisiana میں خاوند کو تمام جائیداد کا کنٹرول حاصل ہے جس میں بیوی کی کمائی اور تنخواہ بھی شامل ہے 1977 میں جارجیا میں قانون بنا ہے کہ اگر مکان خاوند کے نام تھا تو وہ اسی کا ہوگا۔ چاہے اس کی قیمت بیوی ادا کرے اور بیوی ہی ملازمت کر کے گھر کا خرچ چلاتی ہو۔ گویا نصف تنخواہ جو ملتی ہے اس کا مالک بھی خاوند بن جاتا ہے۔ وہ بھی بیوی کو نہیں پہنچ پاتی۔

مغرب میں دماغی امراض:

مغربی تہذیب نے عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لا کر کھڑا تو کر دیا ہے اور دولت کی ریل پیل بھی ہو گئی لیکن اس کا نتیجہ ہوا؟ امریکہ میں 55 لاکھ افراد تو وہ ہیں جن کی دماغی نشو ونما ہی صحیح نہیں ہو سکتی اور نفسیاتی طور پر مریضوں کی تعداد 2 کروڑ ہے (یعنی بیماریاں) مرید سائیکو نیورسس میں مبتلا اشخاص کی تعداد دس لاکھ ہے جن کے دماغ میں کوئی عضوی خرابی نہیں لیکن جن کا دماغ پاگلوں کی طرح کام کرتا ہے ان کی تعداد سات لاکھ ہے جن کے دماغ میں واقعی عضو خرابی بہت زیادہ ہو چکی ہے ان کی تعداد ایک لاکھ ہے مزید پرانے دماغی مریض دس لاکھ ہیں اور جن سو لین لوگوں کو ہر سال وقتی طور پر خرابی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی تعداد تین لاکھ ہے۔ ھلم جرا۔ اب ان سب کا میزان آپ لگا لیجئے کہ مغربی دنیا کس عذاب میں مبتلا ہے نفسیات کے پروفیسر مزید لکھتے ہیں کہ عورتوں میں یہ بیماریاں مردوں سے زیادہ پائی جاتی ہیں خاص کر نوجوانی میں اس میں اعلیٰ دماغ کے لوگوں یا غریب امیر کی بھی کوئی تفریق نہیں۔

Incidence of Abnormal Behavior In The United State Conservative Estimate of Incidence (in millions)

20	15	10	5	0	Abnormal Behavior
300.000					Transient Disorders(Civilian, each)
10.000.00					Psychoneuroses

20,000.000	Psychophysiologic Disorders.
700.000	Psychotic Disorders(functional)
3,000.000	Character Disorders(psychopathic)
5.000.000	Problem Drinking
1,000.000	Chronic Alcoholism
60,000	Drug Addiction
100,000	Acute brain Disorders
1,000.000	Chronic brain Disorders
5,500.000	Mental Retareation(mental deficie)

وہاٹ وومن وانٹ۔ دیکھیے صفحات 129-13 وغیرہ باب ہوم میکرز۔

James. C. Colman, Abnormal Psyehfog & Modern Life,20-193

1۔	مختصر عرصہ خلل	300,000
2۔	نفسیاتی نیوروس	10,000,000
3۔	حیاتیاتی نفسیاتی خلل	20,000,000
4۔	وقتی پاگل پن	700,000
5۔	مجرمانہ ذہنیت کے خلل	3,000,000
6۔	پرابلم ڈرنکنگ	5,000,000
7۔	دائمی شرابی	1,000,000
8۔	عادی منشیات	60,000
9۔	پیچیدہ دماغی خلل	100,000
10۔	دائمی دماغی امراض	1,000,000
11۔	دماغ کی ناکمل نشوونما	5,500,000

جس معاشرے میں وحشیانہ انداز میں صنف نازک پر ہر طرح کا ظلم ہو رہا ہے۔جس میں جنسی معاشی معاشرتی جسمانی اذیتیں غرض کہ سوچ کی پرواز سے بھی کہیں زیادہ اقسام کے ظلم ہو رہے ہوں تو اس معاشرے میں پاگل پن' نفسیاتی امراض' قتل' خودکشی

کیوں عام نہ ہوگی۔ جادوئی سوچ کا کرشمہ کہ عورتوں کو برابری کا لالچ دے کر مغرب کا مرد انہیں بازاروں' دفتروں میں گھسیٹ لایا ہے تاکہ کاسی نووا کی طرح ہر وقت ہوس رانی کرتا رہے۔ نطشے کے فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے ان کو ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچا کر حظ حاصل کرتا رہے اور سیڈ کے فلسفہ پر بھی عمل کرتا رہے پھر مہذب بھی کہلائے اور عورتوں کے حق کا علم بردار بھی بنا رہے حکومت جمہوری کہلاتی رہے اور اکثریتی طبقہ یعنی عورتوں کے استحصال کی کھلی چھٹی بھی موجود رہے۔ عورتیں بے وقوف بنتی رہیں اور خود جال میں پھنستی بھی رہیں اس دور میں سرمایہ دار بھی شریک ہیں اور جمہوری حکومتیں بھی ملی بھگت میں شامل ہیں جو کامپلکس بناتے ہیں اور دولت اکٹھی کرتے ہیں اور مہذب ممالک کی جمہوری حکومتیں ان پر خوب ٹیکس وصول کرتی ہیں۔ اس دھوکے اور لوٹ سے صرف چین مستثنٰی ہے اور حضورؐ کی حدیث پر گویا عمل پیرا ہے۔ امام بخاری لکھتے ہیں کہ حضورؐ کچھ لوگوں کے پاس گئے ان میں ایک شخص رنگین غازہ لگائے ہوئے تھا۔ اس نے سلام کیا تو آپ نے جواب نہ دیا منہ پھیر لیا الخ (الادب لمفرد) ایک اور ماہر نفسیات لکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کو اکثر غم وفکر Age of Anxiety کہا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم دس بلین ڈالر یعنی دس ارب ڈالر (یعنی ڈیڑھ کھرب روپے) ہر سال شراب پر خرچ کرتے ہیں...... آج موجودہ بیس افراد میں سے ایک فرد دماغی مرض کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہوگا۔ اور ہر داخلہ لینے والے فرد کے مقابلہ میں بیس افراد ایسے ہوں گے جن کو کسی طریقہ پر نفسیاتی علاج کرانا پڑے گا۔ گویا تقریباً ہر فرد کو نفسیاتی علاج کی ضرورت پڑ جائے گی۔ اب جو مغرب زدہ لوگ یورپی تہذیب کو رائج کرنا چاہتے ہیں اس خوفناک مستقبل کو بھی سوچ لیں۔

امریکہ میں دو شادیوں میں سے ایک میں طلاق ہو جاتی ہے۔ اور ساری مصیبت عورت کو بھگتنا پڑتی ہے۔

مزید مغرب کے لوگوں کے غم زدہ زندگی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال 200 ملین ڈالر (12 ارب دس کروڑ روپے) کی صرف مسکن ادویات استعمال ہوتی ہیں۔ اور شراب کا خرچ آپ پڑھ چکے ہیں دیگر منشیات اس کے علاوہ

ہیں۔ پھر شراب، سگریٹ کی وجہ سے جو کینسر دل کی بیماریاں سینے کی بیماریاں جگر کی بیماریاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ ہے وہ مغربی تہذیب جس کی غلامی میں ہم روز بروز زیادہ گرفتار ہوتے جا رہے ہیں اور جس کی نقالی میں ہم فخر محسوس کرتے ہیں۔

پردہ شریعت میں اور حیثیت نسواں:

پردہ کے سلسلے میں مولانا شبلی کا مضمون جس کا عنوان پردہ ہے انہوں نے پردہ کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ پہلی قسم کا پردہ اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھا۔ حمیر کے قبیلہ کے مرد بھی اسلام سے پہلے نقاب کا استعمال کرتے تھے اسپین میں اسلام کے بعد جب ان کی حکومت قائم ہوئی۔ تو یہ ملثمین کہلاتے تھے۔ اس خاندان نے زور و قوت سے حکومت کی اور بہت سی فتوحات حاصل کیں لیکن چہروں پر ہمیشہ نقاب ڈالے رہتے تھے۔ تاریخ یعقوبی میں ہے کہ جب اہل عرب عکاظ کے بازار میں آتے تھے تو ان کے چہروں پر برقع پڑے ہوئے تھے۔ وکانت العرب تحضرون سوق عکاذ وعلی وجوھھم البراقع۔ اول عرب جس نے برقع اتارا وہ ابن غنم تھا۔ اس کے بعد اوروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ خود عباسی خلفاء میں عرصہ تک یہ طریقہ رائج رہا کہ بادشاہ پردہ کی اوٹ سے احکام صادر کرتا تھا۔

پھر شبلی لکھتے ہیں کہ البتہ عورتوں میں یہ رسم اسلامی زمانہ تک قائم رہی جس کو اسلام نے اور بھی باقاعدہ اور لازمی کر دیا۔ اس سلسلے میں شبلی نے دور جاہلیت کے بہت سے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

شبلی نے ابن کثیر کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ۔

خدا نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ جب گھر سے کسی کام کو نکلیں تو سر پر چادر اوڑھ کر چہروں کو چھپا لیں اور آنکھ کھلی رکھیں۔ اسی طرح کے اقوال معالم التنزیل۔ طبقات ابن سعد، تفسیر کشاف وغیرہ نے بھی نقل کیے ہیں فلیراجع کیونکہ موضوع پر شبلی۔ مولانا مودودی

وغیرہ نے وضاحت سے لکھا ہے اس لیے ان سب باتوں کو دھرانے کی ضرورت نہیں۔البتہ چند وہ باتیں نقل کیے دیتے ہیں جو عام طور سے بیان نہیں ہوئیں۔ان واقعات سے اسلامی احکام کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے وعظ کا ایک الگ دن ہفتہ میں مقرر کر دیا تھا اور عورتیں عام دنوں میں وعظ میں شریک نہ ہوتی تھیں۔ عورتوں کو صرف فجر کی نماز اور عشاء کی نماز میں مسجد میں آنے کی اجازت تھی اور فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھائی جاتی تھی تاکہ روشنی پھیلنے سے پہلے عورتیں اپنے گھر پہنچ جائیں ۔اگر امام نماز میں غلطی کرے تو مرد مقتدی سبحان اللہ وغیرہ کہہ کر غلطی پر متنبہ کریں اور عورتیں ہاتھ مارنے سے آواز پیدا کر کے متنبہ کریں گی وہ زبان سے کچھ نہیں کہیں گی۔یہ تفریق ملحوظ خاطر رہے دونوں کے لیے مختلف طریقہ اسی وجہ سے ہے کہ آواز کا بھی ایک قسم کا پردہ ہے۔

حضرت عائشہؓ کا پردہ:

سید سلیمان ندوی آپ کی سیرت میں لکھتے ہیں کہ آپ پردہ کا بہت خیال رکھتی تھیں ۔آیت حجاب کے بعد تو یہ تاکیدی فرض ہو گیا تھا۔جن ہونہار طالب علموں کو اپنے یہاں بے روک ٹوک آنا جانا روا رکھنا چاہتی تھیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق اپنی کسی بہن یا بھانجی سے دودھ پلوا دیتی تھیں اور اس طرح ان کی رضاعی خالہ یا نانی بن جاتی تھیں اور ان سے پھر پردہ نہیں ہوتا تھا۔ورنہ ہمیشہ طالب علموں اور ان کے درمیان پردہ پڑا رہتا تھا۔کبھی دن کو طواف کا موقع پیش آتا تو خانہ کعبہ مردوں سے خالی کرا لیا جاتا۔ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ طواف کی حالت میں بھی چہرہ پر نقاب پڑی رہتی تھی۔مردوں سے شریعت میں پردہ نہیں لیکن ان کا کمال احتیاط دیکھیے کہ اپنے حجرہ میں حضرت عمرؓ کے دفن ہونے کے بعد بے پردہ نہیں جاتی تھیں۔ سوچ بالکل الٹی ہونے کی وجہ سے آج کی عورت بجائے اس کے کہ سر کھلا رکھنے سے شرمندہ ہو۔سر ڈھانپنے پر شرمندگی محسوس کرتی ہے۔

ایک بار ان کی بھتیجی نہایت باریک دوپٹہ اوڑھ کر سامنے آئیں۔ دیکھتے ہی غصہ سے دوپٹہ کو چاک کر دیا۔ پھر فرمایا تم نہیں جانتیں کہ سورہ نور میں خدا نے کیا احکام نازل فرمائے ہیں۔ اس کے بعد موٹے کپڑے کا دوسرا دوپٹہ منگوا کر اوڑھایا۔

حضرت فاطمہؓ کا پردہ:

آپ کا پردہ مشہور ہے۔ آپ کی تجہیز و تکفین میں خاص جدت کی گئی۔ عورتوں کے جنازہ پر جو آج کل جنگلہ اور پردہ لگانے کا دستور ہے۔ اس کی ابتدا انہی سے ہوئی۔ اس سے پیشتر عورت و مرد سب کا جنازہ کھلا ہوتا تھا۔ چونکہ حضرت فاطمہؓ کے مزاج میں انتہا درجہ کی شرم و حیا تھی۔ اس لیے انہوں نے حضرت اسماء بنت عمیس سے کہا کہ کھلے جنازے میں عورتوں کی بے پردگی ہوتی ہے جس کو میں ناپسند کرتی ہوں۔ اسماءؓ نے کہا کہ جگر گوشہ رسولؐ! میں نے حبش میں ایک طریقہ دیکھا ہے۔ آپ کہیں تو اسے پیش کروں۔ یہ کہہ کر خرما کی چند شاخیں منگوائیں اور ان پر کپڑا تانا جس سے پردہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ حضرت فاطمہؓ بے حد مسرور ہوئیں کہ یہ بہترین طریقہ ہے۔ حضرت فاطمہؓ کے بعد حضرت زینبؓ کا جنازہ بھی اسی طریقہ سے اٹھایا گیا۔

ابن مسعودؓ اور پردہ:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا طریقہ تھا کہ جو عورتیں جمعہ کے دن مسجد میں آجاتیں ان کو وہ واپس بھیج دیتے اور کہتے کہ گھر جا کر عبادت کرو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ او مثلہ۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم عورت کے لیے اس نماز سے بہتر کوئی نماز نہیں جو کہ وہ اپنے گھر میں پڑھے سوائے اس کے کہ مسجد حرام یا مسجد نبوی کی نماز یا بوڑھی عورت جو بہت باپردہ پوری طرح مستور ہو کر مسجد جائے۔ اور پردہ کا مکمل اہتمام رکھے۔ اس روایت کے طبرانی نے کئی طرق بیان کیے ہیں ایک روایت کے الفاظ میں ہے کہ ایسی بوڑھی عورت جو شادی کے قابل نہ رہی ہو۔

اسی بات سے پردہ کا اسلامی فلسفہ پوری طرح عیاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے جو کہ قرآنی حکم وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (یعنی اپنے گھروں کے اندر رہو) کی تفسیر ہے۔ایک طرف حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے مردوں کے متعلق نماز باجماعت مسجد میں ادا کرنے پر اتنا زور دیا کہ فرمایا میرا دل چاہتا ہے کہ نماز پڑھانے کے لیے کسی دوسرے کو کہہ دوں اور خود جا کر ان مردوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو مسجد میں نماز پڑھنے نہیں آئے۔دوسری طرف عورتوں کو مسجد میں صرف فجر اور عشاء میں آنے کی اجازت دی اور وہ بھی اس صورت میں کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان بچوں کی صف ہو۔اور پھر نماز کے اختتام کے بعد مرد بیٹھے رہیں اور عورتیں اپنے گھروں کو چلی جائیں تب مرد اٹھیں۔باقی تین نمازوں میں عورتوں کو مسجد میں باجماعت شامل ہونے کی اجازت ہی نہ تھی۔ان کی تبلیغ کے لیے بھی ہفتہ میں ایک الگ دن آپؐ نے مقرر فرما دیا تھا جس میں مردوں کو اجازت نہ تھی یہ صرف خاص عورتوں کی مجلس ہوتی تھی۔بیعت کے وقت بھی جناب اقدس کسی عورت کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے تھے کیونکہ نامحرم عورت کے ہاتھ کو ہاتھ لگانا مرد کے لیے ناجائز ہے۔ابوداؤد کی روایت کے مطابق ایک صحابیہ نقاب اوڑھے ہوئے گم شدہ بچے کی تلاش میں نکلیں تو کسی نے کہا کہ اس وقت بھی نقاب موجود ہے؟ انہوں نے کہا کہ بچہ کھو دیا تو کیا حیا بھی کھو دوں۔

بیسویں صدی میں آج بھی یہودی عورتیں یہودی عبادت خانوں مردوں سے الگ بیٹھتی ہیں۔درمیان میں پردہ ہوتا ہے۔یہودی لوگ عبادت گاہ میں جب ہی عبادت کر سکتے ہیں جب کم از کم دس مرد تیرہ سال کی عمر سے زیادہ موجود ہوں۔ورنہ عبادت گھروں میں کرنے کا حکم ہے۔[۲۴] آج کے دور میں یہودیوں میں عورت و مرد کی تفریق موجود ہے۔اگرچہ مادی طور پر یہودی شاید دنیا کی سب سے ترقی یافتہ قوم ہیں۔

اسلام میں پردہ دار عورت کو وی۔آئی۔پی سے بلند مقام حاصل ہے:

امام ماوردی لکھتے ہیں کہ اگر عورت باپردہ رہتی ہو اور اگر باہر نکلتی ہو تو پورے پردہ کے ساتھ اس طرح کہ پہچانی نہ جائے۔

تو ایسی عورت کو قاضی عدالت میں نہیں بلا سکتا۔ اگر اس کا کسی سے تنازعہ ہو تو قاضی اس خاتون کے گھر جا کر فیصلہ کرے گا یا نائب کو بھیج کر اس کے گھر پر ہی فیصلہ کروائے گا۔ عدالت میں طلب نہیں کرے گا۔ ایک لڑکی نے زیادتی کرنے والے نوجوان کو قتل کر دیا تو حضرت عمرؓ اس لڑکی کے گھر خاموشی سے خود گئے اور اس سے حالات پوچھنے کے بعد اس کو دعا دے کر واپس آ گئے۔ یعنی سزا کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کو دعا دی۔

اس کے برعکس آپ بہت سے مقدمات کا ذکر پڑھ چکے ہیں کہ اگر عورت کے جبڑے کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ چکی ہو اور اس طرح ثابت بھی ہو جائے کہ بہت وحشیانہ طریقے سے بالجبر زیادتی کی گئی ہے۔ پھر بھی عدالتیں ملزم کو بری کر دیتی ہیں۔ یہ امریکہ میں عورتوں کی آزادی ہے اور یہ ہے ان کی عدالتوں کا انصاف جس پر ہماری عورتیں اور مرد دونوں قربان ہو رہے ہیں۔

جدید ترکی میں پردہ کی جدوجہد:

پاکستان کی تعلیم یافتہ ماڈرن عورتیں تو اب سر ڈھانپنا عام سمجھنے لگی ہیں۔ اس کے برعکس جدید ترکی میں آج کل تعلیم یافتہ عورتوں نے سر پر رومال باندھنے اور سر ڈھانپنے پر اصرار شروع کر دیا ہے۔ وہاں اس جرم میں سو لڑکیوں کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا کہ وہ حجاب کے لیے سر پر رومال کیوں باندھتی ہیں۔ کئی خاتون لیکچرار کو لیکچر دینے پر اسی جرم کی وجہ سے روک دیا گیا ہے۔ یہ خواتین امریکہ وغیرہ سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر آئی ہیں۔ لیکن حجاب کے جرم کی وجہ سے پڑھانے سے ان کو محروم کر دیا گیا ہے۔ ہفتہ وار انگریزی رسالہ Arabia 23 نومبر 1984ء میں اس کی تفصیلات پڑھنے کے قابل ہیں۔ نوائے وقت کے شمارہ میں بھی اس کا اختصار شائع ہوا تھا۔

رسالہ عریبیا میں لکھا ہے کہ انقرہ کی ایک خاتون وکیل کو حجاب کے ساتھ عدالت میں کام کرنے سے روک دیا گیا۔ اس نے اپنا مقدمہ خود لڑا۔ لیکن ترکی کی سیکولر عدالت نے اس کے خلاف فیصلہ دے دیا اور اس خاتون کو بھی وکالت کا پیشہ ترک کرنا پڑا۔ 1973ء

She too had to quit her profess on in

اس کے بعد لکھتا ہے۔

The following yerar were bright days for muslim intellectuals.especially for women with Hijab.

بعد کے سال مسلمان دانشوروں کے لیے پر امید سال تھے خاص کر ان عورتوں کے لیے جو حجاب استعمال کرتی تھیں۔ مسلمان لڑکیوں جنکو 1973ء میں حجاب ہٹانے پر مجبور کر دیا گیا تھا اب انہوں نے فخر کے ساتھ سروں پر رومال باندھنے شروع کر دیے ہیں۔

تاریخ اسلام اور پردہ:

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ پاکستان میں کالج کی لڑکیاں اس قدر مغرب کی ذہنی غلام ہو چکی ہیں کہ حکومت ان کو سر ڈھانپے کو کہتی ہے اور وہ سر کھلا رکھنے پر اصرار کرنے ہی کو آزادی کا نام دیتی ہیں اور پھر محب اسلام ہونے کا دعویٰ اور حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ بھی کرتی ہیں۔ حالانکہ حضرت عائشہ "حضور کی محبوب بیوی آخیر دور تک جیسا پردہ فرماتی رہیں۔ اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ آپ کے متعلق بخاری کی ادب المفرد میں ذکر ہے کہ آپ سادہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ اور پھٹی ہوئی نقاب کو درست کر کے استعمال کرتی تھیں۔ آپ نے معاشرتی' سیاسی زندگی میں بھرپور حصہ لیا۔ حتیٰ کہ جنگی قیادت بھی کی۔ اگرچہ آپ کو اس پر بعد میں افسوس بھی ہوا۔ لیکن عمر رسیدہ ہونے کے باوجود آپ نے نقاب استعمال کیا اور محمل میں بیٹھ کر جنگ میں بھی قیادت کی۔

آج پاکستان کی یونیورسٹی فارغ شدہ عورتوں کے پردہ کا حال بھی آپ کو معلوم ہے۔ لیکن علمی میدان میں انہوں نے کیا کارہائے نمایاں سر انجام دیئے ہیں؟ اس کے برعکس قرون وسطیٰ کی مسلمان عورتیں پورا شرعی پردہ قائم رکھتی تھیں۔ وہ بازاروں میں مردوں کے دوش بدوش یا دفتروں میں دوش بدوش تو کام نہ کرتی تھیں۔ لیکن علمی کمالات میں اس بلند مقام پر تھیں کہ آج کی عورت ان سے بہت پیچھے ہے۔

امام حافظ ابن عساکر مورخ دمشق نے جن اساتذہ سے فن حدیث حاصل کیا تھا۔ ان میں اسی سے زیادہ عورتیں تھیں کیا آج پاکستان میں ایک بھی عورت اپنے آپ کو حدیث کا علم جاننے کہہ سکتی ہے۔ کسی عورت نے پاکستان میں حدیث پر کتاب لکھی ہے؟ اسلامی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ پردے میں رہ کر عورتیں اسلام کی ہر قسم کی خدمات کر سکتی ہیں۔ دنیا کی ترقی میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں۔

قرآن میں پردہ کے واضح احکامات:

قرآن میں امہات المؤمنین اگرچہ تمام مسلمان مردوں کی مائیں ہیں بلکہ سگی ماؤں سے بڑھ کر ہیں۔ پھر بھی مومنوں کو حکم دیا گیا کہ اگر ان سے مانگنا ہوتو پردہ (حجاب) کے پیچھے سے مانگو۔ فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ پھر تمام عورتوں اور اسی طرح امت کی ماؤں کو حکم دیا گیا مومنوں یعنی بیٹوں کی بات کا جواب حجاب کے پیچھے سے بھی جب دو تو نرم لہجے میں مت دو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ **ان تقیتن فلا تلاتخضن بالقول فیطمع الذی فی قلبه مرض وقلن قولا معروفا** (الاحزاب ۳۲) یعنی اگر تم خدا سے ڈرتی ہو تو (غیر مردوں سے) دبی زبان (باریک آواز) سے بات نہ کرو۔ ورنہ جس کے دل میں کھوٹ ہوگا اس کو لالچ پیدا ہوگا۔ کھری کھری صاف بات کیا کرو۔ اور اپنے گھروں میں جمی رہو اور اگلی جاہلیت کے زمانے کی طرح بناؤ سنگار دکھاتی نہ پھرو۔ غرضیکہ احکام امہات المؤمنین وصحابیات کو صحابہ کرامؓ جیسے صالح معاشرہ میں دیئے جا رہے ہیں۔ اگر اس صالح معاشرہ میں ان پر عمل ضروری تھا تو آج ان پر عمل اس دور سے زیادہ ضروری ہے۔ احکام واضح ہیں۔ اگر کوئی تجرباتی بلی کی طرح کان کا پردہ بند کر لے یا کبوتر کی طرح آنکھیں موند لے تو اس میں کس کا قصور ہے؟

قصاص ودیت

غلام اکبر ملک

کیا قصاص ودیت کے لحاظ سے آدھی ہے؟:

جہاں تک قصاص کا تعلق ہے یعنی جان کے بدلے جان کا تو مسلم علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے گا۔ یہ اعزاز اسلام نے ہی عورت کو دیا ہے اور اسے مرد کے مساوی لاکھڑا کیا ہے جبکہ ظہورِ اسلام سے پہلے عورتوں کو چونکہ انسان ہونے کا درجہ حاصل نہیں تھا لہٰذا کئی اقوام وقبائل نہایت معمولی معمولی باتوں پر عورتوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتے تھے اور دیگر ڈھور ڈنگروں کی مانند اس کے قتل کی کوئی قابل ذکر سزا دیتے دیت یا قصاص مقرر نہیں تھا۔ رومی اور یونانی شوہروں کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ وہ جب چاہتے اپنی بیویوں کو قتل کر ڈالتے تھے۔ قدیم چیرو اور سیمو قبائل تو بھیڑ اور بکریوں کی طرح عورتوں کے ریوڑ پالتے تھے اور باقاعدہ ان کی خریدوں فروخت بھی کیا کرتے تھے۔ عرب کے لوگ بھی اپنی خواتین کا زندہ رہنے کا بنیادی حق تسلیم نہیں کرتے تھے اور اپنی بیٹیوں کو عموماً زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ متحدہ ہندوستان میں شوہر کی موت کے بعد بیوی زندہ رہنے کے حق سے محروم تھی اور اسے مجبوراً اپنے شوہر کی چِتا کے ساتھ زندہ جل جانا پڑتا تھا۔ سندھ میں بسنے والی قدیم اقوام نے بھی اپنی خواتین کو زندہ رہنے کے بنیادی انسانی حق سے محروم رکھا ہوا تھا۔ ان کی بچیاں جب شباب کی دہلیز پر قدم رکھتی تھیں تو انہیں یا تو فروخت کر دیا جاتا تھا یا پھر معقول معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں وہ قتل کر ڈالی جاتی تھیں۔ بدچلنی کی صورت میں بھی کئی اقوام میں مرد کا جرم قابلِ معافی سمجھا جاتا تھا جبکہ عورت کو قتل کر دیا جاتا تھا یا دریا میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ اہلِ یونان عورت کے خلافِ فطرت بچہ پیدا

ہو جانے کی صورت میں اسے قتل کر ڈالتے تھے اس کے علاوہ ان کے ہاں اگر کوئی عورت بانجھ ہوتی یا بوڑھی ہو جانے کی صورت میں اولاد پیدا کرنے سے قاصر ہوتی تو اسے بھی قتل کر ڈالتے تھے۔ مصری اور تاتاری بادشاہوں کی موت کی صورت میں ان کی کنیزیں، داشتائیں اور بیویاں بھی ان کی میت کے ساتھ زندہ درگور کر دی جاتی تھیں۔ اس لحاظ سے قدیم انسانی معاشروں میں عورت کی دِیت کا کوئی تصور بھی موجود نہیں تھا۔ البتہ شاذ شاذ انسانی معاشرے ایسے بھی تھے جن کے ہاں عورت کی دِیت یا قصاص کا رواج تھا لیکن مرد کی نسبت بہت کم تھا۔ حتیٰ کہ آج سے چودہ سال پہلے اسلام کا ظہور ہوا اور قرآن حکیم نے عورت و مرد دونوں کے لیے قصاص کا حکم دیا۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَاُولِي الْاَلْبَاب ﴾ (البقرہ۔۱۷۹)

(ترجمہ): اے عقل والو! تمہارے لئے قانون قصاص میں زندگی ہے۔

اسی سورۃ بقرہ میں مزید ارشاد ہے کہ

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى. ﴾

(ترجمہ): اے ایمان والوں! تم پر مقتولین میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔

شریعت اسلام کا قتل کے بدلے قتل کا فیصلہ مرد و عورت دونوں کے لئے ہے کیونکہ اسلام کے نزدیک ایک عورت کی جان اتنی ہی محترم اور قیمتی ہے جتنی کہ ایک مرد کی، اس ضمن میں ہمارے پاس سب سے بڑی دلیل وہ مجموعہ قوانین ہے جو آنحضورؐ نے اہل یمن کے لئے تحریر کروایا تھا۔ اس میں واشگاف الفاظ میں یہ بات درج ہے کہ

﴿ اِنَّ الرَّجلَ يقتل بِالهداة. ﴾

بیشک عورت (کے قتل) کے عوض مرد قتل کیا جائے گا۔

صحاح ستہ کی ایک روایت جسے بخاری مسلم ترمذی ابوداؤد نسائی وغیرہ نے نقل کیا ہے اس روایت کی رُو سے ایک یہودی مرد نے ایک لڑکی کا سر کچل کر اسے ہلاک کر دیا جب یہ مقدمہ دربار نبویؐ میں لایا گیا تو آنحضورؐ نے یہ فیصلہ دیا کہ اس یہودی کا سر بھی اسی طرح کچل کر اسے ہلاک کیا جائے۔

آنحضورؐ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جب ایک عورت کو قتل کیا گیا تو مقدمہ کی رُو سے اس قتل میں ایک سے زائد مرد شریک تھے۔ چنانچہ جناب فاروق اعظمؓ نے ان تمام مردوں کو بھی قصاص کے طور پر قتل کرنے کا حکم جاری کیا۔ اس طرح سنن ابوداؤدؒ میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک روایت منقول ہے جس کا مفہوم کچھ اس قسم کا ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء میں سے ایک عورت بھی قاتل کو جان کی معافی دے دے تو اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اسلامی روایات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی مسلمان عورت نے حالتِ جنگ میں کسی دشمن کو پناہ دے دی تو اسے آنحضورؐ نے بحال رکھا۔ اس ضمن میں فتحِ مکہ کے وقت ایک واقعہ یوں پیش آیا کہ حضرت اُم ہانیؓ نے ابن ہبیرہ نامی ایک شخص کو پناہ دی جبکہ حضرت علیؓ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ معاملہ دربارِ نبویؐ پیش ہوا تو آنحضورؐ نے فرمایا

''اُمِ ہانیؓ نے جسے پناہ دی اسے ہم بھی پناہ دیتے ہیں''

ان تمام اسلامی روایات کو پڑھ لینے کے بعد بھی جو لوگ مُصر ہیں کہ عورت کی دیت آدھی ہے ہم انہیں اپنے اس عقیدے پر نظر ثانی کی دعوت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں معترضین عموماً اجماع علمائے اُمت کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''عورت کی دیت پچاس سرخ اونٹ ہیں جبکہ مرد کی دِیت سو سرخ اونٹ ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ جب قصاص میں عورت و مرد کے مابین کوئی جنسی تخصیص روا نہیں رکھی گئی تو دِیت کے معاملے میں ایسا کیوں ہے'' ممکن ہے علمائے امت کے اجماع میں خوبی اور حکمت پوشیدہ ہو اور اس میں اقتصادی پہلو سامنے رکھا گیا ہو اس لئے کہ دِیت نہ تو مرد اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا ہے اور نہ ہی عورت بلکہ دیگر ورثاء ہونے کی صورت میں شوہر کی دِیت اس کی بیوی کو بھی ملتی ہے اور بیوی کی دِیت اس کے شوہر کو۔ اس لحاظ سے مالی فائدہ تو عورت ہی اٹھاتی ہے۔ جیسا کہ صاحب تفسیر المنار رشید رضا مصری نے اس مسئلہ کی وضاحت یوں فرمائی ہے کہ

''بنیادی بنات اس مسئلہ (دِیت) کی یہ ہے کہ مرد کے انتقال سے اس کے گھر والے جس (معاشی) فائدے سے محروم ہو جاتے ہیں وہ اس (فائدے) سے بہت بڑا

جس سے انہیں عورت کے انتقال کی وجہ سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

تاہم دلچسپ پہلو اس مسئلے کا یہ ہے کہ علماء فقہاء محدثین مفسرین کے خیالات سے قطع نظر قرآن حکیم میں کہیں ہلکا سا بھی اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ عورت کی دیت مرد سے نصف ہے۔ دیت کے معاملے میں قرآن کا یہ حکم ہے کہ

﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ﴾

(النساء۔۹۲)

(ترجمہ): جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور اس کے گھر والوں کو دیت پہنچائے اس آیت مبارکہ میں چونکہ مسلمان مرد و عورت دونوں کے قتل کے متعلق حکم ہوا ہے لہٰذا از روئے قرآن مسلمان مرد اور عورت دونوں کی دیت ایک ہی ٹھہرتی ہے۔ مرد و زن کی زندگیاں اسلام کے نزدیک ایک جیسی قیمتی اور محترم ہیں لہٰذا قرآنی نقطہ نگاہ سے الانثی بالانثی کا اطلاق مرد و عورت دونوں پر ہوتا ہے۔

عورت کی سیاسی سرگرمیاں ۔ شرعی نقطہ نظر سے

ڈاکٹر یوسف قرضاوی (قاہرہ یونیورسٹی مصر)

ترجمہ: پروفیسر حافظ خالد محمود ترمذی

تعارف ڈاکٹر یوسف قرضاوی:

یوں تو ڈاکٹر صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ برونائی کے سلطان نے آپ کی اسلامی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ایک ایوارڈ دیا جس کی مالیت مبلغ 50 ہزار ڈالر ہے جو آپ نے آکسفورڈ کے مرکز دراسات اسلامیہ (Islamic Centre) کو بطور عطیہ دے دیا۔ اس سے قبل آپ شاہ فیصل عالمی ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ حکومت ملائشیا نے بھی آپ کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کو علمی ایوارڈ سے نوازا۔ نیز یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ بچپن میں دس سال کی عمر میں جب آپ نے قرآن مجید حفظ کیا تھا تو آپ کو سو جنیہ مصری انعام ملے تھے جو آپ نے اپنے مدرسے کو دے دیئے تھے جن کی مالیت آج کے 1000 مصری جنیہ بنتی ہے۔ موصوف قاہرہ یونیورسٹی میں فقہ اسلامی کے پروفیسر تھے۔ (مترجم)

مغرب نے عورت کی آزادی کا بڑا چرچا کیا بڑا چلن ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہے یا کرنے پر مجبوری کردی گئی ہے۔ وہاں مرد وزن کی مساوات وآزادی عملاً تسلیم کی جا چکی ہے لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہاں اسے ووٹ کا حق بہت دیر سے ملا ہے۔ نیز جن مناصب پر وہ کام کر رہی ہے اسی منصب پر مرد کی بلسبت اسے آج بھی کم مشاہرہ دیا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر کہ وہ چھٹیاں بہت کرتی ہے یا اسے کرنا پڑتی ہیں۔ یعنی وہاں ابھی بھی عورت امتیازی سلوک کا شکار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ

عورت کی نام نہاد آزادی اور مساوات ایک چال ہے۔ جس میں مرد کی ہوس نے اسے پھنسا دیا ہے ورنہ عورت عورت ہے اور مرد بہر حال مرد خواہ وہ امریکہ کا ہو یا یورپ کا یا ایشیا اور افریقہ کا۔ مردانگی اس کا جوہر ہے اور نسوانیت عورت کا زیور۔ ان دونوں میں جسم وساخت اور مزاج وعادات واطوار کے اعتبار سے زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ان کے وظیفہ جات بھی جدا جدا ہیں اور یہی انفرادیت ان کی شناخت ہے۔ ان کو غلط ملط نہیں کیا جاسکتا۔ جن کو خالق حقیقی نے جدا جدا پیدا کیا ہے' انہیں انسان کیسے ایک کرسکتا ہے۔ یہ ایک غیر فطری فعل ہے۔ جو فطرت سے بغاوت کے مترادف ہے۔ بہر حال اس نام نہاد آزادی اور مساوات کے باوجود یورپ وامریکہ میں میدان سیاست میں عورت کا وجود خال خال نظر آتا ہے بلکہ اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف ایک واحد مثال برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر کی ہے یا امریکہ میں واحد مثال وزیر خارجہ البرائٹ کی ہے۔

لیکن اس کے برعکس جنوبی ایشیا میں عموماً اور پاک وہند میں خصوصاً اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ انڈیا میں آل جہانی اندرا گاندھی' پاکستان میں بے نظیر بھٹو دو مرتبہ وزیر اعظم رہ چکی ہیں' بنگلہ دیش میں حسینہ واجد وزیر اعظم ہیں۔ اس سے قبل خالدہ ضیاء وزیر اعظم تھیں۔ سری لنکا میں ماں' بیٹی وزیر اعظم اور صدر تھیں۔ کانگریس میں سونیا گاندھی میدان میں آئی ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ صدارتی انتخاب میں امیدوار تھیں۔ بیگم رعنا لیاقت علی گورنر اور سفیر رہی تھیں۔ ترکی کی مادام تانسو چلر اور بہت سی مثالیں ہیں لیکن ان سب مثالوں سے کیا یہ لازم آتا ہے کہ عورت کا سیاست میں حصہ لینا اسلام میں جائز ہے؟ اگر صورت حال یہ نہیں ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ مصر معروف عالم دین اور قانون دان علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اس سوال کا کافی اور شافی دلائل سے جواب دیا ہے۔ جو کویت کے عربی مجلہ ''المجتمع'' میں شائع ہوا ہے۔ ذیل کی سطور میں اس کا ترجمہ پیش ہے۔

پہلی دلیل:

علامہ قرضاوی صاحب پہلی دلیل ان لوگوں کے رد میں جو عورت کے سیاست میں حصہ لینے کے قائل ہیں۔ اس آیت قرآنی سے لاتے ہیں (راقم قرآنی آیات کے احترام کے پیش نظر آیت کے صرف ترجمے پر اکتفا کرتا ہے)

(ترجمہ) اور تم اپنے گھروں میں قرار پکڑو (الاحزاب:23) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف امہات المومنین یا ازواج نبی ﷺ کے لیے خاص ہے تو کیا دوسری مسلمان عورتوں کو آزادی ہے کہ وہ کھلی گائے کی طرح گلیوں میں بازاروں میں پھرتی رہیں۔ بلا مقصد آپ اس کے رد میں اس آیت سے قبل والی آیت سے استنباط کرتے ہیں۔

(ترجمہ) اے نبی کی بیبیو! تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم (نامحرم سے) بولنے میں (جبکہ بضرورت بولنا پڑے) نزاکت مت کرو (اس سے) ایسے شخص کو (طبعًا) خیال فاسد پیدا ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی ہے۔ (الاحزاب:32)

آیت مندرجہ بالا میں تو خطاب ہی امہات المومنین سے ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دیگر مسلمان عورتیں نامحرم مردوں سے نزاکت سے باتیں کریں؟ ہرگز نہیں۔ امہات المومنین بھی حضور اکرم ﷺ کی طرح تمام مسلمان مرد و زن کے لیے نمونہ ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ اے نبی ﷺ جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر) اس کو (اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں۔ پھر (وہ بھی) اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (التحریم:1) میں چونکہ خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے اس لیے عام لوگ حلال کر سکتے ہیں؟ اور نیز یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی کام سے کسی بڑے آدمی کو منع کر دیا جائے تو عام آدمی کو تو اس سے پہلے باز آ جانا چاہیے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب ؓ کی یہ عادت شریفہ تھی کہ جب آپ عوام کو کسی کام سے روکنا چاہتے تو اپنے اہل و عیال کو اکٹھا کر کے پہلے انہیں اس سے روکتے اور کہتے

کہ اگر انہوں نے پھر بھی یہ کام کیا تو انہیں دگنی سزا دوں گا۔لوگوں کے نفوس کی اصلاح کا یہ طریقہ قرآن پاک کے اوامر و نواہی کی عملی تفسیر تھی۔

دوسری دلیل:

آج کی عورت گھر سے باہر کے کاموں میں عملاً حصہ لے رہی ہے۔ وہ حصول تعلیم کے لیے سکول و کالج اور یونیورسٹی جاتی ہے۔بطور معلمہ تعلیم بھی دے رہی ہے۔ ہسپتالوں میں بطور نرس اور ڈاکٹر کے کام کر رہی ہے بلکہ اب تو مغرب کی نقالی میں زندگی کے ہر شعبہ میں مثلاً ریڈیو ٹی وی اور فلم میں اخبارات و رسائل میں بطور صحافی وایڈیٹر دفاتر میں حتیٰ کہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں بھی کام کر رہی ہے۔ بزنس میں اپنے جوہر دکھا رہی ہے اور کوئی اس پر نکیر نہیں کرتا تو گھر سے باہر اس کے ان کاموں پر عوامی اجماع کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے انتخاب میں حصہ لینا بھی جائز ہے۔

تیسری دلیل:

ان لوگوں کے جواب میں جو یہ کہتے ہیں کہ عورت کو گھر کی چاردیواری میں محدود کر دینا۔گویا اس کو قید کر دینے کے مترادف ہے اور قرآن کی رو سے یہ تو صرف اسی وقت جائز ہے جب اس نے کسی بدکاری کا ارتکاب کیا ہو۔فرمان الٰہی ہے اور جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں تمہاری بیبیوں میں سے......تو تم ان کو گھروں کے اندر مقید رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راہ تجویز فرما دیں۔(النساء:18)

وہ کہتے ہیں کہ پارلیمانی انتخاب سے عورت کو روکنے کا مطلب گویا یہ ہے کہ اسے گھر کی چاردیواری میں قید کر دیا۔لیکن مصلحت اس میں یہ ہے کہ مسلمان عورت بہت اشد ضرورت کے وقت گھر سے باہر نکل سکتی ہے اور اس کی کچھ حدود ہیں اور انتخابات میں حصہ لینا اس میں شامل نہیں ہے نہ ہی یہ اس کی ضرورت ہے۔کیونکہ اس طرح اسے گھر سے باہر زیادہ وقت گزارنا پڑے گا۔جلسوں سے خطاب اور جلوسوں کی قیادت کے لیے جیسا کہ مرد سیاستدانوں کو کرنا پڑتا ہے اور حدیث شریف کے احکام یہ ہیں کہ عورت کی نماز اپنے گھر میں

افضل ہے اس کی مسجد میں نماز سے اور پھر اپنی کوٹھڑی (کمرے) میں نماز افضل ہے گھر کے صحن میں نماز سے۔ یہ حدیث اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ عورت کی عبادت بھی پردے میں زیادہ سے زیادہ پوشیدہ جگہ میں افضل ہے حالانکہ مردوں کے لیے نماز باجماعت انفرادی نماز سے 27 گنا افضل ہے لیکن عورت کو جماعت میں حاضری سے مستغنی کر کے اسلام نے بہت سے ان مفاسد کا سد باب کر دیا ہے جن کا اس کی جماعت میں حاضری کی وجہ سے قوی احتمال تھا اس کے عام اختلاط کی وجہ سے۔ اسی طرح عورت کو اپنے شوہر کی وفات پر عدت میں بیٹھنے کا حکم ہے۔ اسے تو کوئی قید تصور نہیں کرتا نہ عورت نہ عورتوں کی ہمدرد۔ نیز سیاسی تگ و دو کے لیے عورت کو ملک اور بیرون ملک سفر کرنا پڑیں گے اور عورت حج و عمرہ جیسے مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے بھی بغیر محرم کے سفر نہیں کر سکتی چہ جائیکہ عام سفیر یا سیاسی سفیر وغیرہ (مترجم)

چوتھی دلیل:

یہ فرمان الٰہی ہے "مرد حاکم ہیں عورتوں پر (النساء:34) یعنی ازدواجی زندگی میں مرد خاندان کا سربراہ ہوتا ہے اور وہی مسئول اور منتظم ہوتا ہے۔ عورت کہیں بھی حتیٰ کہ مغرب میں بھی خاندان کی یا گھر کی سربراہ نہیں مانی جاتی محاورتاً اسے گھر کی ملکہ ضرور کہا جاتا ہے۔ بادشاہ کہیں بھی نہیں جانا جاتا یعنی عورت مرد کی سربراہ نہیں ہو سکتی یعنی جو عورت ایک چھوٹے سے گھر کی سربراہ نہیں ہو سکتی وہ پوری مملکت یا ملک کی سربراہ کیسے ہو سکتی ہے؟ اسے بعض امور میں ولایت ضرور حاصل ہے جیسے فتویٰ' اجتہاد اور تعلیم و تربیت وغیرہ۔ اس پر علماء کا اجماع ہے اور اس پر گزرے زمانوں میں عمل بھی ہوتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسمبلی کی رکنیت یعنی عملی سیاست کے لیے جس قدر تگ و دو اور بھاگ دوڑ کی ضرورت ہوتی ہے وہ ایک پر مشقت اور انتہائی کٹھن کا کام ہے جو گھر کی سربراہی سے بھی زیادہ کٹھن ہے۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنے گھریلو فرائض یعنی شوہر کی خدمت اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے کم وقت دینا پڑے گا۔ یا یوں کہیں کہ اپنے

اصل فرائض سے غفلت برتنا پڑے گی۔اس سے ظاہر ہے گھر کا نظام درہم برہم ہونے کا احتمال ہے جب گھر کا نظام ہی ابتر ہو جائے جو ایک بنیادی اکائی ہے مملکت کی تو پھر پوری مملکت کا نظام کیسے صحیح چل سکتا ہے؟ یعنی عورت کا گھر میں موجود رہ کر گھریلو فرائض منصبی بہ احسن طور انجام دینا گھر سے باہر وجود سے زیادہ مسعود اور بہتر ہے اور اس کے گھر سے بلا وجہ یعنی شرعی ضرورت کے بغیر نکلنے میں مفاسد ہیں۔اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔کوئی فلاح نہیں ہے۔اس میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں وہ ہر کہ ومہ پر عیاں ہیں کہ اخبارات اغوا وقتل کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

یہ درست ہے کہ دین کی تبلیغ یعنی نصیحہ فی الدین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر علماء وائمہ اور عوام وخواص سب پر یکساں واجب ہے اور اس پر صرف مردوں کا ہی حق نہیں ہے عورت کا بھی حق ہے۔تو کیا اس کے لیے اسمبلی کی رکنیت ہی شرط ہے؟ یہ کام تو ہر عورت اپنے دائرہ کار یعنی اپنے عزیز واقارب میں بخوبی کر سکتی ہے۔پھر ڈاکٹر صاحب عہد نبوی ﷺ کی مشہور خواتین کی مثالیں دے کر اپنی بات واضح کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ اور حضرت سمیہؓ کی مثالیں موجود ہیں۔حضرت خدیجہؓ نے اپنی تمام دولت اسلام کی خدمت اور اشاعت کے لیے نچھاور کر دی۔اپنا تمام وقت اپنے عظیم شوہر اور اپنی عظیم بیٹیوں کے لیے وقف کر دیا۔انہوں نے ہر دکھ سکھ میں آپ ﷺ کا ساتھ دیا۔حضرت سمیہؓ کے پورے خاندان نے مشرکین مکہ کی اذیتوں پر بے مثال صبر کیا پھر آپ فرماتے ہیں کہ عہد نبوی ﷺ میں عورتوں کا جہاد میں حصہ لینا اسی قدر محقق ہے کہ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ اور پیاسے مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں۔صرف ام عمارہؓ کی منفرد مثال ہے کہ انہوں نے غزوۂ احد اور یمامہ میں قتال کیا جس کی آپ ﷺ نے تحسین فرمائی مرفیدہ اسلمی کی مثال ہے کہ انہوں نے غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن معاذ کا علاج کیا یعنی اس عہد کی خواتین نے بڑے اہم رول ادا کیے جو کسی صورت مردوں کے رول سے کم نہیں۔لیکن اگر سیاست میں عورت کا حصہ لینا ضروری ہوتا تو اس سے زیادہ اس کا مردوں کے شانہ بشانہ عملی جہاد میں حصہ لینا ضروری ہوتا کہ جبکہ اوائل اسلام میں مسلمانوں کی قلت تعداد کے پیش نظر اس کی

اشد ضرورت بھی تھی لیکن اسلام نے عورت کی فطری جبلت کا لحاظ کرتے ہوئے اس پر عملی جہاد میں حصہ لینا موقوف کر دیا۔

مترجم کی رائے میں عہد نبوی ﷺ کی خواتین کا جو دوسرا اہم کردار رہا ہے وہ یہ ہے کہ گو انہوں نے عملی جہاد میں حصہ نہیں لیا لیکن ان عظیم المرتبت ماؤں نے مجاہدین غازی اور شہید بیٹوں کو جنم دیا ان الوالعزم اور باوفا بیبیوں نے اپنے خاوندوں کو بہنوں نے اپنے پیارے بھائیوں کو جہاد اور شہادت کی ترغیب دی۔ آج کی مسلمان عورت کا بھی یہی فریضہ ہے کہ مجاہد غازی اور شہید بیٹے پیدا کرے انہیں جہاد کے لیے ابھارے۔ مسلمان بیویاں اپنے شوہروں بہنیں اپنے بھائیوں کو جہاد اور شہادت کی ترغیب دیں کیونکہ آج کے عالم اسلام کے تمام سیاسی اقتصادی سماجی اور معاشرتی مسائل کا حل جہاد میں مضمر ہے۔

سیاست میں مسلمان عورت کے حصہ لینے سے یہ کام افضل اور اہم ہے وہ مجاہدوں' غازیوں اور شہیدوں کی مائیں بہنیں اور بیویاں کہلائیں کیونکہ آج ہنود و یہود' فرانس' یورپ اور امریکہ وروس میں اہل کتاب اور مشرکین پھر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ جیسے صلیبی جنگوں میں اور اوائل اسلام میں متحد ہو گئے تھے۔

پانچویں دلیل:

ان لوگوں کے جواب میں جو ام المومنین حضرت عائشہؓ کا جنگ جمل میں حصہ لینے کو دلیل بناتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عائشہؓ جیسی علم وفضل اور جمال وکمال والی عورتیں شاذ ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ایک عرب شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ولو ان النساء کمثل صلبزی لفضلک النساء علی الرجال

ترجمہ: اگر تمام عورتیں حمیر (حضرت عائشہؓ) ایسی ہوتیں تو عورتیں ضرور مردوں پر فضیلت کی بازی لے جاتیں۔

لیکن آپ نے قصاص حضرت عثمانؓ کے لیے اس میں شرکت کی جو ایک واجب تھا۔ بہر حال آپ نے اس قتال میں عملاً شرکت نہیں کی آپ اپنے اونٹ پر ہودج میں

موجود بلکہ مستور ہیں اپنے معنوی بیٹوں سے مستور رہیں اس لیے اس جنگ کا نام جنگ جمل پڑ گیا۔ مترجم کی رائے یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ جیسی عبقری شخصیت کی موجودگی میں امیر المومنین حضرت عثمانؓ کی شہادت سے جو سیاسی بحران امت مسلمہ میں پیدا ہوا۔ پھر بھی ان اجل صحابہ کرامؓ سے جو دینی مسائل اور سیرت نبوی ﷺ کے بارے میں آپ کی ذات صفات سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ سیاسی رہنمائی کے لیے بہر حال امیر المومنین حضرت علیؓ کا انتخاب کیا۔ یعنی سیاسی رہنمائی عورت کے مزاج کے خلاف ہے اسے سیاست کے میدان میں گھسیٹنا نہ صرف عورتوں پر ظلم ہے بلکہ مردوں پر بھی ظلم ہے۔ پوری امت مسلمہ پر ظلم ہے۔ اس میں قوم وملک کی کوئی فلاح نہیں ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ کا فرمان اس باب میں بالکل حق کے برحق کی خلاف ورزی اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی میں فلاح ہو بھی کیسے سکتی ہے؟

وآخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العالمین .

(سہ ماہ منہاج لاہور۔ جولائی تا ستمبر 1998ء جلد نمبر 15 شمارہ 3-4)

نفاذِ شریعت اور تحفظ حقوقِ نسواں

جناب محمد خالد سیف

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں' یہ انتہائی پرفتن دور ہے' فتنہ و فساد کی آندھیاں ہر سو چل رہی ہیں' انتشار اور خلفشار کے طوفان ہیں کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے' عذاریوں اور سازشوں کے زلزلے ہیں' جو ہمارے قصرِ حیات میں دراڑ بلکہ شگاف پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں' تباہی و بربادی ہے کہ اس میں آئے دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے' ہر طرف اضطراب ہی اضطراب' امن' چین اور سکون کے الفاظ لغت کی کتابوں میں تو موجود ہیں مگر آج ہماری اس دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں' لادینیت' الحاد' تشکیک' زندیقیت اور مختلف ''ازموں'' کی بادِ صرصر سے ایمان کی کھیتی مرجھا گئی ہے اور دلوں کی دنیا بنجر اور بے آباد ہو گئی ہے' نئی نئی بیماریاں انسانی روح کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں' ساری انسانیت درد و کرب سے چیخ چیخ اٹھی ہے اور سو بھیس بنا لینے والی عقل عیار بھی جواب دے رہی ہے کہ وہ ان بیماریوں کے علاج سے عاجز و قاصر ہے۔

دلِ گیتی انا السموم انا السموم فریادش
خرد نالاں کہ ماعندی بتریاقِ ولا راق

امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف التحیۃ و التسلیم جسے کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ ۔ تم بہترین اُمت ہو۔ کے لقب سے نوازا گیا تھا اور جسے اَنتُمُ الاَعلَونَ ۔ تم ہی بلند و برتر ہو ۔ کا مژدۂ جانفزا سنایا گیا تھا' آج اس پر بھی نہ صرف یہ کہ فتح و نصرت کے دروازے بند ہیں بلکہ یہ امت دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی دن بہ دن اجتماعی انحطاط کی

طرف لڑھکتے چلے جارہی ہے۔

اگر ہم ان شقاوتوں کو سعادتوں سے بدلنا چاہتے ہیں' ان شکستوں اور نامرادیوں کے عوض نصرتوں اور کامرانیوں کے خواہاں ہیں اور آلام مصائب کا تختۂ مشق بننے کے بجائے امن' چین اور سکون کے متلاشی ہیں' تو آیئے پھر اسی خدائے ذوالجلال والاکرام سے لو لگائیں جس نے ہمارے ساتھ فتح و نصرت کے وعدے فرمائے ہیں اور پھر سے اس عہد و پیماں پر کاربند ہو جائیں' جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم نے اللہ تعالیٰ سے کر رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اس کے ارشادات اور اس کے محبوب پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کے مطابق اپنی عملی زندگیاں اپنائیں گے' مگر افسوس کہ آج مسلمان رشد و ہدایت کے ان حقیقی سرچشموں سے اعتراض کر رہے ہیں' کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے دامن چھوڑ کر' منکرینِ خدا اور رسول کے ملحدانہ افکار و نظریات اور فلسفہ و عقائد کو اپنا رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اسلامی شریعت کا نفاذ ہی ہماری بیماریوں کا علاج' تمام دردوں کا درماں اور دکھوں کا مداوا ہے اور ہم مسلمانوں کے لیے اس دورِ پرفتن میں اگر کوئی چیز ذریعہ نجات بن سکتی ہے' تو وہ صرف اور صرف شریعت بیضاء اور دینِ اسلام کا مکمل نفاذ ہے اور اس کے مطابق پورا پورا عمل! شریعت ہی ہمارا دستور و منشور ہے اور شریعت ہی ہمارا آئین و قانون ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر ہم نے یہ خطۂ پاک سرزمین حاصل کیا تھا یعنی

پاکستان کا مطلب کیا

لا الٰہ الا اللہ!

اس مقصود مطلوب کی خاطر ہم نے بے پناہ قربانیاں دی تھیں' آلام و مصائب کا تختۂ مشق بنے' خاک و خون میں تڑپے' جگر لختوں کو لخت لخت ہوتے برداشت کر لیا اور عفتوں اور عصمتوں کے تقدس کی بے حرمتی کو سہہ لیا تھا' اسی مقصود و مطلوب کی خاطر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کے وطن مالوف کو خیرباد کہا تھا' سنگلاخ وادیوں کو طے کیا' خارزار گھاٹیوں سے گزرے اور پھر بے حد و حساب اور بے شمار نو دمیدہ کلیوں' نو شگفتہ غنچوں' عفت مآب دوشیزاؤں' رعنا جوانوں اور مقدس بوڑھوں کی گردنوں کے پاک اور پوتر خون پر اس وطنِ

عزیز کی بنیادوں کو استوار کیا تھا تاکہ لیلائے آزادی سے ہم کنار ہو کر دین متین اور شریعت بیضاء کے مطابق زندگی بسر کر سکیں مگر آہ! بصد آہ!! صبح تمنا کے بجائے شام حسرت کے سائے دراز سے دراز ہوتے چلے گئے اور پھر ظلمتوں اور تاریکیوں نے اس قدر طول کھینچا کہ ٹامک ٹوئیے مارتے ہوئے' شریعت بیضاء کے شاہراہ مستقیم کو چھوڑ کر شیطانی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے چالیس برس سے بھی زیادہ عرصہ بیت گیا مگر سعادتوں اور سرفرازیوں کا سپیدۂ سحر نمودار نہ ہو سکا' جب کہ قرآن مجید ہمیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر اس طرح پکار رہا ہے:

وَاَنزَلنَا اِلَیکَ بِالحَقِّ مُصَدِّ قاً لِمَا بین یَدَیہِ مِنَ الکِتَابِ وَ مُھَیمِناً عَلَیہِ فَا حکُم بَینَھُم بِمَآ اَنزَلَ اللہ وَلاَ تَتَّبِع اَھوَآءَ ھَم عَمَّا جَآءَ کَ مِنَ الحَقِّ ط لِکُلٍّ جَعَلنَا مِنکُم شِرعَۃً وَ مِنھَا جًا ط وَط وَلو شَآءَ اللہُ بَحَلَلَکُم اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِن لِّیَبلُوَ کُم فِی مَآ اٰتکُم فَا ستَبِقُوا الخَیرٰت ط اِلَی اللہِ مَر جِعُکم جمیعا فینبکھ بما کنتم فید تختلفون و ان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھوآ ھم و احذرھم ان یفتوک عن بعض ما انزل اللہ الیک فان تو لو ا نا علم انما یرید اللہ ان یصیبھم ببعض ذنو بھم و ان کثیرا من الناس لفسقون افحکم الجا ھلیتہ یبغون و من احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون

ترجمہ: اے محمد! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی ہے جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے' اس کی تصدیق کرنیوالی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے لہذا تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے' اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو' ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی ہے' اگر تمہارا اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا لیکن اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے' اس میں تمہاری آزمائش کرے لہذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو آخر تم سب کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں اصل حقیقت

بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو' پس اے محمدؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو' ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ بھر منحرف نہ کرنے پائیں' جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں (اگر یہ اللہ کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں' ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

ان آیات کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی ہدایت کے لیے تورات اور عیسائیوں کی ہدایت کے لیے انجیل کے نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے اور ان لوگوں کو اپنی اپنی شریعت کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے۔

وَمَن لَّم يَحكُم بِمَآ اَنزَلَ اللهُ فَاُ و لٰـئِکَ هُمَ الکٰا فِرُو نَ

(جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں' وہی کافر ہیں)

پھر فرمایا:

وَمَن لَّم يَحكُم بِمَآ اَنزَلَ اللهُ فَاُ و لٰـئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْن

(جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

اور پھر فرمایا:

وَمَن لَّم يَحكُم بِمَآ اَنزَلَ اللهُ فَاُ ولٰـئِکَ هُمُ االفَا سِقُونَ

(اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں' وہی فاسق ہیں۔

یعنی جس ملک' معاشرے اور قوم کے افراد اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون یعنی شریعت کو نافذ نہیں کرتے تو وہ تین بڑے جرائم (۱) کفر (۲) ظلم اور (۳) فسق کا ارتکاب کرتے ہیں اور یہ ایسے سنگین جرائم ہیں کہ آخرت میں ان کی جو سزا ہے' وہ تو ہے ہی مگر اپنے

دنیوی قانون جرم وسزا کے مطابق اللہ تعالیٰ ان جرائم کی دنیا میں بھی سزا دیتا ہے' چنانچہ اس سلسلہ میں "سنن ابن ماجہ" کی حسب ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیں:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَقْبَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِيْنَ! خَمْسٌ اِذَا ابْتُلِيْتُمْ بِهِنَّ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تُدْرِكُوْهُنَّ' لَمْ يَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِيْ قَوْمٍ قَطُّ حَتّٰى يُعْلِنُوْا بِهَا اِلَّا فَشَىٰ فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ وَالْاَوْجَاعُ الَّتِيْ لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِيْ اَسْلَافِهِمُ الَّذِيْنَ مَضَوْا وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلَّا اُخِذُوْا بِالسِّنِيْنَ وَشِدَّةِ الْمَئُوْنَةِ وَجَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ' وَلَمْ يَمْنَعُوْا زَكٰوةَ اَمْوَالِهِمْ اِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَآءِ وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوْا' وَلَمْ يَنْقُضُوْا عَهْدَ اللّٰهِ وَعَهْدَ رَسُوْلِهِ اِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ' عَدُوًّا مِّنْ غَيْرِهِمْ فَاَخَذُوْا بَعْضَ مَا فِيْ اَيْدِيْهِمْ' وَمَا لَمْ تَحْكُمْ اَئِمَّتُهُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَيَتَخَيَّرُوْا مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ بَاْسَهُمْ بَيْنَهُمْ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے گروہ مہاجرین! پانچ کاموں میں مبتلا نہ ہو جانا اور میں اس بات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم ان میں مبتلا ہو جاؤ (پھر آپ نے ان پانچ کاموں اور ان کے انجام کی حسب ذیل تفصیل بیان فرمائی)

۱۔ جس قوم میں عیاشی و فحاشی اس قدر عام ہو جائے کہ وہ سرِ عام اور علانیہ طور پر اس کا ارتکاب کرنے لگے' تو اللہ تعالیٰ اسے طاعون اور ایسی ایسی مہلک بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے' جن سے اس کے آباؤ اجداد محفوظ تھے۔

۲۔ جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں' تو اللہ ان پر قحط سالی' معیشت کی تنگی اور ظالم حکمرانوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

۳۔ جو قوم اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا نہ کرے' تو اللہ تعالیٰ اسے بارانِ رحمت سے محروم

کر دیتا ہے اور اگر چوپائے اور جانور نہ ہوں تو انہیں بارش کا ایک قطرہ بھی نہ ملے۔

۴۔ جو قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کیے ہوئے عہد و پیمان کو توڑ دے تو اللہ تعالیٰ ان پر ان کے کسی بیرونی دشمن کو مسلط کر دیتا ہے جو ان کے ملک اور حکومت کے ایک حصے کو چھین لیتا ہے۔

۵۔ جس قوم کے حکمران کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہ کریں اور وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کو (دستور و آئین کے طور پر) اختیار نہ کریں تو اللہ تعالیٰ اسے باہمی انتشار و خلفشار میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ویسے تو اس حدیث شریف میں مذکور تمام نکات ہی خصوصی غور و فکر کے متقاضی ہیں لیکن ہم اس وقت اپنے قارئین کرام کی توجہ آخری دو نکات کی طرف مبذول کرانا بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اور ہم اپنے اس مقالہ میں قبل ازیں یہ بیان بھی کر چکے ہیں کہ ہم نے اس پاک خطۂ سرزمین کے حصول کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و پیماں کیا تھا کہ ہم اس وطن عزیز کو اسلام کا گہوارہ بنائیں گے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ احکام و قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں گے' اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم' رحمت اور توفیق سے ہمیں آزاد وطن تو عطا فرما دیا مگر آزادی کے بعد ہم نے ان تمام وعدوں کو فراموش کر دیا' جو ہم نے اللہ تعالیٰ سے کیے تھے' اللہ رب ذوالجلال نے بھی ہمیں ربع صدی سے زیادہ عرصہ تک مہلت دیئے رکھی مگر جب ہم تمام حدود سے تجاوز کر گئے اور عہد و پیمان کی تمام دھجیوں کو بڑی بے دردی سے فضائے بسیط میں اڑا دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دینوی قانونِ جرم و سزا کے مطابق یہ سزا دی کہ اس نے ہمارے سروں پر ہمارے ایک دشمن کو مسلط کر دیا اور اس نے ہمارے ملک کے ایک حصے کو کاٹ کر ہم سے جدا کر دیا' اتنے بڑے حصے کو کاٹ کر الگ کر دیا' جو مصر جیسے دو ملکوں کے برابر ہے۔ عہد شکن قوم کو اپنے ملک و اقتدار کے ایک حصے سے محروم کرنے در حقیقت ایک جھٹکا دیا جاتا اور سنبھلنے کا ایک موقعہ بھی دیا جاتا ہے' اگر وہ سنبھل جائے اور

تلافی مافات کی کوشش کرے تو یہ اس کی خوش بختی ہے اور اگر پھر بھی باز نہ آئے تو پھر اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اسے صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے بس یہی وہ نکتہ ہے، جس کی طرف میں اپنی قوم کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

اسی طرح دوسری اہم بات جس کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے وہ انتشار و خلفشار کی یہ موجودہ فضا ہے جو اس وقت وطن عزیز پر طاری ہے۔ ہم جو ہر طرف انتشار ہی انتشار اور خلفشار ہی خلفشار دیکھتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں میں اختلاف، ہمارے سیاستدانوں میں انتشار، حضرت علماء کرام ایک دوسرے سے برسر پیکار اور پوری قوم عجیب اضطراب میں مبتلا ہے تو یہ بھی درحقیقت حدیث شریف میں مذکور آخری نکتہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے دنیوی قانونِ جرم و سزا کے مطابق عذابِ الٰہی کی ایک صورت ہے۔

افسوس تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک کبھی بھی نفاذ شریعت کے لیے کوئی مخلصانہ کوشش نہیں ہوئی اور اگر کبھی کوئی تھوڑی بہت کوشش ہوئی بھی تو بعض حلقوں کی طرف سے اس قدر طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا گیا کہ نہ معلوم نفاذ شریعت سے کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی، کبھی اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیا گیا، کبھی نظامِ معیشت کی تباہی کا رونا رویا گیا، کبھی کوئی پروپیگنڈہ کیا گیا اور کبھی کوئی! اللہ و رسولؐ کے باغیوں اور اسلامی شریعت کے منکروں نے اس سلسلہ میں ایک یہ غلط پروپیگنڈہ بھی کیا کہ اسلامی شریعت کے نفاذ کے بعد عورتیں اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں گی حالانکہ اسلام ہی وہ دین رحمت ہے جس نے عورتوں کے حقوق کا سب سے زیادہ تحفظ کیا ہے، اسلام نے عورتوں کے حقوق و فرائض میں اس قدر توازن اور اعتدال پر مبنی تصور پیش کیا ہے کہ مذاہب عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی مگر غلط پروپیگنڈہ کے ذریعہ ہماری قابل صد احترام خواتین کو ہمیشہ گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی لہٰذا آج کی صحبت میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ دین اسلام اور شریعت مصطفویؐ میں حقوقِ نسواں کا کس قدر تحفظ کیا گیا ہے۔

ہم نے جو یہ عرض کیا ہے کہ اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے جب بھی کوئی کوشش ہوئی، غلط پروپیگنڈہ کر کے ہماری معزز خواتین کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی مثلاً ۱۹۷۹ء میں

جب حدود آرڈیننس جاری کیا گیا تو مخالفین نے آسمان سر پر اٹھالیا اس آرڈی ینس کی مخالفت میں طرح طرح کے حربے اختیار کیے گئے، عورتوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ انہیں ان کے حقوق سے محروم کیا گیا حتیٰ کہ ان جرائم میں انہیں شہادت کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ "پاکستان کمیشن" نے "خواتین کے مقام و مرتبہ" کے موضوع پر ایک رپورٹ مرتب کی، اس رپورٹ کے باب نمبر ۸ میں مختلف قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلہ میں جو سفارشات کی گئی ہیں، ان میں سے ایک سفارش یہ بھی ہے:

"حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء میں خواتین کو زنا، شراب نوشی، قذف اور چوری کے جرائم میں شہادت دینے سے محروم رکھا گیا ہے۔ ہر مقدمہ میں اثبات جرم کے لیے دو، چار بالغ مسلمان مرد گواہوں کی شہادت لازمی ٹھہرائی گئی ہے لہٰذا اس قانون میں ترمیم کی جائے تاکہ خواتین اور اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شہادت دینے کے اہل ہوسکیں۔"

اسی طرح اور بھی بہت سے حلقوں کی طرف سے مسلسل آواز اٹھائی گئی اور اب تک اٹھائی جارہی ہے کہ یہ عورتوں کی حق تلفی ہے کہ انہیں ان مسائل میں شہادت سے محروم رکھا گیا ہے لہٰذا ہم سب سے پہلے مسئلہ شہادت ہی کا جائزہ لیتے ہیں۔

مسئلہ شہادت اور خواتین

سب سے پہلے بنیادی اصولی بات یہ ہے کہ مختلف مسائل میں اسلام نے نصاب شہادت کے سلسلہ میں جو تصور پیش کیا ہے، اگر اسے پیش نظر رکھا جائے تو تمام شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کا ازخود ازالہ ہو جاتا ہے لہٰذا درجِ ذیل سطور میں ہم اسلام کے مقرر کردہ نصاب شہادت پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں:

نصابِ شہادت

شہادت کا تعلق مالی حقوق سے ہوگا یا جسمانی حقوق سے یا پھر حدود اور قصاص کے مسائل سے ہوگا؛ چنانچہ ان تمام حالات میں سے ہر ہر حالت میں اثباتِ دعویٰ کے لیے

نصابِ شہادت کی شریعت نے مختلف صورتیں مقرر فرمائی ہیں' جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

چار مردوں کی شہادت

حدِ زنا میں نصابِ شہادت چار مردوں کی گواہی ہے؛ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالّٰتِی یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ (4)

مسلمانو! تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں' تو ان پر اپنے لوگوں میں سے چار مردوں کی شہادت لو۔"

اللہ رب ذوالجلال والاکرام نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُهَدَآءَ

اور جو لوگ پرہیز گار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں۔ اسی طرح ایک تیسرے مقام پر بھی اللہ جل شانہ کا ارشادِ گرامی ہے:

لَوْ لَا جَآءُوْا عَلَیْهِ بِاَرْبَعَۃِ شُهَدَآءَ

یہ اپنی بات (کی تصدیق) کے لیے چار گواہ کیوں نہ لائے۔

ان آیاتِ مبارکہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدِ زنا کے سلسلہ میں نصاب چار مردوں کی شہادت ہے۔ زنا چونکہ ایک انتہائی سنگین نوعیت کا جرم اور اللہ ربّ ذوالجلال والاکرام کی بہت بڑی معصیت اور نافرمانی ہے اس لیے اس کی سزا بھی انتہائی سنگین ہے لہٰذا شہادت کا نصاب بھی یہاں انتہائی درجے کا رکھا گیا ہے تاکہ کوئی بے گناہ ناجائز طور پر نہ مارا جائے یا ڈر ہے جرمِ زنا میں نصاب شہادت چار مردوں کی گواہی نہ صرف قرآن مجید میں مذکور ہے بلکہ تورات اور انجیل میں بھی اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا تھا' چنانچہ ہماری اس بات کی تائید و تصدیق حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث

سے بھی ہوتی ہے کہ یہودی عدالت نبویؐ میں ایک ایسے مرد اور عورت کو لے کر آئے جنہوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میرے پاس اپنے دو ایسے آدمی بھی لاؤ جو تمہاری شریعت کے سب سے بڑے عالم ہوں؟ چنانچہ یہودیوں نے عدالت نبویؐ میں صوریا نامی ایک شخص کے دو بیٹوں کو پیش کیا تو آپؐ نے انہیں اللہ کی قسم دے کر یہ پوچھا:

كَيْفَ تجِدانِ اَمْرَ هٰذَيْنِ فِي التَّوْراةِ؟

تم اس بدکار جوڑے کی بابت تورات میں کیا حکم الٰہی پاتے ہو؟

انہوں نے جواب دیا:

نَجِدُ التَّوْرَاةِ اِذاشَهِدَ اَرْبَعَة اَنّهَم رَاَوْ اذْ اذ كَرَه فِي فَرْجِهَا مِثْلَ الْمِيْلِ لِمُكْحَلَةِ رُجِمَا.

''تورات میں ہم یہ حکم الٰہی لکھا ہوا پاتے ہیں کہ جب چار مرد یہ شہادت دے دیں کہ انہوں نے مرد کے آلہِ تناسل کو عورت کے اندام نہانی میں اس طرح دیکھا ہے، جس طرح سرمہ لگانے کی سلائی سرمہ دانی میں ہوتی ہے تو انہیں رجم کر دیا جائے۔''

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَمَا يَمْنَعُكُمَا اَنْ تَرْجُمُوْهُمَا؟

پھر تم ان دونوں کو رجم کیوں نہیں کرتے؟

یہودیوں نے جواب دیا:

''ہماری بادشاہت ختم ہو چکی ہے اور ہم قتل کو ناپسند کرتے ہیں۔''

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہوں کو طلب فرمایا! چنانچہ چار مرد گواہوں نے یہ شہادت دی کہ انہوں نے اس مرد کے آلہِ تناسل کو اس عورت کی شرم گاہ میں اسی طرح دیکھا ہے، جس طرح سرمہ لگانے والی سلائی سرمہ دانی میں داخل ہوتی ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مرد گواہوں کی شہادت کے بعد رجم کا فیصلہ صادر فرمایا اور اس بدکار جوڑے کو سنگسار کر دیا گیا۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج کل بعض اہل علم یہاں حدود محدود کی لفظی بحث کر کے غلط استدلال کرتے ہیں جب کہ سلفًا عن خلفٍ اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ اس آیتِ مبارکہ (النساء:۱۵) میں اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ سے مراد چار مرد ہیں؛ چنانچہ امام ابو بکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی رحمۃ اللہ علیہ (۴۶۸-۵۴۳ھ) فرماتے ہیں:

اَلْمُرَادُ بِهٖ هَاهُنَا الذُّكُوْرُ دُوْنَ الْاِنَاثِ لِاَنَّهٗ سُبْحَانَهٗ ذَكَرَ اَوَّلاً مِنْ نِّسَآئِكُمْ " ثُمَّ قَالَ مِنْكُمْ فَاقْتَضٰى ذٰلِكَ اَنْ يَّكُوْنَ الشَّاهِدُ غَيْرَ الْمَشْهُوْرِ وَلَا خِلَافَ فِيْ ذٰلِكَ بَيْنَ الْاُمَّةِ

(احکام القرآن' ابن العربی ج ۱ص ۳۶۰' مسئلہ نمبر ۱۰)

"یہاں چار گواہ سے مراد چار مرد گواہ ہیں' عورتیں نہیں کیونکہ یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے" مِنْ نِّسَآئِكُمْ " کا لفظ ذکر فرمایا اور پھر مِنْكُمْ فرمایا تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ شاہد اور مشہود علیہ الگ الگ ہوں' چنانچہ اس بارے میں امت کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہاں مراد چار گواہ ہیں۔"

اسی طرح امام المفسرین ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

وَلَا بُدَّ اَنْ يَّكُوْنَ الشُّهُوْدُ ذُكُرًا لِقَوْلِهٖ مِنْكُمْ وَلَا خِلَافَ فِيْهِ بَيْنَ الْاُمَّةِ

(الجامع لاحکام القرآن' قرطبی ج ۵ص ۸۴ مسئلہ نمبر ۶)

یہاں یہ از بس ضروری ہے کہ گواہ مرد ہوں کیونکہ "مِنْكُمْ" کا تقاضا یہی ہے اور اس مسئلہ میں پوری اُمت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

یاد رہے یہاں فقہائے ظاہریہ نے جو ہر مرد کے بجائے دو عورتوں کی شہادت کو بھی قابل قبول قرار دیا ہے یعنی ان کے نزدیک چار مردوں کے بجائے اگر آٹھ عورتیں شہادت دیدیں تو یہ بھی جائز ہے نیز عطا نے تین مردوں اور دو عورتوں کی شہادت کو بھی جو

قبول قرار دیا ہے تو یہ ایک شاذ قول ہے' جسے امت میں پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی۔

تین مردوں کی شہادت

جب کوئی شخص اپنے فقیر ہونے کا دعویٰ کرے تاکہ وہ زکوٰۃ کا مستحق قرار دیا جا سکے' جب کہ اس کے بارے میں مشہور یہ ہو کہ وہ دولت مند ہے تو اسے اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے تین مردوں کی شہادت پیش کرنا ہوگی۔ جیسا کہ حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے ثابت ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

وَرَجُلٌ اَصَابَتْهُ فَاقَةٌ حَتّٰى يَقُوْلَ ثَلَاثَةٌ مِّنْ ذَوِى الْحِجَا مِنْ قَوْمِهٖ لَقَدْ اَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْئَلَةُ

(صحیح مسلم ج ۳ ص ۹۷' سنن ابی داؤد (حدیث شریف نمبر ۶۴۰)

(تیسرا شخص) جس شخص کے لیے سوا کرنا جائز ہے' وہ ہے جو فاقہ زدہ ہو جائے اور اس کی قوم کے تین عقل مند مرد یہ شہادت دے دیں کہ فلاں شخص فاقہ زدہ ہو گیا ہے' تو اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے۔

دو مردوں کی شہادت

تمام مالی و جسمانی حقوق اور تمام حدود میں صرف دو مردوں ہی کی شہادت قابل قبول ہے' عورتوں کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ ہاں البتہ حدِ زنا میں دو کے بجائے چار مردوں کی شہادت ضروری قرار دی گئی ہے' جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ یاد رہے کہ تمام فقہائے کرام کے نزدیک حدود میں عورتوں کی شہادت مقبول نہیں ہے۔ طلاق اور رجوع کے مسائل کے ضمن میں بھی ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ

(سورۃ طلاق آیت:۶)

اور اپنے میں سے دو عادل مردوں کو گواہ بنالو۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ جب حضرت اشعث بن قیس کندی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک شخص کے ساتھ کنوئیں کے بارے میں جھگڑا ہوا اور یہ کیس عدالتِ نبویؐ میں پیش ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعث بن قیسؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ:

شُهِدَاکَ اَوْ یَمِیْنُه

تم دو گواہ پیش کر دیا پھر تمہارے مدمقابل سے حلف لیا جائے گا۔

دو مردوں یا ایک مرد اور دو عوتوں کی شہادت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ج فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى

''اور اپنے میں سے دو مردوں کو (ایسے معاملے کے) گواہ بنا لیا کرو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم بطورِ گواہ پسند کرو (کافی ہیں) کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔''

تمام مالی معاملات، مثلاً بیع، قرض، اجارہ، رہن، اقرار اور غصب وغیرہ کے مسائل میں یہی مذکورہ بالا نصابِ شہادت ہے، فقہائے احناف کے نزدیک تمام مالی امور نیز نکاح طلاق اور رجوع کے مسائل میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی شہادت بھی قابل قبول ہے مگر حدود اور قصاص میں قابل قبول نہیں ہے، فقہائے حنابلہ میں سے امام ابن قیمؒ نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ امام مالکؒ ائمہ شافعیہ اور دیگر بہت سے ائمہ کرام اور فقہائے عظام کا بھی یہی مسلک ہے کہ عورتوں کی شہادت صرف مالی امور اور ان کے متعلقات میں تو قابل قبول ہے مگر حدود اور قصاص کے مسائل میں قابل قبول نہیں ہے۔

ایک آدمی کی شہادت

اذان' نماز' روزہ اور دیگر عبادات کے سلسلہ میں صرف آدمی کی شہادت قابل قبول ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے' تو آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور دوسرے لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دے دیا۔

فقہائے احناف نے بعض استثنائی حالات مثلاً ولادت' استاد کی شاگردوں کے معاملات میں شہادت جرح وتعدیل شہود کے بارے میں شہادت' عزل وکیل اور عیب مبیع وغیرہ میں بھی ایک آدمی کی شہادت کو مقبول قرار دیا ہے۔ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ حاکم یا قاضی کے لیے ایک آدمی کی شہادت کی بنیاد پر بھی فیصلہ کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رویت ہلال کے سلسلہ میں ایک ہی شخص کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے نیز سلب کے ایک کیس میں بھی آپ نے ایک ہی آدمی کی شہادت کو قبول فرمایا ہے۔ حضرت امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ''سنن'' میں ایک باب کا عنوان ہی یہ قائم فرمایا ہے کہ:

''بَابٌ اِذَا عَلِمَ الْحَاكِمُ صِدْقَ الشَّاهِدِ الْوَاحِدِ يَجُوْزُ لَهٗ اَنْ يَحْكُمَ بِهٖ۔''

جب شاہد ایک ہو اور حاکم کو یہ معلوم ہو کہ وہ سچا ہے تو اس ایک شاہد کی شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کرنا جائز ہے۔

شہادتِ رضاعت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت کے سلسلہ میں تنہا مرضعہ کی شہادت ہی مقبول ہے کیونکہ صحیح بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ جب عقبہ بن حارث نے ام یحییٰ بنت ابی اِھَابْ سے شادی کر لی تو ایک عورت نے کہا کہ میں نے تو تم دونوں کو دودھ پلایا تھا' چنانچہ عقبہ نے جب آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب یہ نکاح کیسے باقی رہ سکتا ہے جب کہ یہ بات کہہ دی گئی ہے! چنانچہ عقبہ نے اس عورت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس نے کسی اور سے شادی کر لی۔

احناف کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت کا مسئلہ بھی دیگر مسائل ہی کی طرح ہے یعنی اس کے لیے بھی دو آدمیوں یا ایک آدمی دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے، صرف مرضعہ کی شہادت کافی نہ ہوگی۔ حضرت امام مالکؒ کے نزدیک دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے، جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مرضعہ کی شہادت مع دیگر تین عورتوں کے مقبول ہوگی۔ بشرطیکہ۔ رضاعت کے ساتھ اجرت وغیرہ کا مسئلہ درپیش نہ ہو۔ ائمہ ثلاثہ نے حدیث عقبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ اسے استحباب اور شکوک و شبہات سے اجتناب پر محمول کیا جائے گا۔

شہادتِ استہلال

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے استہلال (یعنی بوقت ولادت بچے کے رونے) کے لیے صرف دایہ کی شہادت ہی کو جائز قرار دیا ہے۔ امام شعبی، نخعیؒ، قاضی شریح اور سیدنا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا بھی مسلک یہی ہے امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بھی رضاعت کی طرح دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔

حضرت الامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ثبوتِ استہلال کے لیے دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے، جب کہ اس شہادت کا تعلق ثبوت میراث سے بھی ہو اور اگر شہادت اس کی نمازِ جنازہ یا غسل کے لیے مطلوب ہو تو پھر ایک عورت ہی کی شہادت کافی ہے۔

فقہائے حنابلہ کے نزدیک عورتوں کے مخصوص مسائل میں ایک عادل عورت کی شہادت بھی مقبول ہے جیسا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث شریف سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دایہ کی شہادت کو قبول فرمالیا تھا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مختلف مسائل اور مختلف

حالات میں شریعت نے نصاب شہادت مختلف رکھا ہے' اس میں کمی بیشی کا ہمیں کوئی اختیار ہی حاصل نہیں بلکہ جن مصلحتوں اور حکمتوں کے پیش نظر۔ خواہ ہمیں ان کا علم ہو یا نہ ہو۔ شریعت نے نصابِ شہادت کی جو مختلف صورتیں مقرر کی ہیں' ہمیں ان کی پابندی کرنا بہر حال لازم ہے۔ شریعت بیضا اور دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود اور قصاص کے مسائل میں عورتوں کی شہادت کو مشروع قرار نہیں دیا اور خیر القرون میں۔ عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ جیسا کہ حضرت امام زہریؒ کی درج ذیل روایت سے ثابت ہے کہ:

مَضَتِ السُّنَّةُ مِنْ لَدُنِ النبي صلى اللّٰهُ عليه وسلم وَالْخَلِيْفَتَيْنِ مِنْ بَعْدِهٖ اَنْ لَّا شَهَادَةَ لِلنِّسَآءِ فِي الْحُدُوْدِ وَالْقِصَاصِ۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے دونوں خلیفوں حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کے عہد مبارک سے یہ سنت چلی آ رہی ہے کہ حدود اور قصاص میں عورتوں کی شہادت نہیں ہے)

جن مسائل میں شریعت نے عورتوں کو شہادت کا مکلف ہی قرار نہیں دیا' ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ترمیم کا تکلف کر کے ان مسائل میں بھی عورتوں کو شہادت کے لیے مجبور کریں۔ مختصر یہ کہ اس امر پر تمام ائمہ کرام وفقہاء کا اجماع ہے کہ حد زنا کے لیے یہ ضروری ہے کہ گواہ چار عادل مسلمان مرد ہوں جیسا کہ حسب ذیل ارشادات باری تعالیٰ سے ثابت ہے:

1. **لَوْ لَا جَآؤُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ج فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ.**

یہ (افترا پرداز) اپنی بات (کی تصدیق) کے (لیے) چار گواہ کیوں نہ لائے تو جب یہ گواہ نہ لا سکے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔

2. **وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ**

(مسلمانو! تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں' ان پر اپنے لوگوں میں چار مردوں کی شہادت لو۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ.

(اور جو لوگ پرہیز گار عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں۔)

اسی طرح سرورِ کائنات 'فخر موجودات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

اَرْبَعَةُ شُهُوْدٍ وَاِلَّا حَدٌّ فِيْ ظَهْرِكَ.

(چار گواہ پیش کرو گر نہ تمہاری پشت پر حد لگے گی۔

ان تمام دلائل سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ حدود قصاص کے مسائل میں عورتوں کی شہادت قطعاً قابل قبول نہیں ہے' مردوں کے ساتھ مل کر بھی نہیں اور تنہا بھی نہیں لہٰذا پاکستان کمیشن' خواتین کے مختلف حلقوں اور بعض متجدد حضرات کی اس رائے سے قطعاً اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ حدود آرڈیننس 1979ء میں ترمیم کر کے حدود قصاص کے مسائل میں بھی خواتین کو شہادت دینے کا اہل تصور کیا جائے۔

ہم یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ محض غلط پروپیگنڈہ ہے کہ ان مسائل میں عورتوں کی شہادت کو قبول نہ کر کے انہیں ان کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے بلکہ بات درحقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل میں عورتوں کو ملوث نہ کر کے شریعت نے ان کے تقدس' احترام اور عزت و آبرو کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ خصوصاً آج کل ہمارے تھانوں اور عدالتوں میں جو طریق کار مروج ہے' اس کے پیش نظر تو اچھے خاصے مرد حضرات بھی شہادت دینے سے گریز کرتے ہیں لہٰذا پاکستان کمیشن اور فیشن زدہ حضرات اگر عورتوں کے حال پر رحم کریں۔ اور انہیں اس وادی پر خار۔

اسے مے خانہ کہتے ہیں ' یہاں پگڑی اچھلتی ہے
میں نہ ہی گھسیٹیں تو یہ ہماری خواتین کے محترم طبقہ پر کرم ہو گا۔

غلط پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر یا جذبات کی رو میں بہہ کر ان نازک مسائل میں شہادت دینے کے لیے بے قرار محترم خواتین کو یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ گواہوں میں سے ایک بھی اپنے بیان سے منحرف ہو گیا تو اس صورت میں تمام گواہوں پر حدِ قذف لگے گی جو اسی کوڑے ہے۔ کیا ہماری تقدس مآب خواتین اس سزا کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟

مسئلہ شہادت ہمارے علمی حلقوں میں چونکہ کافی عرصہ سے موضوع نزاع بنا ہوا تھا اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس مسئلہ پر اس انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلو قارئین کرام کے فکر و نظر کے سامنے آ جائیں' اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے' اس کا فیصلہ ہم اپنے معزز قارئین کے ذوق پر چھوڑتے ہیں!

اب ہم اختصار کے ساتھ ان حقوق کا ذکر کریں گے جو کاروبارِ حیات سے متعلق دیگر امور و معاملات میں شریعت نے طبقہ نسواں کو عطا فرمائے ہیں۔

اسلام اور تحفظ حقوقِ نسواں

اسلام جن دنوں عورت کو تاریخ میں پہلی بار کل انسانی حقوق سے نواز رہا تھا "ماکون" کی مجلس اس مسئلہ پر غور و فکر کر رہی تھی کہ عورت بغیر روح کی جسم ہے یا اس کے اندر روح بھی ہے۔؟ آخر میں انہوں نے یہ تجویز منظور کی کہ عورت کا جسم (جہنم کے عذاب سے) نجات پانے والی روح سے خالی ہوتا ہے البتہ والدہ مسیح (علیہ السلام) اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں پھر جب یورپین قوموں نے مسیحی مذہب قبول کیا تو اس دین کے حامل لوگوں کی رائے ان پر بھی اثر انداز ہوئی' چنانچہ 586ء (یعنی ٹھیک عہدِ نبوی) میں فرانسیسیوں نے اس مسئلہ پر گفتگو کے لیے ایک مجلس مشاورت لائی کہ آیا عورت انسان ہے یا نہیں؟ آخر میں ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ عورت انسان ہے البتہ اس کا مقصد تخلیق مردوں کی خدمت کرنا ہے۔!

"یہ بھی عجیب بات ہے کہ انگریزی قانون نے 1805ء تک مردوں کو یہ اجازت دے رکھی تھی کہ وہ چاہیں تو اپنی بیویوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ ایک عورت کی قیمت چھ پنس (نصف شلنگ) مقرر تھی۔"

"چند سال پہلے ایک عجیب سانحہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ایک اٹالین نے کسی کے ہاتھ اپنی بیوی کو قسطوں پر فروخت کیا جب خریدار باقی ماندہ قسطیں ادا نہ کر سکا تو اٹالین نے اس

خریدار کو مار ڈالا۔"

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے کہ:

"مسیحی پادریوں کا اولین بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ عورت معصیت کا سرچشمہ اور فسق و فجور کی جڑ ہے۔ مرد کے لیے اس کی حیثیت جہنم کے دروازے کی سی ہے کیونکہ وہی اس کی ساری تحریک او رسرگرمی کا نتیجہ ہے اور اسے گناہوں پر آمادہ کرتی ہے۔ انسانی مشکلات اور پریشانیوں کا بڑا سبب بھی یہی عورت ہے اور عورت جب عورت ٹھہری تو وہ کتنی ہی حسین و جمیل کیوں نہ ہو اسے اپنے حسن و جمال کے باوجود شرم آنی چاہیے کیونکہ وہ سراپا گناہوں کے اسلحہ خانہ کا سب سے بڑا حربہ ہے' عورت کو سدا اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے رہنا چاہیے کیونکہ زمین اور زمین والوں پر بد بختی اور سب سے بڑی مصیبت لانے والی کوئی اور نہیں یہی ہستی ہے۔"

اس کے برعکس اسلام نے جو کہ دین فطرت ہے' انسان کو قدرت کا سب سے حسین شاہکار قرار دیا ہے اور اس نے انسان کو دونوں پہلوؤں۔ مرد و عورت۔ کو یکساں قابلِ احترام گردانا ہے' اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کی روشنی میں نیک عورت بھی اسی طرح کائنات کی سب سے قیمتی اور حسین و جمیل چیز ہے جس طرح نیک مرد اور یہ وہ ابدی حقیقت ہے' جس کا اظہار محسنِ کائنات' فخر موجودات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

اَلدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا اَلْمَرْاَةُ الصَّالِحَةُ.

(تمام دنیا سرمایہ زندگی ہے اور دنیا کا سب سے اچھا سرمایہ نیک عورت ہے)

صنفِ نازک کی خوبی و بہتری کے لیے اس سے بڑی شہادت تمام دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔ عورت کائنات کی سب سے محبوب چیز ہے۔

وجودِ زن سے ہے' تصویر کائنات میں رنگ

لوگوں کی فطرت سلیمہ میں عورت کی محبت سمودی گئی ہے' خالق کائنات کا ارشاد گرامی ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ .

(لوگوں کو ان کی خواہش کی چیزیں یعنی عورتیں...... بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں)

تمام مذاہبِ عالم میں سے صرف اور صرف اسلام ہی وہ واحد دین رحمت ہے جس نے عورتوں کی فلاح و بہبود اور ان کے حقوق کی حفاظت کی پوری پوری ضمانت دی ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر مرد و عورت دونوں کے اندر اس احساس اور شعور کو ابھارتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کے لیے ناگزیر ہے' ایک کے بغیر دوسرے کی شخصیت مکمل ہی نہیں ہو سکتی' اسلام مرد کو یہ تلقین کرتا ہے کہ عورت بھی تیرا ہی ایک جز ہے اور چیز اپنے جز سے بے نیاز نہیں ہو سکتی جب کہ وہ عورت کو یہ بات ذہن نشین کراتا ہے کہ مرد ہی تیری اصلیت ہے اور کوئی انسان اپنی اصلیت سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے اس فلسفہ کو نہایت سادہ اور دلنشین الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا .

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس سے راحت حاصل کرے۔''

شخص سے مراد ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور زوج سے مراد حضرت حوا ہیں۔ مرد و عورت میں جو باہمی محبت و الفت' شعور و احساس' اسرار و رموز' امید و عمل اور والہانہ شیفتگی و فریفتگی کے جذبات پائے جاتے ہیں' ان تمام کیفیات کی قرآن حکیم نے صرف چھ لفظوں میں بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس طرح منظر کشی کر دی ہے کہ اس سے بہتر نقشہ الفاظ میں کھینچا ہی نہیں جا سکتا' چنانچہ ارشادِ قدرت ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ .

(وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔)

میاں اور بیوی میں جو عزیزی' فطری' جذباتی اور وجدانی کیفیات کا دریا موجزن ہوتا ہے' قرآن حکیم اسے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت بلکہ اس کی نشانیوں میں

سے ایک عظیم الشان قرار دیتا ہے' چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ.

(اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تا کہ ان کی طرف (مائل ہوکر) آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔ جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

مرد عورت کی اس حقیقت واصلیت کو ذہن نشین کرانے کے بعد شریعت مطہرہ نے دونوں کے حقوق وفرائض کا تعین بھی کیا ہے اور ان کی حفاظت ونگہداشت پر از حد زور بھی دیا ہے لیکن اس وقت ہمارا موضوع چونکہ ان حقوق کا تعین ہے جو شریعت بیضاء اور دین مصطفیٰ نے ہماری محترم خواتین کو عطا فرمائے ہیں لہٰذا ہماری گزارشات صرف اسی حد تک محدود اور اپنے موضوع کے دائرہ کے اندر رہیں گی۔

قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو بڑی تاکید کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عورتوں کے حقوق کو خواہ وہ واجب ہوں یا مستحب ادا کرنے میں کوئی وقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ کتاب وسنت کی روشنی میں یہ حقوق حسب ذیل ہیں:

1۔ حسن معاشرت

مردوں کے لیے شریعت نے یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے حسنِ معاشرت کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں' ہمیشہ پیار' محبت' نرمی اور شفقت کا مظاہرہ کریں' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

''اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔''

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا طریقہ

تعلیم فرمایا ہے اس کے مطابق ان کے ساتھ زندگی بسر کرو' ہمارے اسلاف کی پاک زندگیاں قرآن حکیم کی تفسیر تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے:

إِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَتزيَّنَ لِامْرَأَتِي كَمَا أُحِبُّ أَنْ تَتَزَيَّنَ الْمَرْأَةُ لِي.

(میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اپنی بیوی کے لیے بن سنور کر رہوں' جس طرح یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ میرے لیے بناؤ سنگھار کرے۔)

خود قرآن حکیم نے بھی ہمیں یہی تعلیم دی ہے کہ:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ص وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

ترجمان القرآن' حبر الامت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت بجالائیں۔ اسی طرح مردوں پر بھی یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھیں اور حسنِ صحبت و معاشرت کا پورا پورا ثبوت دیں۔

اسی طرح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے بہت سے ارشادات میں حقوق نسواں پر بہت زور دیا ہے۔ حضرت عمرو بن احوص خشمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں حمد و ثنا اور ذکر و وعظ کے بعد فرمایا۔

أَلَا وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا 'فَإِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ لَيْسَ تَمْلِكُونَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ

''خبردار عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں تم ان کے بجز اس قید (نکاح) کے کسی چیز کے مالک نہیں ہو۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ

مومنوں میں سے سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ

اچھے اخلاق کا مالک ہے اور تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتے ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ' طیبہ و طاہرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ

(تم میں سے سب سے بہترین وہ ہے' جو اپنے گھر والوں کے لیے بہترین ہے اور میں بھی اپنے گھر والوں کے لیے بہترین ہوں)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بلاشبہ عورتوں کے ساتھ حسنِ معاشرت' نرمی اور محبت' اور عفو و درگزر کے اعتبار سے ایک مینارِ نور تھی' آپ نے کبھی ناراضگی' کا اظہار نہ فرمایا' کوئی سزا دینا تو بہت دور کی بات ہے بلکہ آپ نے حلم و کرم' عفو اور درگزر کے انمٹ نقوش یادگار چھوڑے ہیں۔

حسنِ معاشرت ہی میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے چہرے کو ہشاش بشاش رکھے' یہ نہ ہو کہ غصے اور ناراضگی کی وجہ سے ہر وقت پیشانی پر سلوٹیں پڑی رہیں' گفتگو میں میٹھے' شیریں اور اچھے الفاظ استعمال کرے' بیوی کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹائے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی یہ ثابت ہے کہ آپ ازواج مطہرات کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا دیا کرتے تھے۔

2۔ دینی تعلیم و تربیت

مرد عورت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوگا کیونکہ وہ نگہبان ہے اور ہر نگہبان سے اس کی رعایا کی بابت باز پرس کی جائے گی جیسا کہ مشہور حدیث ہے کہ:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

(تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کی بابت باز پرس ہوگی)

لہٰذا مرد پر عورت کا یہ حق ہے کہ وہ اسے طہارت' وضو' حیض ونفاس' نماز' روزہ' تلاوت قرآن' ذکرِ الٰہی اور اس طرح دین سے متعلق ضروری احکام ومسائل کی تعلیم دے' اسے یہ سکھائے کہ اہل وعیال' اعزہ واقارب اور پڑوسیوں سے کس طرح معاملہ کرنا ہے' لباس کے بارے میں شرعی تقاضے کیا ہیں؟ گفتگو کرتے ہوئے کیا آداب ملحوظ خاطر رکھنا چاہئیں؟ الغرض مرد پر عورت کا یہ حق ہے کہ وہ اس کی دینی تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے' اگر ضروری دینی مسائل سے وہ خود بھی آشنا نہ ہو تو مطالعہ کے لیے دینی لٹریچر فراہم کرے' یا ثقہ علماء سے مسائل پوچھ کر اسے بتاتا رہے۔ افسوس اس باب میں مردوں کی کوتاہی کی وجہ سے ہمارے آج کے اسلامی معاشرے کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ ایک مشہور مصری مصنفہ محترمہ نعمت صدقی نے مردوں کی اس کوتاہی کا شکوہ کرتے ہوئے بجا لکھا ہے کہ:

''اس تبرج وتبذل کی وجہ سے عورتیں جس سوء اخلاق کا شکار ہوئی ہیں وہ محض تنہا اس کی ذمہ دار نہیں کہ بلکہ انہیں اس مقام تک پہنچانے میں مردوں نے بھی خصوصی کردار ادا کیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آدمیوں کی جہالت' تجاہل یا مسولیت کے عدم احساس ہی نے عورتوں کو اس مقام پر پہنچایا ہے کیونکہ آدمیوں پر باپ بھائی' یا خاوند ہونے کے اعتبار سے فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عورتوں پر پابندی عائد کریں اور انہیں بے راہ روی سے روکیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.

(تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے متعلق باز پرس ہوگی)

آدمی اس بات کے بھی مامور ہیں کہ وہ عورتوں کو تہذیب' اخلاق' دین' دنیا اور آخرت کی باتیں سکھلائیں۔

محترمہ نعمت صدقی آگے لکھتی ہیں:

''اے سنگ دل باپ افسوس! کہ تو نے اپنی بچیوں کی دینی تربیت کا خیال نہ رکھا اور انہیں ابدی سعادت سے محروم کر دیا۔ تو نے انہیں دنیوی ساز وسامان مہیا کرنے' اجنبی

زبانیں سکھانے یورپین لوگوں کی عادتیں سکھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن افسوس کہ تو نے انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور قرآن کی تعلیم نہ سکھائی' افسوس' تمہیں اور تمہاری بیٹیوں کو روزِ محشر کس قدر بدبختی اور شقاوت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

کتنے ہی خاوند اور باپ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنی بیویوں اور بچیوں کو مخلوط مجلسوں اور شرم وحیا سے عاری لہو ولعب کے کلبوں میں بھی لیے پھرتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی ان بیویوں اور بچیوں کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ایسا لباس زیب تن کر رکھا ہے کہ ان کے جسم پر ہوتے ہوئے بھی وہ برہنہ ہی ہیں' خود آدمیوں کی طرف وزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور آدمیوں کو اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں' چلتے وقت سینوں کو پھیلاتی سرینوں کو ہلاتی اور بالوں کے نت نئے اسٹائل بناتی رہتی ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود ان نام کے مسلمان شوہروں یا باپوں کے منہ کبھی غیرت سے لال نہیں ہوئے بلکہ انہیں دیکھ کر وہ خوشی اور فخر کا اظہار کرتے ہیں آہ! ہم اس غیرت وحمیت سے کس قدر محروم ہو گئے ہیں۔ جو ہمارے اسلاف کا طرہ امتیاز تھی۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اللہ تعالیٰ کے سامنے مسؤلیت اور جواب دہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اپنے اہل وعیال کو نیکی کرنے اور برائی سے بچنے کی تلقین کرتا رہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے'

"وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى."

(اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو اور اس پر قائم رہو ہم تم سے روزی کے خواستگار نہیں بلکہ تمہیں ہم روزی دیتے ہیں اور (نیک) انجام (اہل) تقویٰ کا ہے۔ اس سے بھی زیادہ زوردار انداز میں اللہ رب ذوالجلال نے ارشاد فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ

(مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتشِ (جہنم) سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں جو ارشاد اللہ ان کو فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں)

اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم یہ دیا کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتشِ جہنم سے بچائیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہم اوامرِ الٰہی کی پابندی کریں اور نواہی سے اجتناب کریں اور اہل وعیال سے بھی اوامر ونواہی کی پابندی کرائیں۔ ان کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہمیشہ تلقین کرتے رہیں۔

4۔ مہر اور نان ونفقہ

مہر عورت کا خالص حق ہے' خاوند' باپ یا بھائی کے لیے عورت کے اس حق پر دست درازی جائز نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗئًا مَّرِيْۗئًا ؀

(اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں' تو اسے ذوق شوق سے کھالو۔)

نیز فرمایا:

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـــًٔـا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُھْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا.

(اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت کرنی چاہو اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے بہت کچھ مت لینا۔ بھلا تم ناجائز طور پر اور صریح ظلم سے اپنا مال اس سے واپس لوگے؟)

اسی طرح حدیث میں ہے' میمون اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَیُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ اِمْرَاَۃً عَلٰی مَاقَلَّ مِنَ الْمَھْرِ اَوْ کَثُرَ لَیْسَ فِیْ نَفْسِہٖ اَنْ یُّؤَدِّیَ اِلَیْھَا حَقَّھَا، خَدَعَھَا، فَاِنْ مَاتَ وَلَمْ یُؤَدِّ اِلَیْھَا حَقَّھَا لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَھُوَ زَانٍ۔

جس آدمی نے کسی عورت سے کم یا زیادہ مہر پر شادی کی مگر اس کے دل میں یہ ہے کہ وہ اس کا حق مہر ادا نہیں کرنا چاہتا تو وہ اسے دھوکا دیتا اور اس کی خیانت کرتا ہے۔ اگر وہ فوت ہو گیا اور اس نے اِس کا حق ادا نہ کیا تو روزِ قیامت اللہ کے دربار میں اِسے زانی کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا۔

نان ونفقہ کی بابت ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم

''مرد عورتوں پر مسلط وحاکم ہیں' اس لیے کہ اللہ نے بعض کو افضل بنایا ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔)

حدیث صحیح میں ہے کہ آدمی کے لیے یہی گناہ کافی ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کو ضائع کردے' بیوی تو اہل وعیال میں سرِ فہرست ہے لہٰذا اس کے حقوق کی ادائیگی پر شریعت نے بطورِ خاص زور دیا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد بھی دولت باقی رہے' اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے' اور خرچ کرتے ہوئے اپنے اہل وعیال سے آغاز کرو' تمہاری بیوی بھی تمہارے اہل وعیال میں سے ہے۔

نان ونفقہ کے بارہ میں شریعت کا مطلوب ومقصود یہ ہے کہ میاں بیوی کے حالات کے مطابق ہو' نیز شریعت ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ آدمی اپنے بیوی بچوں پر جو بھی خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہاں اس کا اجر وثواب ملتا ہے' چنانچہ آنحضرت صلی علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ایک دینار جسے تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہو' ایک وہ دینار ہے جسے تم گردن کی آزادی کے لیے خرچ کرتے ہو' ایک دینار وہ ہے جسے تم مسکین پر خرچ کرتے ہو اور ایک

دینار وہ ہے جسے تم اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے ہو مگر ان سب میں سے۔

اَعْظَمُهَا اَجْرًا الَّذِیْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ

(زیادہ اجر وثواب اس دینار کا ملتا ہے جسے تم اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے ہو)

ہاں البتہ شریعت نے اس بات کا بھی سختی سے حکم دیا ہے کہ اہل وعیال پر جو خرچ کیا جائے وہ حلال ہو ورنہ گھر سے برکت اٹھ جائے گی۔ شریعت نے ہمیں راہ اعتدال یہ دکھائی ہے کہ خرچ میں اسراف ہو اور نہ بخل' اس اصول کو اپنا لیا جائے تو ہماری بہت سی پریشانیاں اور مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

5۔ ایذا نہ پہنچائی جائے

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کے لیے یہ حرام قرار دیا ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے مسلمان کو اپنے قول یا عمل کے ذریعہ ایذا پہنچائے بلکہ اس کے برعکس ہر مسلمان پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے مسلمان بھائی کے جذبات کا احترام کرے' جب ایک عام مسلمان آدمی کے بارے میں شریعت نے ہمیں یہ حکم دیا ہے تو ان سنگدل اور سفاک شوہروں کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچنا چاہیے جو ہر وقت اپنی بے گناہ اور معصوم بیویوں کو آلام ومصائب کا تختہ مشق بنائے رکھتے ہیں' انہیں کبھی بھی یہ بات فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کی جو بھی حق تلفی کریں گے اور ان پر جو بھی ظلم کریں گے اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین کی عدالت میں اس کا جواب دینا پڑے گا۔ عورت کو آزار پہنچانا' حق تلفی کرنا یا اس پر ظلم کرنا تو بہت دور کی بات ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس بات سے بھی منع فرمادیا کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے "تیرا برا ہو" یا یہ کہے کہ "اللہ تعالیٰ تیرے چہرے کو رسوا کرے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا۔

مَا حَقُّ الْمَرْاَةِ عَلَی الرَّجُلِ؟

عورت کا مرد پر کیا حق ہے۔

آپ نے فرمایا عورت کا مرد پر یہ حق ہے کہ:

يُطْعِمُهَا اِذَا طَعِمَ وَيَكْسُوْهَا اِذَا اكْتَسٰى وَلَا تُقَبِّحِ الْوَجْهَ وَلَا يَضْرِ بُهَا اِلَّا ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَلَا يَهْجُرُهَا اِلَّا فِي الْبَيْتِ

(جب کھائے تو اسے بھی کھلائے' جب خود پہنے تو اسے بھی پہنائے چہرے کو برا نہ کہے' ایسی مار نہ مارے جس سے جسم پر نشان پڑ جائے اور اگر اس سے علیحدگی اختیار کرے تو یہ گھر کے حدود کے اندر ہی رہ کر کرے۔)

اسی طرح حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا سب سے زیادہ اہم خطبہ تھا آپ نے مرد وعورت کے حقوق کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

اَلَا اِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَآئِكُمْ حَقًّا وَنِسَآئِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا ' فَحَقُّكُمْ عَلَيْهِنَّ اَلَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُوْنَ 'وَلَا يَاْذَنَّ فِي بُيُوْتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُوْنَ اَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ اَنْ تُحْسِنُوْا اِلَيْهِنَّ فِي كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ

(آگاہ رہو! تمہارے تمہاری عورتوں پر حقوق ہیں اور تمہاری بیویوں کے تم پر حقوق ہیں۔ تمہارا حق عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہاری عزت وآبرو کی حفاظت کریں اور ایسے لوگوں کو تمہارے بستر پر قدم نہ رکھنے دیں' جن کو تم پسند نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو تمہارے گھروں میں آنے کی اجازت نہ دیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ تم خوش دلی سے انہیں کھانا اور کپڑا دو)

تاریخ اس واقعہ کو فراموش نہیں کرسکتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے والد ابوسفیان بن حرب (جو قریش کے سردار اور اس وقت تک غیر مسلم تھے وہ) فتح مکہ کی شام کو امان طلب کرنے کے لیے اپنی بیٹی کے پاس آتے ہیں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے بچ سکیں۔ ظاہر ہے ابوسفیان چھپ کر اور بڑی خاموشی سے آئے تھے اور انہیں پورا یقین تھا کہ مشکل کے اس وقت ان کی بیٹی ان کی خاطر خواہ مدد کرے گی۔

جب ابوسفیان گھر میں آئے تو انہوں نے بچھے ہوئے بستر پر بیٹھنے کے لیے بیٹی

سے اجازت لینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس لیے بے دھڑک گئے اور بستر پر جا کر بیٹھ گئے اور ایک سردار اور باپ کی حیثیت سے اپنے سامنے موجود بیٹی سے خطاب کرنا چاہا۔ انہیں توقع تھی کہ جس بیٹی نے ایک عرصہ سے انہیں نہیں دیکھا آج اس حال میں انہیں دیکھ کر نرم ہوگی اور ان پر واری جائے گی۔ لیکن یہ کیا نرم ہونا اور باپ کو بٹھانا تو درکنار سعادت مند بیٹی چیں بجبیں ہے اور اس بستر کو تہہ کر رہی ہے جس پر باپ بیٹھ گیا ہے۔ کیونکہ یہ بستر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا باوقار اور سردار باپ نے تھوڑا انتظار کیا اور پھر پوچھا بیٹی! کیا یہ بستر میرے لائق نہیں اور پھر پوچھا اس لیے تم نے اسے لپیٹ دیا؟ یا میں بستر کے لائق نہیں ہوں؟ بیٹی نے کسی توقف کے بغیر چمک کر جواب دیا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور تم مشرک آدمی ہو اس لیے میری نظر میں تم اس پر بیٹھنے کے اہل نہیں ہو یہ ایمان کا لگاؤ تھا' جو ہر لگاؤ سے طاقتور رہتا ہے' اور یہ جوش وخروش بھی تمام تر ایمانی جوش تھا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا یہ اقدام سراسر اس حدیث کا آئینہ دار ہے' جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم میں کوئی اس وقت تک (کامل) ایمان والا نہیں ہوسکتا' جب تک کہ میں اس کی نظر میں اس کے بیٹے' اس کے باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔''

بعض محدثین نے ''بستر پر نہ بیٹھنے'' کا ایک معنی یہ بھی بتایا ہے کہ غیر مردوں کو اپنے ساتھ غلط ملط نہ ہونے دیں' نہ ہی بات چیت کا موقعہ دیں۔

اسلام دین فطرت ہے لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عورتوں کو جو انسانی معاشرے کے نصف پر مشتمل ہیں' انہیں نظر انداز کر دیتا' انسان نے عورت کو ہر حیثیت میں خواہ وہ ماں ہو یا بہن ہو یا بیوی ہو انتہائی قابل احترام قرار دیا اور اس کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا ہے۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا شخص میرے حسنِ سلوک کا زیادہ حق دار ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تیری ماں

اس نے عرض کیا پھر کون؟

فرمایا:

تیری ماں

اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟

فرمایا:

تیری ماں

اس نے عرض کیا پھر کون؟

فرمایا:

تیرا باپ

اسی طرح ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ جہاد کروں' حضورؐ کا مشورہ چاہتا ہوں' آپ نے فرمایا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں فرمایا جاؤ ان کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب کماؤ۔

حضرت اسما بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

اَتَتْنِیْ اُمِّیْ رَاغِبَۃً فَسَاَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَ اَصِلُھَا ؟ قَالَ نَعَمْ.

(میری ماں (جو کہ مشرکہ تھیں) میرے پاس آئیں تو میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری ماں میرے پاس آئی ہیں' وہ اسلام کی طرف راغب بھی ہیں' اجازت ہو تو میں ان سے ملوں؟ آپ نے فرمایا ضرور اپنی ماں کے ساتھ میل جول رکھو۔

اسی موقعہ پر یہ آیتِ مبارکہ بھی نازل ہوگئی۔

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ ط اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ

(جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا۔

اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اسی طرح عورت کو بہن کی حیثیت سے وہ مقام حاصل ہے' جسے انسانی شخصیت کا اہم پہلو قرار دیا جاتا ہے' بہن بھائی کے لیے سراپا دعا اور شفقت ہوتی ہے' جو افراد بہن کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں وہ عموماً نفسیاتی طور پر کسی نہ کسی کمی کا شکار ہوتے ہیں۔ اسلام نے بہنوں اور بیٹیوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دیتا ہے اور ان کی پیدائش کو جنت کا ذریعہ بتایا ہے۔ بہن بھائیوں کے لیے سوائے خیر کے کچھ سوچ ہی نہیں سکتی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام نے ہمیں یہ حکم دیا کہ بہن کا احترام کیا جائے اور اس کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ اسی طرح بیٹی والدین کے لیے رحمت کا باعث ہے' جو لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے' یا بیٹیوں کی پیدائش پر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے' اسلام نے ان کی شدید طور پر مذمت کی ہے' اسلام بیٹی سے محبت' شفقت اور حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا' بیٹیوں کے حقوق کا تعین کرتا اور ان کے تحفظ پر پورا پورا زور دیتا ہے ویسے بھی اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو کر نظر و فکر کے سامنے آئے گی کہ والدین اگر اپنی بیٹیوں کی صحیح تربیت کریں تو بہترین قوم کی ضمانت دینے کی اہل بن جاتی ہیں۔ عورت کو اقوام عالم نے ماضی میں نہ صرف اس کے حقوق سے محروم کر رکھا تھا بلکہ اس پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جاتے تھے' آج کے اس مہذب دور میں بھی کئی متمدن اقوام اسے حقِ ملکیت سے محروم رکھتی ہیں اسلام نے ایک طرف باپ کی وراثت میں سے اسے حصہ دلوایا تو دوسری طرف خاوند سے مہر دلوا کر مالی نقطہ نظر سے اس کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔

انتخابِ شوہر

شادی خانہ آبادی اسلام کی نگاہ میں شوہر اور بیوی کا وہ پاکیزہ بندھن ہے' جس پر سارے معاشرے کی بنیاد استوار ہے' اسلام سے قبل انسانیت اس باب میں بھی بہت افراط و تفریط کا شکار تھی' مذاہبِ عالم کی تاریخ میں اسلام وہ پہلا اور واحد دین رحمت ہے' جس نے افراط و تفریط کا خاتمہ کیا اور شادی خانہ آبادی کے سلسلہ میں بھی انسانیت کو بہت ہی پاکیزہ

اور سنہری اصول عطا فرمائے اور شوہر اور بیوی میں سے ہر ایک کے حقوق و فرائض کا باقاعدہ تحفظ کیا۔

دین اسلام کا طبقہ نسواں پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہیں شوہروں کے انتخاب کے لیے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار پوری اور مکمل آزادی دی گئی ہے' اور کسی کو بھی یہ اختیار نہ دیا کہ وہ عورت کو اس کے اس حق سے محروم کر سکے۔ حتیٰ کہ دین اسلام نے والدین کو بھی یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اسے اس کے اس حق سے محروم کریں۔ عورت کو اگر دھوکا دے کر یا مجبور کر کے شادی پر آمادہ کیا گیا ہو تو شادی کے بعد بھی اسے فسخ نکاح کا اختیار دیا ہے' چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خنساء بنت خدام الفاریہ کے نکاح کو فسخ کر دیا تھا کیونکہ اس کے والد نے زبردستی اس کا نکاح کیا تھا۔

عورت کے حقِ اختیارِ شوہر کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات کتب حدیث میں موجود ہیں' جن میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(1) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُنْكَحُ الْاَيِّمُ حَتّٰى تُسْتَاْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَاْذَنَ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ اِذْنُهَا ؟قَالَ اَنْ تَسْكُتَ

بیوہ کا نکاح اس سے اجازت لیے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری کا بھی اِس کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کیا جائے۔

لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ! کنواری کیسے اجازت دے گی؟ فرمایا اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے۔ اِسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا:

اَلْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَّلِيِّهَا وَالْبِكْرُ تُسْتَاْمَرُ وَاِذْنُهَا صُمَاتُهَا.

(بیوہ اور مطلقہ عورت اپنے نفس کی اپنے ولی سے زیادہ حق دار ہے اور کنواری سے نکاح کے بارے میں اجازت لی جائے گی اور اس کی خاموشی اجازت ہے۔)

(3) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تُسْتَأْمَرُ الْيَتِيمَةُ فِي نَفْسِهَا فَإِنْ سَكَتَتْ فَهُوَ إِذْنُهَا وَإِنْ أَبَتْ فَلَا جَوَازَ عَلَيْهَا

(کنواری یتیم لڑکی کی مرضی معلوم کی جائے گی' اگر خاموش رہے تو یہی اس کی اجازت ہے اور اگر انکار کر دے تو اس پر جبر نہیں۔

(4) اسی طرح حدیث عدی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شادی کے وقت عورتوں سے بھی ان کے بارے میں مشورہ کر لیا کرو' تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا یا رسول اللہ! باکرہ لڑکی شرم و حیا محسوس کرتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

الثيب تُعْرِبُ عَنْ نَفْسِهَا ' وَالْبِكْرُ رِضَاهَا صُمَاتُهَا

''بیوہ اپنی مرضی کا اظہار کر دیتی اور کنواری کی خاموشی ہی اس کی رضامندی ہے۔''

اسی طرح اور بھی بہت سے ارشادات نبوی ہیں جو اس امر پر نہایت صراحت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں کہ شادی میں عورتوں کو پسندیدگی کا شریعت نے پورا پورا احترام کیا ہے' انہیں اس سلسلہ میں پورا پورا حق دیا ہے' جسے ان سے کوئی سلب نہیں کر سکتا حتیٰ کہ ان کی مرضی اور منشا کے بغیر والدین یا ورثا ان کی شادی کر دیں' تو انہیں فسخ نکاح کا بھی شریعت نے پورا پورا حق عطا فرمایا ہے جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے کہ جب خنسا بنت خذام انصاریہ کی شادی اس کے باپ نے زبردستی' اس کی مرضی کے بغیر کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے اسے فسخ کر دیا تھا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے اپنے پسماندگان میں ایک لڑکی بھی چھوڑی جو کہ خویلہ بنت حکیم بن امیہ بن حارثہ بن اوقص کے بطن سے تھی۔ اور انہوں نے اس بچی کی کفالت اور شادی وغیرہ کے سلسلہ میں اپنے بھائی قدامہ بن مظعون کو وصیت کی۔ حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ عثمان اور قدامہ یہ دونوں میرے ماموں ہیں' چنانچہ اس لڑکی سے

شادی کرنے کے لیے میں نے اپنے ماموں قدامہ کی طرف پیغام بھیجا' انہوں نے میری پیشکش کو قبول کر کے اس لڑکی کا مجھ سے نکاح کر دیا مگر ہوا یہ کہ دوسری طرف حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بھی لڑکی کی والدہ سے رابطہ قائم کر کے شادی کی خواہش کا اظہار کیا اور اپنے مال و دولت کی طرف بھی رغبت دلائی جس کی وجہ سے لڑکی کی والدہ کا اس طرف رجحان ہو گیا کہ وہ مغیرہ بن شعبہ سے شادی کر دیں اور لڑکی کا میلان بھی یہی تھا کہ وہ اپنی ماں کی خواہش کی تکمیل کرے مگر جب اس معاملہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو قدامہ بن مظعون نے دربار رسالت میں یہ بیان دیا کہ یا رسول اللہ! یہ لڑکی میرے بھائی کی بیٹی ہے اور انہوں نے اس کے بارے میں مجھے وصیت کی تھی لہٰذا میں نے اس لڑکی کے پھوپھی زاد عبداللہ بن عمر سے اس کی شادی کر دی ہے میں نے اس کی بہتری اور کفو وغیرہ کے سلسلہ میں کوتاہی نہیں کی مگر اب اس لڑکی کا رجحان یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کی خواہش کی تکمیل کرے۔

یہ بیان سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هِيَ يَتِيمَةٌ وَلَا تُنْكَحُ اِلَّا بِاِذْنِهَا.

(یتیم لڑکی ہے' اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا)

اس حدیث کے راوی عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ واللہ! مجھ سے شادی کے بعد اس عورت کو مجھ سے الگ کر دیا گیا اور لڑکی کی خواہش کے مطابق حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے اس کی شادی کر دی گئی۔

اسی طرح کتبِ حدیث و سیرت میں ہمیں اور ابھی کئی واقعات ایسے ملتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خواتین کے نکاح فسخ کرا دیئے تھے جن کے نکاح کے والدین یا وارثوں نے ان کی مرضی کے بغیر کر دیئے تھے۔

قبیح رسومات کا خاتمہ

اسلام سے قبل دنیا میں جو قبیح رسم و رواج تھے' جن کا خاتمہ کر کے اسلام نے انسانی

معاشرے پر احسان عظیم فرمایا' ان میں سے ایک یہ قبیح رسم بھی تھی کہ والد کی وفات کے بعد باپ کی منکوحہ کو بھی دیگر مادی مال واسباب کی طرح متاع تصور کیا جاتا اور بیٹا جس طرح چاہتا اس میں تصرف کرتا تھا۔ اسلام نے اس سے قبیح رسم کا خاتمہ کرتے ہوئے یہ حکم دیا۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا

(اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح نہ کرنا مگر (جاہلیت میں) جو ہو چکا (سو ہو چکا) یہ نہایت بے حیائی اور (اللہ کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا۔

اسی طرح عورتوں کے زبردستی وارث بننے یا انہیں ناجائز طور پر روک رکھنے اور شادی نہ کرنے کے بارے میں جو ناروا پابندیاں عائد تھیں۔ ان کے بارے میں شریعت نے یہ حکم دیا کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

(مومنو! تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور (دیکھنا) اس نیت سے کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے کچھ لے لو انہیں (گھروں) میں مت روک رکھنا۔

اسلام نے عورتوں کی عزت وآبرو اور ان کے تقدس واحترام کا اس قدر لحاظ رکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ مال کمانے کے لیے اپنی باندیوں سے جسم فروشی کا مکروہ اور مذموم دھندہ کروایا کرتے تھے' اسلام نے اس سے سختی سے منع فرمادیا'

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو (بے شرمی سے) دنیاوی زندگی کے فوائد حاصل کرنے کے لیے بدکاری پر مجبور نہ کرنا اور جوان کو مجبور کرے گا تو ان (بے چاریوں) کے مجبور کیے جانے کے بعد اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔)

مسئلہ طلاق پر ایک نظر

اسلام میں طلاق کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ تو یہ بھی بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے بشرطیکہ ان تمام احکام وقیود اور واجبات کی پابندی کی جائے جو اسلامی شریعت نے عائد کیے ہیں۔

شادی جب خاندان کے ترقی وکمال کی بنیاد واساس ہے تو یہ ضروری ہے کہ شادی فی الواقع خانہ آبادی ثابت ہو اور خاندان کو کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کرے' شادی' خانہ آبادی کا کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہونا ایک معاشرتی اور دینی ضرورت ہے' اس کے زیر سایہ الفت وسعادت کے عناصر پروان چڑھتے اور ملک ومعاشرے ترقی کے مراحل طے کرتے ہیں لیکن مزاج اور طبائع میں اختلاف کے باعث اگر میاں بیوی کا نباہ مشکل ہو تو پھر شادی سے مقصود نتائج وثمرات حاصل نہیں ہو سکتے لہٰذا شریعت نے اس صورت میں بامر مجبوری طلاق کی اجازت دی ہے جیسا کہ حضور اقدس علیہ السلام کا ارشاد ہے:

تَزَوَّجُوْا وَلَا تُطَلِّقُوْا فَاِنَّ الطَّلَاقَ يَهْتَزُّ مِنْهُ عرش

(شادی کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ طلاق سے عرش الٰہی ہل جاتا ہے۔)

قیود وحدود کے بغیر شریعت طلاق کو جائز قرار نہیں دیتی بلکہ شریعت نے اسے حفاظت حقوق زوجیت کے قوانین کے ساتھ مقید کیا ہے اور بچوں کی رعایت ومصلحت کو پیش نظر رکھا ہے شریعت کا منشا یہ ہے کہ میاں بیوی کو الفت ومحبت اور شفقت وسعادت کے ساتھ خوش وخرم زندگی بسر کرنا چاہیے اور اگر خدانخواستہ' اختلاف نزاع افتراق واضطراب کی کیفیت پیدا ہو جائے تو۔

فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ.

(عورتوں کو) یا تو بطریق شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

یعنی اسلام نے طلاق کو صرف انتہائی ناگزیر حالات ہی میں جائز قرار دیا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اَبغَض الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰهِ الطَّلَاقُ

(حلال چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ طلاق ہے)

مالی حقوق

جب تمام ادیان و مذاہب عالم نے عورت کو آلام و مصائب کا تختہ مشق بنا رکھا اور اسے تمام حقوق سے محروم کر رکھا تھا' اسلام نے اس مظلوم کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور اسے وہ تمام حقوق عطا کیے جو اس نے مردوں کو عطا کیے تھے' چنانچہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اسلام نے زندگی سے متعلق ہر ہر شعبہ میں عورت کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا ہے خواہ وہ حقوق جانی ہوں یا مالی' جانی اور بدنی حقوق سے متعلق ہم اپنی گزارشات قبل ازیں پیش کر آئے ہیں اور اب ان مالی حقوق کا ذکر ہوگا جو اسلامی شریعت نے عورتوں کو عطا فرمائے ہیں۔

اسلام نے تمام مالی امور میں مرد و عورت کو مساوی حقوق عطا کیے ہیں لہٰذا جب کوئی عورت سنِ رشد و بلوغت کو پہنچ جائے تو اسے بیع و شرا کا پورا پورا حق حاصل ہے' ہر طرح کی خرید و فروخت کے علاوہ اجارہ' شرکہ' رہن اور خرید و فروخت کے مسائل میں پیش آنے والے امور میں اسے بھی اسی طرح پوری پوری آزادی حاصل ہے' جس طرح مردوں کو حاصل ہے' نیز اسے حقِ ولادیت و وصیت بھی اسی طرح حاصل ہے' جس طرح مردوں کو حاصل ہے۔

جب اسلام آیا تو اس وقت عرب کے معاشرے میں عورتوں کو حقِ وراثت حاصل

نہ تھا اسلام نے عورتوں کے حقِ میراث کو بھی تسلیم کیا اور مختلف صورتوں میں اس کے حق میراث کا باقاعدہ تعین اور تحفظ کیا ہے۔ عورت خواہ ماں ہو یا بیوی بیٹی ہو یا بہن سب کے حق میراث کو شریعت نے تسلیم کیا اور اس کے تحفظ کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا

(جو مال ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ مریں' تھوڑا ہو یا بہت اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی۔ یہ حصے اللہ کے مقرر کیے ہوئے ہیں)

الغرض زندگی کے تمام شعبوں میں عورت کی استعداد کے مطابق اسلام نے اسے مناسب کردار ادا کرنے کی بھی اجازت دی ہے اور اس کے حقوق و فرائض کا نہ صرف تعین بلکہ تحفظ بھی کیا ہے حتیٰ کہ حالت جنگ میں بھی جنگی خدمات سرانجام دینے سے انہیں مستثنیٰ قرار نہیں دیا بلکہ جہاد میں انہیں شرکت کی مکمل آزادی دی ہے تاکہ وہ مجاہدوں کو پانی پلائیں اور شہیدوں اور زخمیوں کی مناسب دیکھ بھال کریں' صحیح مسلم' سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی کی ایک روایت میں ہے' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

قَدْ كَانَ يَغْزُوْبِهِنَّ فَيُدَاوِيْنَ الْجَرْحٰى وَيُحْذَيْنَ مِنَ الْغَنِيْمَةِ

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوات میں خواتین کو بھی شریک کیا کرتے تھے جو کہ زخمیوں کا علاج کیا کرتی تھیں' خواتین کو مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی دیا جاتا تھا)

''صحیح مسلم'' میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَ غَزَوَاتٍ وَكُنْتُ اَخْلُفُهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ اَصْنَعُ لَهُمُ الطَّعَامَ ' وَاُدَاوِي الْجَرْحٰى وَاَقُوْمُ عَلَى الْمَرْضٰى۔

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی' میں (مجاہدین کے) سامان کی حفاظت کرتی' ان کے لیے کھانا تیار کرتی' زخمیوں کا علاج

کرتی اور مریضوں کی تمارداری کرتی تھی۔)

اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور بعض دیگر خواتین کے بارے میں کتب حدیث و سیرت میں یہ صراحت موجود ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شرکت کیا کرتیں، مجاہدین کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کا علاج معالجہ کیا کرتی تھیں۔ مسلمان عورتوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ عورت ذات کی عزت، واحترام کی بنا پر رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ کی صورت میں دشمن کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمادیا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بعض غزوات میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقتول عورت کو دیکھا تو۔

نَهٰى عَنْ قَتْلِ النِّسَآءِ وَالصِّبيان

(آپؐ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمادیا۔)

بہر آئینہ ہم نے اختصار کے ساتھ ان حقوق کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو اسلام نے طبقہ نسواں کو عطا فرمائے ہیں، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ہم وطن عزیز میں صحیح طور پر اور مکمل طور پر شریعت بیضا اور دین مصطفیٰ کو نافذ کردیں تو ہماری تمام پریشانیاں دور ہوجائیں گی، مشکلات کا ازالہ ہوجائے گا اور وطنِ عزیز امن، چین اور سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔ آج کل یہ پروپیگنڈہ بھی بہت کیا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت کے نفاذ کے بعد عورتیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہوجائیں گی، ہم اپنی قابل صد احترام خواتین کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ محض جھوٹا پروپیگنڈا ہے، جس میں ذرہ بھر صداقت نہیں اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اسلام دنیا کا وہ واحد دین رحمت ہے جس نے تمام ادیان و مذاہب عالم سے بڑھ کر خواتین کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔

خواتین کے حقوق و فرائض اور اس محترم طبقہ سے متعلق دین اسلام کی کیا پاکیزہ تعلیمات ہیں؟ اس موضوع سے متعلق ایک بہت ہی اہم اور بے مثال کتاب کی طرف بھی ہم اپنے قارئین کرام کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں تاکہ خواتین و حضرات میں سے اہل تحقیق اور باذوق حضرات اس سے استفادہ کرسکیں، ہماری مراد نواب والا جاہ سید محمد صدیق

حسن خاں قنوجی نجاری رحمۃ اللہ علیہ۔ 1248ء 1307ء کی کتاب ''حسن الاسوۃ بما ثبت من اللہ ورسلہ فی النسوۃ'' جسے ڈاکٹر مصطفیٰ سعید الحسن اور محی الدین مستو نے ایڈٹ کیا اور موسسۃ الرسالۃ بیروت نے بہت اہتمام سے زیورِ طباعت سے آراستہ کرایا ہے' یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں فاضل مصنف نے قرآن مجید کے ان ایک سو چورانوے 194 مقامات کی تفسیر بیان فرمائی ہے' جن میں خواتین سے متعلق حقوق و فرائض اور دیگر مسائل کا ذکر ہے' اسی طرح دوسرے باب میں انہوں نے چار سو بیاسی 482 ان احادیث مبارکہ کی تشریح و توضیح بیان فرمائی ہے' جن میں خواتین کے مسائل کا ذکر ہے۔

بہر حال ضرورت اس امر کی ہے اور عصر حاضر کا ہم سے یہ شدید تقاضا ہے کہ ایسی بلند پایہ کتابوں کو ہم اپنی زبان اردو میں منتقل کریں بلکہ ایسے تحقیقی ادارے بھی قائم کریں جو اسلامی تعلیمات اور افکار و نظریات کو غیر اسلامی تہذیبوں کی آمیزش سے پاک صاف کر کے پیش کریں تاکہ اس مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم دنیا کے سامنے یہ واضح کر سکیں کہ دین اسلام اور شریعت محمدی نے طبقہ نسواں کو جن حقوق سے نوازا اور جس اعزاز و احترام سے سرفراز ہے' دنیا کی کسی تہذیب' کسی قانون اور کسی دین و فلسفہ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

وَاٰخِر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

(سہ ماہ منہاج لاہور جلد نمبر۔ 9 شمارہ 1-2 جنوری/اپریل 1991ء)

اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام

اسلامی ریاست میں عورتوں کے حقوق وفرائض

امین احسن اصلاحی

اسلامی ریاست میں جس طرح مردوں کو حقوق حاصل ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی حقوق حاصل ہیں اور جس طرح مردوں پر فرائض عائد ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ بحیثیت شہری کے ایک مسلم اور ایک مسلمہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن دونوں کے حقوق وفرائض کی نوعیت میں کچھ اختلاف ہے اور یہ اختلاف دو اہم حقیقتوں پر مبنی ہے' جن کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

اوّلاً یہ کہ اسلام مساواتِ مرد وزن کے اس مغربی نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا جو عورت اور مرد کی صلاحیتوں میں سرے سے کوئی فرق نہیں کرتا اور دونوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں بالکل یکساں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام اس مساوات کو مساوات قرار نہیں دیتا' بلکہ اس کو ظلم قرار دیتا ہے' کیونکہ اوّل تو عورت اور مرد کے طبعی رجحانات ومیلانات میں بڑا فرق ہے' دوسرے خاندان کی ذمہ داریوں کا ایک بہت بڑا بوجھ پہلے سے عورت کے اوپر لدا ہوا ہے' جس کو اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔ اس وجہ سے یہ بالکل خلافِ انصاف ہے کہ اس کے اوپر ریاست کی ذمہ داریاں بھی بالکل مرد کے برابر لادی جائیں۔

ثانیاً اسلام معاشرہ کے اخلاقی تحفظ کے لیے دونوں جنسوں کو الگ الگ رکھنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے نہایت تفصیل کے ساتھ پردہ کے احکام دیے ہیں' اس

1۔ سمع وطاعت:

جس طرح مردوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معروف میں اولوالامر کی پورے خلوص قلب کے ساتھ اطاعت کریں اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ معروف کے حد تک اولا امر کے احکام کی اطاعت کریں۔ اولوالامر کے احکام سے انحراف صرف اسی شکل میں جائز ہے جب ان کا حکم شریعت کے حکم کے خلاف ہو۔

2۔ خیر خواہی و ہمدردی:

جس طرح مردوں پر ریاست کی ہمدردی و خیر خواہی فرض ہے اس طرح عورتوں پر فرض ہے۔ اس ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات ریاست کے مفاد کے خلاف ہو اس سے احتراز کرے' جو بات ریاست کے لیے نافع ہو اس کو حسبۃً لِلّٰہ انجام دینے کی کوشش کرے۔ محض ذاتی اغراض وفوائد کے لیے ریاست کے ساتھ دلچسپی نہ رکھے۔ جو مفید تجویز ذہن میں آئے اس سے کارکنوں کو برابر آگاہ کرتی رہے' اس کی قدر کی جائے یا نہ کی جائے۔ جو بات ریاست کے خلافِ مفاد ہوتی دیکھے اس کو ہاتھ سے روک سکے تو روک دے' اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے' اگر اس کی قابلیت نہ رکھتی ہو تو دل سے اس کو برا جانے۔ اپنی تنقید واحتساب میں بھی پوری مخلص ہو اور اگر ریاست کی کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے تو پوری راست بازی و دیانت کے ساتھ اسے خدا کی عبادت سمجھ کر انجام دے۔

3۔ تعاون:

عورتوں کے لیے' ان کے حالات کے لحاظ سے' کارکنانِ ریاست کے ساتھ تعاون کی مختلف شکلیں ہوں گی:

(الف) ریاست کی مجلس شوریٰ میں عورتوں کی خود ان کی منتخب کردہ نمائندہ عورتیں ہوں گی

جو عورتوں سے متعلق قوانین و اصلاحات کے بارہ میں عورتوں کے نقطہ نظر سے حکومت کو آگاہ کرتی رہیں گی اور حکومت عورتوں سے متعلق مسائل میں ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے گی۔ حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ ؓ کا واقعہ ہم نقل کر چکے ہیں کہ وہ کس طرح عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ ؐ سے سوالات کیے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ان کو اپنا نمائندہ بنا کر عورتوں کے پاس بھیجا اور انہوں نے عورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات سے آگاہ کیا۔ اسی طرح شفاء ام سلیمان بن ابی حثمہ کے متعلق روایت ہے کہ:

﴿ کان عمر یقدمها فی الرای ویرضاها ویفضلها وربما ولّٰها ماشاء من امر اسوق ﴾

(ترجمہ): حضرت عمرؓ ان کو مشورہ میں مقدم رکھتے تھے' ان کی رایوں کو پسند فرماتے تھے' ان کو ترجیح دیتے تھے اور بعض اوقات بازار (مارکیٹ) کے بعض معاملات کا انتظام بھی ان کے سپرد کر دیتے تھے۔

(ب) وہ سارے شعبے جو خاص عورتوں سے متعلق ہوں گے' مثلاً زنانہ کالج اور سکول' زنانہ ہسپتال' زنانہ پولیس' زنانہ فوجی تربیت کے مراکز وغیرہ۔ یہ کلیتہً عورتوں کی نگرانی اور ان کے اہتمام میں ہوں گے۔ اسلامی نصب العین کے مطابق ان چیزوں کو چلانے کے لیے انہیں خودمختاری حاصل ہوگی۔

(ج) حکومت مذکورہ شعبوں کے سوا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گی بشرطیکہ وہ پردہ کے حدود کے احترام کے ساتھ انجام دی جا سکتی ہوں۔ جو عورتیں اپنی ذہانت و قابلیت کی بنا پر کسی مخصوص علم و فن میں مہارت اور کسی شعبہ زندگی کے معاملات میں بصیرت بہم پہنچائیں گی ان کو کام کرنے کا بھی پورا موقع دیا جائے گا اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

4۔فوجی خدمات:

فوجی خدمات میں براہِ راست حصہ لینے اور فون میں عملی شرکت کرنے کی ذمہ داری عورتوں پر اسلام میں نہیں ہے۔لیکن ان کا اسلحہ کے استعمال ہوائی حملہ کی صورت میں بچاؤ' فرسٹ ایڈ اور اس قسم کے دوسرے کاموں سے واقف رہنا ضروری ہے' اس لیے حکومت اس امر کا انتظام کرے گی کہ عورتیں اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی ضروری تربیت حاصل کریں تاکہ اگر کوئی ناگہانی صورت پیش آجائے تو عورتیں بھی ملک وملت کی مدافعت اور جہاد کے اجروثواب میں شریک ہو سکیں۔

یہ سب کچھ اس غرض کے لیے کیا جائے گا کہ عورتیں فی الحقیقت اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کے قابل ہوں' نہ اس لیے کہ انہیں بنا سجا کہ مہمانوں کے سامنے تحفۃ پیش کیا جائے۔اگر مقصود صرف ان قومی ضروریات کو پورا کرنا ہے جو عورتوں سے متعلق ہیں تو اسلام میں اس کی پوری گنجائش موجود ہے۔لیکن اگر مقصود کچھ اور ہے تو پھر کوئی اور راہ دیکھئے' اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام میں حیثیتِ نسواں

- اسلامی معاشرہ میں حیثیتِ نسواں کا تاریخی جائزہ
- آدم وحوا کا معاملہ
- عورت کے مہر کی مقدار اور ''شرعی مہر''
- تعدادِ ازدواج
- عدم ادائیگی نفقہ پر فسخ نکاح
- نابالغ بچوں کی شادی روکنے کا ایکٹ
- جہیز کی شرعی حیثیت
- اسلام کے قانونِ وراثت میں عورت کا حصہ
- عورت کی تعلیم وتربیت
- مسلمان خواتین کی علمی خدمات
- پردے کا ارتقاء واہمیت
- قصاص ودیت
- عورت کی سیاسی سرگرمیاں، شرعی نقطہ نظر سے
- نفاذِ شریعت اور تحفظِ حقوقِ نسواں
- اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام

Rs: 180/-